خُطباتِ حکیمُ الاُمّتؒ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد - ۲۹

اصلاحِ باطن

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی
نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات و تصحیح
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی
فاضل جامع قاسم العلوم ملتان

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

اِصلاحِ باطن

تاریخ اشاعت.................. ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ

ناشر.............................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت...........................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادراہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان   مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی

ادارہ اسلامیات........انارکلی........لاہور   یونیورسٹی بک ایجنسی.....خیبر بازار.......پشاور

مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.....لاہور   ادارۃ الانور........نیو ٹاؤن........کراچی نمبر 5

مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار .... لاہور   مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ.........بلاک زیڈ.......مدینہ ٹاؤن.......بنک موڑ.......فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۹ ''اصلاح باطن''
جدید اشاعت سے مزین اور نایاب وعظ ''رجاء الغیوب'' کے
اضافہ کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی
عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو
جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد
محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور
فارسی اشعار' عربی عبارات کا ترجمہ' عنوانات اور اس کے ساتھ ساتھ
تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ بمطابق اپریل 2007ء

مختصر سوانح حیات

آبائی وطن: حضرت حکیم الامتؒ کے حسب ونسب کا تعلق تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر یو پی انڈیا) کے ایک مقتدر خاندان سے تھا آپ کے آباؤاجداد صاحب علم ووجاہت واہل منصب تھے۔

آپ نسباً فاروقی تھے اور مسلکاً صابری چشتی تھے حضرت شاہ حاجی محمد امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ ارشد تھے اور منجانب اللہ تعالیٰ تمام علوم ظاہری وباطنی سے متصف ہوکر زبان اہل حق پر حکیم الامت مجدد ملت محی السنۃ اور حجۃ اللہ فی الارض تھے۔ ان تمام اوصاف کا شاہد ناطق ان کا دین متین کا تحریری وتقریری اصلاحی وتجدیدی کارنامہ تبلیغ واشاعت دین ہے جو ان کی حیات ہی میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے خواص وعوام میں اپنی جامعیت ونافعیت کی بناء پر مقبول ہوا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا اور شائع ہوا اور خلق اللہ کو مستفیض کیا۔

پیدائش: آپکی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہار شنبہ کی صبح صادق کے وقت بمقام تھانہ بھون ظہور میں آئی۔ بچپن میں فارسی وحفظ قرآن سے وطن ہی میں فارغ ہوئے پھر علوم دینیہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے ۱۲۹۵۔۱۳۰۱ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔

دستار فضیلت: آپ کی دستار فضیلت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے متبرک ہاتھوں سے ہوئی آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دیوبندی کی توجہات خصوصی آپ کے ساتھ وابستہ رہیں۔

خانقاہِ امدادیہ میں قیام: قیام کانپور میں حضرتؒ نے اس طرح اپنی ابتدائی زندگی کے چودہ سال گزارے پھر خود اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے ایما اور منشاء سے صفر ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ کانپور سے قطع تعلق کر کے اپنے وطن اور اپنے پیر ومرشد کی یادگار خانقاہ امدادیہ میں قیام پذیر ہوگئے اور تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار کرلی حضرت شیخ نے مکۃ المکرمہ سے تحریر فرمایا۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری وباطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ اور مسجد کو ازسرنو آباد کریں گے میں ہروقت آپ کیلئے دعا کرتا ہوں"۔

حضرت کا سانحہ ارتحال: وفات سے چند سال قبل ہی سے حضرت مرض اسہال میں مبتلا رہے اور کسی علاج سے صحت نہ ہوئی بالآخر ۱۶۔۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۔۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء سہ شنبہ کی شب نماز عشاء کے وقت ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر میں یہ سواد ہند کا نیر اعظم تقریباً نصف صدی تک دین مبین کی ضوفشانی کے بعد غروب ہوگیا اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مدفن: قصبہ تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ کے شمال جانب قبرستان موسومہ تکیہ میں حضرت رحمۃ اللہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ (مآثر حکیم الامت)

اجمالی فہرست

الرحیل الی الخلیل

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۳۰﴾ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۳۱﴾

سبیل السعید

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

اسباب الفضائل

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾

الباطن

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

اِنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ

التوجه

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

خواص الخشية

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

ادب الطريق--ادب الاعتدال--ادب الترك

العفة

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

حقيقت احسان

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

رجاء الغيوب

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

فہرست عنوانات

☆……☆……☆……☆

الرحیل الی الخلیل

دین پر چلنے کے متعلق خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۲۴ جمادی الاول ۱۳۴۹ ہجری ۳ گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ جسے مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند کیا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللّٰہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَاِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلاً وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا. یُدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّلَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا. (الدھرآیت نمبر۲۹ تا۳۱)

ترجمہ: (یہ نصیحت ہے جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرلے اور بدون خدا کے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے' خدا بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے۔)

تکوینیات کے ذکر کا مقصود

مجھے صرف آیت اولیٰ کے متعلق بیان کرنا ہے مگر دوسری آیتیں اس لیے پڑھ دی ہیں تا کہ آیت اولیٰ کی تعیین ہوجائے کیونکہ وہ آیت قرآن میں اور جگہ بھی آتی ہے۔ چنانچہ سورہ مزمل میں بھی ہے۔ اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَاِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلاً (یہ نصیحت ہے جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے) اور مجھے اس وقت سورہ دہر کی آیت مقصود بالبیان ہے تو اس کی تعیین کے لیے اگلی آیتوں کی بھی تلاوت کردی۔ رہا یہ کہ جب آیت دونوں جگہ ایک ہی ہے تو تعیین آیت دہر کی کیا ضرورت ہے۔ سوخیال یہ ہے کہ شاید دہر کی آئندہ آیات کے متعلق بھی کچھ بیان ہوجائے۔ اس لیے تعیین کردی گئی بہرحال یہ ایک ضروری مضمون ہے اس کو غور سے سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ (یہ

نصیحت ہے) کہ یہ مضامین یادداشت ہیں، ہٰذہ سے اوپر کے مضامین کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر بہت سے مضامین مذکور ہیں جو سب دینی مضامین ہیں اور قرآن میں تو دین ہی کا ذکر ہوگا، تکوین کا ذکر بھی اگر کہیں ہے تو دین ہی کے لیے ہے۔ محض تکوین من حیث ہو تکوین مقصود بالذکر نہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو سب امور تکوینیہ کو قرآن میں ٹھونستے ہیں اور قرآن سے ان کو ثابت کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ اہتمام منکر ہے کیونکہ یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں تکوین کا ذکر نہیں ہے، ضرور ہے لیکن مقصود بالذات ہو کر نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے:

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَاتَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ.

(اور وہ زبردست بخشنے والا ہے جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا پھر تو اب کی بار نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخرکار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آوے گی اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بتادیا ہے اور ہم نے ان شیاطین کے لیے دوزخ کا عذاب بھی تیار کر رکھا ہے)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَالَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ اِلٰى قَوْلِهٖ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ.

(کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اس کو آراستہ کیا اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی چیزیں اُگائیں جو ذریعہ دانائی اور بینائی ہر رجوع ہونے والے بندوں کے لیے اور پھر آسمان سے برکت والا پانی برسایا پھر اس سے باغ

لگائے، کھیتی کا غلہ لمبے کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے لیے روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ذریعے سے مردوں کو زندہ کیا، اسی طرح زمین سے نکلنا ہوگا۔)

ان آیات میں آسمان کی پیدائش اور استواری کا ذکر ہے کہ آسمان میں کچھ شقاق اور فطور نہیں ہے مگر اس سے مقصود صرف تکوین کا بیان نہیں ہے بلکہ اس سے اثبات قدرت مقصود ہے جس سے امکان معاد پر دلیل قائم کرنا مطلوب ہے۔ اسی غرض کے لیے جابجا سموات کی پیدائش واستحکام واستواری کا ذکر فرمایا گیا ہے اور سحاب وبرق ورعد وغیرہ کا ذکر اثبات وجود صانع کے لیے کیا گیا ہے، محض طبیعات کی تحقیق مطلوب نہیں۔ چنانچہ ہر مقام پر سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مقصود اثبات وجود وتوحید صانع ہے۔ اسی لیے جابجا تکوینیات کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ ان میں عقلاء کے لیے آیات ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ.

(یعنی بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندروں میں چلتے ہیں، آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا، اس کے خشک ہونے کے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلائے اور ہواؤں (سمتیں اور کیفیتیں بدلنے میں) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین وآسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے دلائل (توحید کے) موجود ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں اور ان آیات سے توحید صانع کا ثابت کرنا مقصود ہے۔)

آسمان اور زمین کی تخلیق کا مقصد

چنانچہ اس آیت سے اوپر یہ ارشاد ہے: وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ. (اور تمہارا معبود صرف ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بہت مہربان نہایت رحم

والا ہے) یہ تو سباق ہے جس میں توحید کا دعویٰ ہے اور اس کے آگے ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ.

(یعنی اور ایک آدمی وہ بھی ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک خدائی قرار دیتے ہیں ان سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو ضرور اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے)

یہ سیاق ہے جس میں ابطال شرک ہے اور اگر کسی کو سیاق وسباق میں تامل کرنا کافی نہ ہو تو ایک آیت میں خود ساتھ ساتھ ہی اس مضمون کے ذکر کی حکمت کو بیان فرمادیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

(یعنی بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں (توحید کے) دلائل موجود ہیں۔ اہل عقل کے لیے جن کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں' کھڑے بھی بیٹھے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس مخلوق کو لایعنی نہیں پیدا کیا ہم آپ کو پاک سمجھتے ہیں۔ سو ہم کو عذاب دوزخ سے بچالیجئے)۔ اس میں صاف تعلیم ہے کہ خلق سموات والارض میں اس غرض سے تفکر کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی حکمت کی قدرت کا علم ہو کہ یہ فضول پیدا نہیں کیے گئے۔ پھر اس سے امکان وقوع معاد پر استدلال کرکے جنت کی طلب اور جہنم سے استعاذہ کرنا چاہیے۔ پس ثابت ہو گیا کہ تکوینیات کا ذکر قرآن میں بطور آیات و دلائل کے ہے اور آیات سے مراد اگر استدلال علی الصانع واثبات معاد کے سوا کچھ اور لیا جائے تو سیاق وسباق آیات کا اس سے آبی ہے اور اگر سیاق وسباق میں تامل نہ کیا جائے تو بعض آیات میں خود یہی نتیجہ صراحتاً مذکور ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا تو اگر تکوینیات کا ذکر قرآن میں ہے بھی جس کو آج کل سائنس کہا جاتا ہے تو

مقصود بالذات ہوکر نہیں بلکہ دین کے تابع ہوکر ہے مجھے تو سائنس کا لفظ بولنے سے بھی شرم آتی ہے۔ گو آج کل ان الفاظ کا استعمال کرنا فخر شمار ہوتا ہے مگر ہم کو اس فخر سے عار آتی ہے۔ بقول: ع

آنچہ فخر تست آں ننگ من ست

(جس پر تجھ کو فخر ہے وہ ہمارے لیے باعث شرم و عار ہے)

دور حاضر کے طلباء

مگر افسوس اب زمانہ ایسا آگیا ہے کہ مخاطبین ان الفاظ کے بغیر مطلب ہی سمجھتے نہیں اس لیے بعض دفعہ ہمیں اپنی زبان بگاڑ کر ان الفاظ کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ایک وکیل انگریز میرٹھ میں ایک دیہاتی سے کہہ رہا تھا کہ مطبل بھی سمجھ گیا ایسے ہی ہمیں ان الفاظ کو بعض دفعہ مخاطبین کی ضرورت سے بولنا پڑتا ہے مگر ہم ان کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے سلف کی یہ زبان نہیں تھی مگر افسوس آج کل طلباء تک میں یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں اور قصداً اپنی تقریر کو ان الفاظ سے بھرتے ہیں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مقرر کوئی ملا ہے بلکہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کے مقرر سمجھے جائیں۔ طلباء آج کل اپنا مولوی ہونا چھپاتے ہیں اور قصداً ان الفاظ کی مشق کرتے ہیں جیسے کانپور میں بعض طالب علموں کو دیکھا کہ بوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر عینک لگا کر بازار میں نکلتے تھے تاکہ لوگ ان کو جنٹلمین سمجھیں مولوی نہ سمجھیں مگر حالت یہ تھی کہ جس طرف سے بھی نکلتے دُکاندار پکارتے کہ مولوی صاحب یہاں آئیے۔ میں نے کہا کہ ڈوب مرو کہ تم تو اپنی مولویت کو چھپانا چاہتے ہو مگر وہ چھپ نہیں سکتی۔ صورت کی قدرتی ہیئت کو دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں کہ یہ مولوی ہیں۔ اب تم اپنی اس قدرتی ہیئت کو بھی بدلو تو ہم جانیں اور یہ واقعہ ہے کہ طالب علم چاہے کیسا ہی لباس پہن لے اس کی صورت سے طالب علمی ظاہر ہو جاتی ہے خواہ اس کا منشاء نور حق ہو جو علم دین کا خاصا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

نور حق ظاہر بود اندر دلی نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(اللہ والوں میں حق کا نور ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو اچھی نظر سے دیکھ)

اور ایک اردو کا شعر گویا اسی کا ترجمہ ہے۔ گو مولانا کے شعر کے سامنے اس کے پڑھنے

کو جی نہیں چاہتا مگر مخاطبین کی رعایت سے پڑھتا ہوں کہ وہ اس کو جلدی سمجھ جائیں گے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

نور ولایت کی بے قدری

خواہ آج کل کے محاورہ میں یہ کہو کہ ان کی صورت پر نحوست برستی ہے۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عربی طلباء کی صورت پر ایسی نحوست و نکبت برستی ہے کہ وہ ہر جگہ پہچان لیے جاتے ہیں خواہ کسی لباس میں ہوں کیسی ہی حالت میں ہوں۔ افسوس یہ لوگ کیا حقیقت سمجھے اس نور کی۔ اگر اس امتیاز کا منشاء نحوست و نکبت ہے تو یہ نحوست تو ہر مسلمان میں ہے کیونکہ ہر مسلمان کو کافر سے صورت میں امتیاز ہوتا ہے۔ مسلمان چاہے کیسی ہی وضع اختیار کر لے اگر اس کے دل میں ایمان ہے تو ہزار کافروں کے اندر اس کی صورت ممتاز ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی اصلی مسلمان لوگوں سے چندہ وصول کرنے کے واسطے اپنے کو نو مسلم ظاہر کرے تو تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ یہ نو مسلم نہیں بلکہ اصلی مسلم ہے۔ اگر یہ نحوست ہے تو ڈپٹی صاحب بھی اس نحوست سے خالی نہیں تھے۔ اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر طلباء کے اندر یہ امتیاز بوجہ نورانیت کے ہے تو وہ تمہارے نزدیک ولی ہوئے پھر ولی مان کر ان کی مذمت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس لیے مذمت کرتا ہوں کہ وہ اس نور ولایت کی بے قدری کرتے ہیں اور اس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کے پاس بڑا قیمتی جوہر ہو اور وہ اس کی قدر نہ کرتا ہو بلکہ اسے ضائع کرنا چاہتا ہو تو ہر شخص اس کو احمق کہے گا۔

ولایت کی دو قسمیں

دوسرے ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسرے ولایت خاصہ۔ سو طلباء میں ولایت عامہ کا تحقق ہے اور ولایت عامہ کا اجتماع مذمت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ولایت عامہ تو ہر مسلمان میں ہے۔ گو وہ کیسا ہی فاسق ہو اور ظاہر ہے کہ مسلم فاسق باوجود اس ولایت کے محل مذمت و زجر بھی ہے۔ غرض آج کل طلباء اس طبقہ سے یعنی مولویوں کے زمرہ سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پھر دوسرا راستہ موجود ہے۔ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ. (اور ہم نے ان کو دونوں راستے بتلا دیئے) تم کو اگر مولویت سے عار ہے تو

دوسرے طبقہ میں چلے جاؤ اور پوری طرح جنٹلمین ہی بن جاؤ' مولویت کے ساتھ جنٹلمینی کو کیوں جمع کرتے ہو۔ اس سے تو دونوں فرقوں میں قدر نہیں ہوتی۔ ایسا شخص دونوں جگہ ذلیل ہوتا ہے اور اگر کوئی ایک طبقہ میں کامل طور سے داخل ہو تو کم از کم اس طبقہ میں تو اس کی تعظیم ہوگی اور عالم کی تو اہل دنیا میں بھی تعظیم ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں طمع نہ ہو جو مانع عظمت ہے جو عالم طمع سے خالی ہو اس کی علماء بھی تعظیم کرتے ہیں اور دنیا دار بھی چاہے اس کا کیسا ہی خستہ حال ہو اور اہل دنیا نہ بھی تعظیم کریں تو علماء تو ضرور اس کی وقعت کریں گے۔

علم کا خاصہ

چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس درس میں آئے جو لباس اور صورت سے بہت ہی خستہ حال تھے۔ طلباء نے اس کی طرف التفات بھی نہ کیا۔ یہ سمجھے کہ کوئی معمولی شخص ہے اور یہ علوم غامضہ کا درس کیا خاک سمجھے گا مگر اثناء درس میں اس نے ایک سوال کیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں اور طلباء کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوگئی کیونکہ

تامرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(جب تک آدمی گویا نہ ہو اس کا عیب و ہنر پوشیدہ رہتا ہے ہر جنگل کو خالی مت سمجھو' ممکن ہے کہ اس میں شیر سویا ہوا ہو)

واقعی علم ایسی چیز ہے کہ ایک بات میں اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہاں تصوف کی قلعی کسی طرح نہیں کھلتی کیونکہ خاموش رہیں تو چپ شاہ کہلائیں' بولنے لگیں اور ڈھنگ کی بات کہیں تو محقق و عارف کہلائیں اور بے ڈھنگی ہانکیں تو صاحب رموز مجذوب سمجھے جائیں مگر علم کی قلعی تو ایک ہی بات میں کھل جاتی ہے یہ چھپ نہیں سکتا۔

علی حزیں شاعر کے پاس ایک شخص آیا۔ لباس سے شان و شوکت ٹپکتی تھی' علی حزیں سمجھا کہ شاید کوئی تعلیم یافتہ مہذب شخص ہے' یہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا' اس کی خاطر سے پاؤں سمیٹ لیے' جب بات چیت شروع ہوئی تو علی حزیں نے اس سے نام پوچھا' کہا ایسف (بجائے یوسف) علی حزیں نے یہ سنتے ہی پاؤں پھیلا دیئے اور کہا بابا اگر تو ایسف

ہستی من پائے خود چرا کشم کہ اگر تم ایسف ہو تو میں اپنے پیر کیوں سمیٹوں۔ غرض وہ ایک ہی لفظ سے سمجھ گیا کہ مخاطب محض جاہل ہے اور اسی وقت سے تعظیم قطع کردی کیونکہ تعظیم تو کمال کی ہوتی ہے لباس کی تعظیم نہیں ہوا کرتی اور اہل دنیا کی جو تعظیم لباس کی وجہ سے کی جاتی ہے اس کا منشا عظمت نہیں بلکہ خوف ہے جیسے سانپ کو دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی تھانیدار کو جیل خانہ کی سزا ہو جاتی ہے وہاں جا کر دیکھئے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے۔ چونکہ قانوناً جیل خانہ کے بعد وہ دوبارہ حکومت کے عہدہ پر نہیں جا سکتا اس لیے جیل خانہ والے اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں تو اگر ان میں سے کسی پر زمان حکومت میں اس نے ظلم کیا ہو تو اب وہ خوب اس سے بدلہ لیتے ہیں، مارتے ہیں، منہ پر تھوکتے ہیں اور بری گت بناتے ہیں۔

جیل میں اہل کمال کا حال

میں نے تو ایک مرتبہ جیل خانہ کا معائنہ کیا ہے مجھے تو معائنہ ہی سے بے حد وحشت ہوئی، اللہ سب کو اس سے بچائے۔ البتہ اہل کمال جیل خانہ میں پہنچ کر بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے شیر کٹہرے میں بند ہوتا ہے۔ اگر کسی نے جیل خانہ میں جانے سے پہلے ان کی عظمت کی ہوگی وہ اب بھی ان کی عظمت کرے گا ان کے ساتھ اہل دنیا کا سا برتاؤ کوئی نہیں کرتا۔ کٹہرے میں بند شدہ شیر کا قصہ مجھ سے ایک عزیز نے بیان کیا ہے کہ شیر کٹہرے میں بند تھا، ایک شخص لکڑی دکھلا کر اسے دھمکا رہا تھا اور وہ کٹہرے میں ٹہل رہا تھا، ایک دفعہ جو اسے غصہ آیا اور اس نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا اور غرایا، چنگھاڑ ماری تو میاں کھڑے ہی کھڑے گر پڑے، بڑی دیر کے بعد ہوش آیا اور لوگوں کو اس حماقت پر ہنسی آئی کہ یہ خواہ مخواہ ہی ڈرا وہ تو لوہے کی سلاخوں میں بند تھا مگر اس کی وہ ادا ایسی ہیبت ناک تھی جس سے سب مقدمات ذہن سے رخصت ہو گئے۔ عوام کی عادت ہے کہ شیر کے متعلق اس قسم کی بات کو سن کر کہا کرتے ہیں صاحب کیوں نہ ہو آخر شیر ہی جو تھا؟ نہ معلوم اس دلیل کا کیا مطلب ہے اور اس کو شیر کہنا اس کی عظمت و ہیبت کی دلیل کیونکر ہو گئی۔ شاید اس لفظ میں وضعاً کچھ عظمت پر دلالت ہوگی۔ سو اسی طرح اہل کمال جیل خانہ میں بھی باعظمت ہوتے ہیں۔ شکستہ لباس میں بھی ان کا رعب وجلال ظاہر ہوتا ہے۔

شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھئے کہ آپ لباس ہمیشہ موٹا پہنتے تھے اور کمبل اوڑھا کرتے تھے مگر اس کمبل ہی میں رعب و جلال کی یہ حالت تھی کہ سفراء دول آپ سے کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بادشاہ کا سفیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو صورت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی یہ حالت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ آپ اپنے رعب کو کم کرنا چاہتے تھے' کوئی دنیا کا بادشاہ ہوتا تو اس حالت سے خوش ہوتا کہ مجھے دیکھ کر سفراء دول کانپتے ہیں۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو دین کے بادشاہ تھے' آپ خود اس کی خواہش کیوں کرتے۔ چنانچہ سفیر کی یہ حالت دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلی دی اور فرمایا کہ بھائی مجھ سے کیوں ڈرتے ہو' میں تو ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ یعنی غریب تھی جو گوشت کو سکھا کر دوسرے اوقات کے لیے رکھتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اپنی تواضع کو ظاہر فرمایا' شاید کوئی کہے کہ گو لباس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سادہ تھا مگر شاید کوئی اور ہیئت رعب کی ہو گی تو سنئے! حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں اس طرح بیٹھا کرتے تھے کہ نو وارد کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان میں سردار کون ہیں اور خادم کون ہیں۔ کوئی صورت امتیاز کی نہ تھی اسی لیے نو وارد کو پوچھنا پڑتا تھا۔ "من محمد فيكم" تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ صحابہ فرماتے: "هذا الابيض المتكئى" (یہ گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو نشست و برخاست کی سادگی تھی اور گفتگو کی سادگی یہ تھی کہ دیہات والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یا محمد ابن عبدالمطلب کہہ کر گفتگو کرتے تھے' صاف نام لیا کرتے تھے' القاب و آداب کچھ نہ استعمال کرتے تھے' اس میں کچھ تو ان کے دیہاتی ہونے کا اثر تھا اور کچھ عرب میں سادگی ہے۔ بھئی سنا ہے کہ اب تک بھی ان کی یہی معاشرت ہے کہ وہ اپنے امراء و سلاطین کو نام لے کر خطاب کرتے ہیں۔ شیوخ عرب شریف مکہ کو یا حسین یا حسین کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور آج کل ابن مسعود کے متعلق بھی سنا گیا ہے کہ ان کے بعض آدمی یا ابن مسعود کہہ کر ان سے خطاب کرتے ہیں اور چلنے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ

سادگی تھی کہ آپ اکثر صحابہ کے پیچھے چلتے تھے اور کبھی درمیان میں ہوجاتے تھے۔ غرض میمنہ میسرہ اور مقدمہ ساقہ کی کوئی ترتیب نہ تھی بلکہ کبھی کوئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے ہوجاتا کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آگے ہوجاتے اور کبھی سب سے پیچھے ہوجاتے۔ شاید کوئی کہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا تھا جس سے دیکھنے والے پر رعب پڑتا ہوگا کیونکہ حسن کا بھی رعب ہوتا ہے تو سنئے حسن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اول نظر میں دیکھنے والے کو مغلوب کردے مگر بار بار دیکھنے سے رعب کم ہوجائے' دوسرے وہ جو اول نظر میں مرعوب نہ کرے اور جوں جوں نظر کرتا جائے دل میں کھبتا چلا جائے۔

یزیدک وجه حسناً اذا ماز دته نظراً

(جبکہ اس کو تم جس قدر زیادہ دیکھو گے اس کے چہرہ میں حسن زیادہ نظر آئے گا)

حسن محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دوسری قسم کا تھا کہ اول نظر میں مرعوب نہ کرتا تھا' ہاں جتنا زیادہ قریب ہوتا اتنا ہی دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا اور یہ جو حدیث میں آیا ہے۔ ''من راہ بداھة ھابه'' (جو شخص آپ کو بداہتہً دیکھتا اس پر ہیبت طاری ہوجاتی تھی) وہ ہیبت محض حسن کی نہ تھی بلکہ کمالات نبوت کی تھی۔

طلباء کو نصیحت

چنانچہ یہی شان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اہل اللہ کو عطا ہوتی ہے کہ وہ جیل خانہ میں بھی اور شکستہ حالت میں بھی باعظمت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس شخص نے جس کا اوپر ذکر ہوا تھا کہ شکستہ حالت میں درس میں آ بیٹھا تھا جب درس میں سوال کیا اور اس کا کمال ظاہر ہوا تو سب اس کی عظمت کرنے لگے۔ پس میں طلبہ سے کہتا ہوں کہ تمہارا فخر یہی ہے کہ جس جماعت میں تمہارا شمار ہے تم اسی کی اصطلاح اور وضع اور طرز اختیار کرو' تمہاری اسی میں عزت و عظمت ہے اور اگر مخلوق میں اس سے عزت نہ ہوئی تو کیا پروا ہے خالق کے یہاں تو ضرور عزت ہوگی' پھر تم اپنی وضع کیوں بدلتے ہو۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں:

یامکش بر چہرہ نیل عاشقی	یا فروشو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یاتو نشاں محبت چہرہ پر مت کھینچواؤ یا جامہ تقویٰ کو دریائے نیل کے پانی سے دھوڈالو)

اے جامہ دعویٰ تقویٰ

یامکن باپیل بانان دوستی	یا بناکن خانہ بر انداز پیل

(یاتو ہاتھی والوں سے دوستی مت کرو یا گھر کو ہاتھی کے اندازہ کے مطابق بناؤ)

اگر مولویوں میں آئے ہوتو مولویوں کی سی حالت بناؤ۔ اس وضع سے ننگ و نام کا اندیشہ ہوتو اس کا جواب دوسری غزل میں اس طرح دیا ہے۔

گرچہ بد نامیست نزد عاقلاں	مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگر چہ عقل مندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ وناموس کے خواہاں نہیں ہیں)

تم کو ایسی تواضع اور پستی اختیار کرنا چاہیے کہ تمام دنیا پستی وتواضع میں تمہاری شاگرد ہوجائے اور تم اس شعر کے مصداق ہوجاؤ اور بانگ دہل یوں کہو۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن	پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(جلنا بھننا' کپڑے پھاڑنا پروانہ شمع اور گل نے مجھ سے ہی سیکھا ہے)

اسی مضمون کو مولانا اس طرح فرماتے ہیں:

آتش عشق ست کاندرے فتاد	شورش عشق ست کاندرے فتاد

(آتش عشق ہے کہ شراب میں پڑی ہے اور شورش عشق ہے جو بانسری میں واقع ہے)

غرض تم ایسے متواضع ہوجاؤ کہ ہر چیز میں تمہاری ہی تواضع کا اثر ظاہر ہو۔ تم کو ظاہری اسباب عزت کی کچھ ضرورت نہیں' انسان تو وہ ہے جو کمالات میں بادشاہ ہو' گو ظاہر میں فقیر ہو۔ عارف فرماتے ہیں:

مبیں حقیر گدایان عشق راکاین قوم	شہان بے کمر وخسروان بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر مت سمجھو یہ لوگ تخت وتاج کے بادشاہ ہیں)

اور ایک جگہ اپنی گدائی پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں	کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(میں گدائے میکدہ ہو کہ مستی کے وقت دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

لباس معیار لیاقت نہیں

لباس اور وضع سے یا اہل دنیا کے طرز گفتگو سے عزت کا طلب کرنا انسان کا کام نہیں اور یہ تو نہایت ہی بھدا پن ہے کہ لباس سے کسی کی قدر و قیمت پر استدلال کیا جائے۔ یہ بات ہمیں شملہ میں پیش آئی ہے جبکہ ہم وہاں وفد بن کر گئے تھے۔ گو آج کل کے وفود میں شرکت کرنا مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ وہ بالآخر وفود ہو جاتے ہیں مگر وہ وفد دیوبند کے حضرات کا تھا آج کل کے وفود جیسا نہ تھا۔ جب وہاں پہنچے تو مختلف اوقات میں متعدد حضرات کے بیانات ہوئے، جمعہ کے دن میرا بیان ٹھہرا تھا۔ چنانچہ میں جمعہ کی نماز کے بعد بیان کو کھڑا ہوا اس دن غریب مسلمان بھی دوسرے دنوں سے اچھے کپڑے پہنتے تھے اور میں تو زیادہ غریب بھی نہیں۔ الحمدللہ متوسط حالت ہے تو میرے کپڑے اپنے نزدیک خاصے تھے مگر ایک جنٹلمین صاحب کی نظر میں وہ بھی حقیر معلوم ہوئے۔ چنانچہ وہ صاحب ہمارے بیانات کے اعلان کرنے والے سے جو ایک ریاست کے کرنل تھے کہنے لگے کہ آپ کے مولویوں کا کیسا لباس ہے جیسے پائخانہ سے نکل کر آئے ہوں۔ شاید کرنل صاحب نے دانش مندی کا جواب دیا کہ میں ابھی کچھ نہیں کہتا، بیان کے بعد جواب دوں گا۔ چنانچہ بیان ہوا اور وہ معترض بھی بہت محظوظ و حیرت زدہ ہوئے۔ اب کچھ نہیں بولتے مگر کرنل صاحب نے خود پوچھا کہ ہاں اب کہیے آپ کیا فرماتے تھے تو وہ معترض بڑے چپ ہوئے اور کہا اب کیا کہوں میں اپنی حماقت پر خود شرمندہ ہوں۔ میں تو اب تک لباس سے لیاقت پر استدلال کرتا تھا اب معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط ہے۔ افسوس یہ تو تعلیم یافتہ لوگ اپنی عقل پر اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں جن کے نزدیک لباس معیار لیاقت ہے لباس کو تو معیار لیاقت کوئی احمق بھی نہیں کہہ سکتا مگر وہ شملہ کی چوٹی پر رہ کر بھی جو ان لوگوں کی گویا معراج ہے اس حماقت میں مبتلا تھے۔

اس کے بعد میرا بیان پھر ہوا اور اس وقت یہ حکایت میرے کان میں پڑ چکی تھی تو میں نے ان لوگوں کے کان کھولنا چاہے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بعض خیر خواہان کا یہ خیال ہے کہ علماء کو لباس عمدہ پہننا چاہیے اور غالباً ان کا یہ خیال خیر خواہی اور دلسوزی ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ علماء کی عزت ہو، کسی کی نظر میں ذلت نہ ہو،

اس سے ان کے بیان کی بھی وقعت بڑھے گی تو ہم اس خیر خواہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں (میں نے انہی کے محاورات استعمال کیے جیسے میرٹھ میں ایک انگریز وکیل ایک دیہاتی سے کہہ رہا تھا کہ مطبل بھی سمجھ گیا) مگر دیکھنا یہ ہے کہ علماء قیمتی لباس کہاں سے پہنیں' ان کی آمدنی کی تو حالت یہ ہے کہ کوئی بیس روپیہ کا مدرس ہے کوئی پندرہ روپیہ کا کسی مطبع میں مصحح ہے اور جس کے اسی روپے یا سو روپیہ ماہوار ہوں وہ تو مولویوں میں صاحب معراج ہے۔ اب بتلائیے وہ عمدہ عمدہ اور قیمتی لباس جو آپ کی نظر میں بھی عمدہ اور قیمتی ہو کس طرح پہنیں۔ سو اس کے دو ذریعے ہیں جن میں سے ایک تو ہمارے نزدیک بھی اور آپ کے نزدیک بھی حرام ہے۔ گو آپ کے نزدیک عقلاً حرام ہے اور ہمارے نزدیک شرعاً حرام ہے اور ایک صرف ہمارے نزدیک حرام ہے۔ دوسری صورت تو یہ ہے کہ مولوی بھی آپ کی طرح ڈپٹی کلکٹری اور ججی وغیرہ کے منصب حاصل کریں یہ تو ہمارے نزدیک حرام ہے اور پہلی یہ صورت ہے کہ وعظ کے بعد سوال کیا کریں کہ صاحبو! ہمیں جھانسی کے ٹکٹ کی ضرورت ہے یہ سب کے نزدیک حرام ہے ہمارے یہاں نقلاً اور آپ کے یہاں عقلاً تو مولوی تو اس حالت میں عمدہ اور قیمتی لباس بنانے سے معذور ہے۔ ہاں ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ جن خیر خواہوں کی یہ رائے ہے وہ خود یا اپنے چند احباب سے چندہ کر کے ہمارے قیمتی جوڑے اپنی پسند کے موافق بنا دیں۔ ہم جب تک شملہ میں رہیں گے ان جوڑوں کو پہن کر وعظ کہا کریں گے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شملہ سے جاتے ہوئے وہ جوڑے آپ کے حوالہ کر دیں گے ہم اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے پھر آپ ان جوڑوں کو بہتر یہ ہے کہ یہاں کی انجمن میں وقف کر دیں اور جب کوئی مولوی ہمارے جیسا خراب و خستہ لباس والا آوے اس کو وعظ کہنے کے لیے دے دیا کریں کہ تم اس جوڑے کو پہن کر وعظ کہو تا کہ مخاطبین پر اثر ہو۔ بس وہ جوڑے اسی کام کے واسطے رکھے رہیں اس سے آپ کا مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور علماء پر بھی قیمتی کپڑے بنانے کا بار نہ پڑے گا اور چونکہ آپ لوگ علماء سے زیادہ صاحب ثروت ہیں آپ کو یہ کام کچھ گراں بھی نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ آپ کی ہی پیش کردہ رائے ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہاں سے جا کر تم نے کسی اور جگہ اپنے کپڑوں میں وعظ کہا تو وہاں ذلت ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اور جگہ کے مسلمانوں سے بھی اگر انہوں نے

ہمارے لباس کو حقیر سمجھا یہی کہیں گے جو آپ سے کہہ رہے ہیں۔ دوسرے آپ کو دوسروں سے کیا لینا آپ کو تو اپنے یہاں کا انتظام کرنا چاہیے۔ پس اب میں منتظر ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کون کون صاحب ہمارے لیے جوڑے تیار کر کے لاتے ہیں مگر صدائے برنخاست۔

آج کل قوم کی حالت

بس آج کل قوم کی یہ حالت ہے کہ سارا الزام مولویوں پر رکھتی ہے اور جب ان کے کام کا وقت آتا ہے تو خاموش ہو کر کان دبا لیتے ہیں۔ بلا تشبیہ آج کل مولویوں کی وہ حالت ہو رہی ہے جو بھٹیاری کے لڑکے کی حالت تھی۔ حکایت تو فحش ہے مگر مطابق حال ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں پہنچا اور بھٹیاری کو آٹا دال وغیرہ کھانا پکانے کی غرض سے دیا اور سپاہی خود بھی چولہے کے پاس ہی پلنگ بچھا کر بیٹھ گیا تاکہ بھٹیاری چوری نہ کر سکے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ تو سر ہی پر سوار ہے تو کھانا پکا کر سپاہی کے سامنے رکھا اور اپنے لڑکے سے کہا کہ تو بھی بیٹھ جا۔ چنانچہ وہ بھی سپاہی کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانے لگا اور بھٹیاری نے اس طرح چوری کی مکافات کی' سپاہی نے دستر خواں پر سے لڑکے کو اٹھانا خلاف شرافت سمجھا' خاموش ہو گیا اور بھٹیاری خوشامد میں پنکھا لے کر جھلنے لگی' اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی کہ سپاہی نے بھی آواز سن لی' اس نے شرم اتارنے کو فوراً اپنے لڑکے کے ایک چپت مارا کہ در (یعنی دھر) ہوئے یہ کیا کرتا ہے' سپاہی سمجھ گیا کہ اس نے شرم اتارنے کے لیے لڑکے پر الزام رکھا ہے تو اس نے شرارت کی کہ قصداً زور سے ریح صادر کی اور لڑکے کے ایک دھول رسید کیا اور کہا سسرے کرے گا کوئی مگر پٹے گا تو ہی' بس وہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ سارا الزام انہی پر ہے آریہ تو مسلموں کو مرتد کریں تو علماء پر الزام کہ انہوں نے تبلیغ میں کوتاہی کی۔

قادیانی فرقہ مسلمانوں کو کافر بنائے تو مولویوں پر الزام' ترکوں کو جنگ میں شکست ہو تو مولویوں پر الزام اور اگر ان سے کہا جائے کہ بھائی مولوی اپنی جان سے تبلیغ وغیرہ کے لیے موجود ہیں مگر ان کے اہل وعیال کے لیے بھی تو کھانے پینے کا انتظام کیا جائے اور دورہ کے لیے کرایہ کا بندوبست کیا جائے' اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے اس کا سامان تم کرو

تو اس کا کچھ جواب نہیں، گویا ان کے ذمہ دین کی خدمت بالکل ضروری نہیں، ہاں بس ان کے ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ مولویوں کو الزام دیا کریں تو ہم اس میں بھی راضی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے عاشق صادق بننے کی ضرورت

اور میں طلباء سے کہتا ہوں کہ تم کسی کی تحقیر کی پروانہ کرو، اگر کوئی تمہارے طرز میں عیب نکالے نکالنے دو، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کافی ہے، تم ان کو راضی کرنے کی فکر کرو اور یاد رکھو کہ عشق میں تو ملامت ہوا ہی کرتی ہے تم خدا تعالیٰ کے عاشق بننا چاہتے ہو تو ملامت سننے کے لیے تیار رہو۔

نسازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوے ملامت

(عشق کے لیے گوشہ سلامتی لائق نہیں اس میں تو رسوائی کے کوچہ کی ملامت بہت اچھی ہے)

اور اگر کوئی تم کو نحوست ونکبت سے مطعون کرے یا کوئی دیوانہ کہے تو تم اس کو یہ جواب دو۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش ہیں یا دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے، یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی ومحبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں)

عارف شیرازی سلامت کو مٹانے اور ملامت کو گوارا کرنے کے حق میں فرماتے ہیں:

ایں خرقہ کہ من دارم دررہن شراب اولیٰ ویں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

(یہ لباس جو کہ میں پہنے ہوئے ہوں، شراب خانہ میں رکھنا بہتر ہے اور میرے دفتر فضولیات کو شراب کے مٹکے میں ڈبونا بہتر ہے۔)

من حال دل اے زاہد باخلق نخواہم گفت کایں نغمہ اگر گویم باچنگ و رباب اولیٰ

(زاہد اپنے دل کے حال کو دنیا سے کہنا نہیں چاہتا اگر میں اس نغمہ کو گاؤں تو کوچہ ملامت ہی زیادہ بہتر ہے)

ایک بزرگ نے چنگ ورباب کی تفسیر ملامت سے کی ہے کہ ملامت کے وقت میں یہ نغمہ عشق ظاہر کروں گا کیونکہ محبوب کے لیے ملازمت اور ڈھول ڈھپہ میں بھی

لذت ہوتی ہے اور یہ حالت عشاق مجازی تک پر طاری ہوتی ہے وہ بھی اپنے اشعار میں اس ذلت کو ظاہر کرتے ہیں۔

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست تونیز برسر بام آ کہ خوکش تماشائیست

(تیرے عشق کے جرم میں مجھے کھینچے لیے جاتے ہیں اور بھیڑ لگی ہوئی ہے تو بھی تو کوٹھے پر آ کر دیکھ لے کہ کتنا اچھا تماشا ہو رہا ہے)

جو کلام مؤثر ہو سمجھ لو کہ حال سے نکلا ہے' خواہ عشق حقیقی کا حال ہو یا مجازی کا ہو' حالات دونوں کو قریب قریب ہی پیش آتے ہیں۔

ایک عاشق مجازی کی حکایت

ابن عطاء اسکندریؒ نے ایک عاشق مجازی کی حکایت اسی مضمون پر لکھی ہے کہ لوگوں نے تہمت عشق پر اس کے سو کوڑے مارے تو ننانوے پر اس نے آہ بھی نہ کی' سویں کوڑے پر آہ کی' کسی نے پوچھا کہ ننانوے کوڑے کا تو تحمل کرلیا اور اخیر کے ایک کوڑے کا تحمل نہ ہوا' اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا ننانوے تک تو محبوب میرے سامنے تھا اور وہ کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا کہ میری محبت میں اس کو یہ مصیبت پیش آئی' اس لذت میں مجھے الم ضرب کا احساس نہ ہوا' ننانوے کے بعد وہ چلا گیا تو مجھے الم کا احساس ہوا اس لیے آہ نکل گئی۔ تو اے صاحبو! یہ اس کا محبوب تھا جو غائب ہو گیا اور آپ کا محبوب تو ہر دم آپ کے ساتھ ہے' ہر حالت میں آپ کو دیکھ رہا ہے' جس کی شان یہ ہے کہ "لَاتَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَانَوْمٌ" (نہ اس کو اونگھ آتی ہے نہ نیند' پھر آپ کو ملامت اغیار میں زیادہ لذت آنا چاہیے۔)

راضی بہ رضا الٰہی رہنے کی ضرورت

غرض طلبہ نے یہ نیا طرز سیکھا ہے کہ لباس و گفتگو میں تکلف و تصنع برتنے لگے' ایسے ہی تکلف کے واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

جملہ اوراق و کتب درنار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام ورقوں اور کتابوں کو آگ میں ڈال اور اپنے سینہ کو نور حق سے گلستان بنا)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنٹلمینیوں کی وضع چھوڑ کر بزرگ کی وضع بنانے لگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے کوئی خاص وضع نہ بناؤ جو محبوب دے وہ پہنو' شال دے شال اوڑھو' کمبل دے کمبل اوڑھو اور ہر حال میں خوش رہو مگر حدود شرعیہ سے باہر نہ جاؤ۔ ایک شادی میں دو شخص جمع تھے جو باہم عزیز تھے مگر ایک نے درویشی اختیار کر لی تھی وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور دوسرے رئیس تھے وہ شال اوڑھے ہوئے تھے اور یہ رشتہ میں بڑے تھے۔ جب دونوں ایک مجلس میں مجتمع ہوئے تو رئیس نے کہا یہ کمبل اتارو کیا خرافات لباس ہے ہمیں برا لگتا ہے' درویش نے شال کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم اس کو اتار دو مجھے یہ بری لگتی ہے۔ اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے کمبل ہی میں خوش تھا' ایسا ہی تم کو ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ جس حالت میں رکھیں اسی میں خوش رہو اور کسی کی طعن کی پروا نہ کرو اور دوسرے وقت اگر اللہ تعالیٰ تم کو شال اوڑھا دیں تو اس وقت شال اوڑھ لو' اب کمبل کے پابند نہ ہو کیونکہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص حالت عبادت کی مقرر نہیں کی بلکہ اس کی ہر حالت جو حدود کے اندر ہو عبادت ہے۔

کمال عبدیت انسان میں نمایاں ہے

ہمارے حاجی صاحب نے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (میں نے انسانوں اور جنوں کو بجز عبادت کے اور کسی لیے پیدا نہیں کیا) کی تقریر میں یہ نکتہ ظاہر فرمایا تھا جس سے اس اشکال کا جواب دیا تھا کہ عبادت تو اشجار و احجار و جبال و سموات و ملائکہ سب کرتے ہیں: چنانچہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ۔

(کیا نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں)

پھر انسان و جن کی تخصیص آیت میں کیوں کی گئی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور مخلوق کی عبادت مثل مزدور یا نوکر کی خدمت کے ہے جو معین ہوتی ہے اور انسان کی عبادت غلام کی خدمت کے مثل ہے جس کے لیے کوئی صورت معین نہیں۔ غلام ایک

وقت میں آقا کا پاخانہ بھی اٹھاتا ہے اور دوسرے وقت میں آقا کی وردی پہن کر اس کی جگہ جلسوں میں جاتا ہے تو غلامی جو حقیقت ہے عبدیت کی اس کی پوری شان انسان ہی میں نمایاں ہے کہ اس کے لیے کوئی خدمت معین نہیں، ایک وقت میں تاج کرمنا (ہم نے مکرم کیا) اس کے سر پر ہے طوق فضلنا (ہم نے فضیلت دی) اس کی گردن میں ہے خلافت الٰہی کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اس وقت تمام عالم اس کا مسخر ہے۔ چنانچہ روح کی تجلی ہوتی ہے تو تمام عالم اس کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور اس وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ کی تجلی ہے چنانچہ اس مقام پر بہت سے پھسل گئے ہیں کہ تجلی روح کو تجلی الٰہی سمجھ کر برسوں اس کی عبادت کرتے رہے اور ایک وقت میں حضرت انسان پاخانہ میں تشریف فرما ہوتے ہیں اس وقت اس کا ہگنا موتنا بھی عبادت میں داخل ہے، یہ بات کسی مخلوق کو حاصل نہیں، یہ حضرت انسان ہی ہیں جو ہر حالت میں عابد ہیں، سوتے ہوئے بھی، روتے ہوئے بھی، ہنستے ہوئے بھی، ہگتے ہوئے بھی۔ پس میں علماء کو کہتا ہوں کہ تم اپنی حالت کو سرکاری وردی سمجھو نہ ذلت کی پروا کرو، نہ عزت کی غرض، مخلوق پر نظر ہی نہ کرو، سب سے نظر ہٹالو۔

اخفاء عبادت میں ریا

عام صوفیہ کا مشہور قول ہے کہ اظہار عبادت مخلوق پر ریا ہے اور محققین حضرات کا ارشاد ہے کہ اخفاء عبادت خلق سے ریا ہے کیونکہ مخلوق پر نظر ہی کیوں گئی جو اس سے اخفاء کا اہتمام کیا۔ اگر تم مخلوق کو ایسا سمجھتے جیسی مسجد کی صفیں تو ان سے اخفاء نہ کرتے۔ کوئی مسجد کی صفوں سے بھی اخفاء کا اہتمام کیا کرتا ہے بس تم مخلوق کو کالعدم اور لاشئے محض سمجھو کسی پر نظر نہ کرو، صرف ایک ذات پر نظر رکھو۔

دلارامے کہ داری دل درو بند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

یہی تو وحدۃ الوجود ہے جو کسی کی زبان سے کسی طرح نکل گیا وہ کافر کہلائے گا کیونکہ اس نے زبان عشق میں اس کو ظاہر کیا اور عاشق کی زبان کافی نہیں ہوتی۔ توضیح مراد کے لیے عاقل کی زبان کافی ہوتی ہے چنانچہ محققین اسی وحدۃ الوجود کو زبان عقل سے ظاہر کرتے ہیں ان پر کوئی

فتویٰ نہیں لگا سکتا مگر جن پر فتویٰ لگایا گیا ہے ان کو اس کی بھی پروا نہیں وہ اپنے کلام میں تاویل بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایمان وکفر مخلوق کے ہاتھ میں نہیں ہے اور تاویل وہ کرے جو مخلوق پر کچھ بھی نظر کرتا ہو اور جس کی نظر مخلوق پر بالکل نہ ہو اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔

خود کو مٹانے کی کوشش کرو

پھر جس کی نظر مخلوق سے اس قدر اٹھی ہوئی ہو اور جس کا یہ مذاق ہو کہ اخفاء اطاعت خلق سے بھی ریا ہے وہ بھلا بڑا بننے کی تو کوشش کیوں کرے گا کیونکہ بڑا بننے میں تو اپنے اوپر بھی نظر ہوتی ہے اور مخلوق پر بھی اور فانی کی نظر کسی پر نہیں ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ بڑا بننے کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے جو متکبرین نے اختیار کی ہے کہ بڑا بننے کے سامان کرتے ہیں بلکہ اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ اپنے کو مٹا دو۔ افسوس بعض شعراء نے اس کو سمجھ لیا اور آج کل علماء نے بھی اس کو نہ سمجھا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزت شو ؏ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(یعنی اگر تم کو شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہو جاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے عنقا تمام دنیا میں مشہور ہو گیا)

عنقا نے اپنے کو مٹا دیا تو اس کا نام اس قدر مشہور ہوا کہ مخلوق کی زبان زد ہے۔ اسی طرح تم اپنے کو مٹا دو، گمنام کر دو، سب سے الگ ہو جاؤ تو پھر تمہاری محبوبیت کی شان یہ ہو گی کہ تم چپ ہو گے تو لوگ تمہارے بولنے کے شیدا ہوں گے۔ حجرہ میں بیٹھو گے تو مخلوق تمہارے خروج کی متمنی ہو گی اور یوں کہے گی۔

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوندو حیراں ؏ بکشائے لب کہ فریاد از مرد و زن برآید

مخلوق کو چہرہ انور دکھلا دیجئے کہ وہ دیدار کے لیے بے تاب وحیران ہیں۔ لب مبارک کھولئے کہ تمام مرد وزن آپ کا کلام سننے کی التجا کر رہے ہیں مگر اس نیت سے اپنے کو نہ مٹانا کیونکہ اس نیت کے ساتھ تم مٹنے ہی کے نہیں اس حالت میں ڈلے پتھر کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

فنا بغرض شہرت کبر ہے

فناء بغرض شہرت کبر ہے اسی طرح تفویض بغرض راحت تجویز ہے۔ بعض لوگ اس غرض سے تفویض کرتے ہیں کہ اس میں راحت بہت ہے تم اس کا قصد کر کے تارک تفویض نہ بنو بلکہ فنا کا اس لیے قصد کرو کہ تم واقع میں فنا ہی کے مستحق ہو۔

وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب

(تیرا وجود ہی گناہ ہے کسی گناہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا)

اور تفویض اس نیت سے کرو کہ یہ محبوب کا حق ہے کہ سب کام اسی کے سپرد کر دیا جاوے۔

سپردم بتو مایہ خویش را　　　　تو دانی حساب کم و بیش را

(میں نے اپنا سرمایہ تیرے حوالے کر دیا حساب کی کمی بیشی کو تو ہی جانے)

اگر کہو یہ بڑی دور کی بات ہے تو میں کہتا ہوں کہ دنیوی مقاصد کون سے قریب ہیں، وہ بھی تو دور ہی ہیں، کھانا کھاتے ہو بتلاؤ وہ کتنی دور سے حاصل ہوتا ہے، کسی نے بویا، کسی نے کاٹا، کسی نے پیسا، پھر گوندھا اور توے پر ڈالا اور کھانے بیٹھے، پھر بھی اول لقمہ سے سیری نہیں ہوتی بلکہ لقمہ اخیر سے شبع ہوتا ہے۔ بتلاؤ کتنی لمبی مسافت ہے۔ اسی طرح پانی پیتے ہو تو جرعہ اخیر سے سیرابی ہوتی ہے وہ بھی تو دور ہی ہے اور تفویض تو اس سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ حضرت بایزیدؒ نے خواب میں حق تعالیٰ سے پوچھا "دلنی علی اقرب الطرق الیک" کہ مجھے اپنے پاس پہنچنے کا نزدیک تر راستہ بتلا دیجئے۔ ارشاد ہوا "دع نفسک وتعالیٰ" کہ اپنے آپ کو چھوڑ دو اور آ جاؤ، بتلایئے اس میں کون سا بعد ہے اپنے کو چھوڑ دو بس وہ قریب ہیں۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(جب محبوب اور محب کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے اے حافظ تو اس حجاب خودی کو درمیان سے اتار پھینک)

تکوین مقصود قرآن نہیں

یہ مضمون تو بہت طویل ہے، گھنٹوں میں بھی ختم نہ ہو گا۔ اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلباء کو تکلف و تصنع سے احتراز کرنا چاہیے۔ اسی کے ضمن میں

یہ بات بیان کی تھی کہ طلباء آج کل انگریزی الفاظ کے استعمال کو فخر سمجھتے ہیں یہ بہت برا ہے اور یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے تکوین کا ترجمہ تفہیم مخاطبین کے لیے سائنس سے کیا تھا' غرض تکوین مقصود قرآن نہیں ہے بلکہ اصل مقصود دین کا بیان ہے' تکوین کا ذکر بھی قرآن میں دین ہی کے لیے ہے مقصود انہیں ہے۔

چند معقولی حضرات کی حکایات

تو اس آیت سے اوپر جس کی میں نے تلاوت کی ہے کچھ مضامین دینیہ مذکور ہیں۔ حق تعالیٰ ان کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں: "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا" (اب جس کا جی چاہے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لے) یہاں فمن شاء (اب جس کا جی چاہے) سے تخییر مطلوب نہیں بلکہ ترغیب و تحریض مقصود ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا تا کہ کوئی معقولی اس کو تخییر پر محمول نہ کرے کیونکہ جن پر معقول کا غلبہ ہوتا ہے ان کو ذوق لسان نہیں رہتا تو معقولی صاحب تو یہاں فمن شاء دیکھ کر یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اختیار دے رہے ہیں کہ جس کا جی چاہے راستہ اختیار کرے اور ایسے واقعات بدفہمی کے معقولیوں سے وقوع میں آ چکے ہیں۔ چنانچہ ایک معقولی طالب علم حضرت مولانا گنگوہی کے یہاں درس حدیث میں شریک تھے مگر حدیث النفس میں بھی مشغول تھے۔ جب ترمذی کی اول حدیث آئی: لَایَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةً بِغَیْرِ طَهُوْرٍ[1] (اللہ تعالیٰ بغیر پاکی کے کوئی نماز قبول نہیں کرتے) اور اس سے اشتراط وضو پر استدلال کیا گیا تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے شرط صحت ہونا تو معلوم نہ ہوا صرف شرط قبول ہونا معلوم ہوا جو اس طرح بھی متحقق ہو سکتا ہے کہ نماز کی صحت تو بدون وضو کے بھی ہو جائے گی مگر مقبول نہ ہو' پھر بعد نماز کے وضو کر لے جس سے اب نماز قبول ہو جائے۔ بس اس کا جواب بدون اس کے اور کیا ہے کہ معقول کی وجہ سے ان کا ذوق لسان مسخ ہو گیا جس کو ذرا بھی زبان کا ذوق ہوگا وہ لَایَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةً بِغَیْرِ طَهُوْرٍ۔ (اللہ تعالیٰ بغیر پاکی کے کوئی نماز قبول نہیں فرماتے) سے تقدم طہور کی ضرورت کو سمجھ لے گا۔ اسی طرح حضرت مولانا گنگوہی کے پاس ایک شخص آیا اور مسئلہ پوچھا کہ آدھا

---

[1] (سنن النسائی ۱: ۸۷' سنن الدارمی ۱: ۱۷۵)

چوہا کٹ کر کنوئیں میں گر پڑا، کتنے ڈول نکالے جائیں تو ایک معقولی صاحب جلدی سے بولے کہ تیرہ ڈول نکال دو۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ تو احمق ہے سارا پانی نکال دو، کنواں ناپاک ہوگیا، بعد میں معقولی صاحب نے حضرت سے پوچھا پورا چوہا گر پڑے اور مر جائے تو بیس سے تیس ڈول تک کا حکم ہے اور آدمی دم کرنے پر آپ نے سارا پانی نکالنا واجب کر دیا، اس کی کیا دلیل ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے تیرہ ڈول کس دلیل سے بتلائے، کہا میں نے بیس اور تیس کا اوسط پچیس نکال لیا تھا، پھر جب پورا چوہا گرتا تو پچیس ڈول ہوتے، اب آدھا گرا ہے تو پچیس کا آدھا ساڑھے بارہ ہوتے تھے، میں نے کسر کو پورا کر کے تیرہ ڈول بتلا دیئے اور پورا نکالنا واجب ہو تو "الکل اعظم من الجزء" کے خلاف لازم آتا ہے اور اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ کٹ کر گرا ہے تو کنوئیں میں دم مسفوح گرا اور دم مسفوح کا ایک قطرہ بھی سارے کنویں کو ناپاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر معقولی صاحب کو اس کا ہوش ہوتا تو سمجھتے کہ واقعی میرا حساب غلط تھا۔ ایک واقعہ معقولی کے ساتھ خود مجھے پیش آیا ہے۔ میں کانپور میں حدیث پڑھا رہا تھا ایک معقولی صاحب بھی درس میں آ بیٹھے تھے۔

یہ حدیث آئی "من انتھی الی غیر ابویہ لم یرح ریح الجنة"[1] جو شخص اپنے خاندان کو چھوڑ کر دوسرے خاندان کی طرف اپنی نسبت کرے گا وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔ آج کل شہروں میں یہ مرض بہت شائع ہوگیا ہے شہر میں جا کر جولا ہے بھی سید ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کابل سے ایک جولاہا ہندوستان آیا اور یہاں آ کر پٹھان بن گیا، کچھ دنوں کے بعد ایک پٹھان آیا، اس نے جو دیکھا کہ جولاہے نے اپنے کو پٹھان بنا رکھا ہے تو وہ سید بن گئے، اس کے بعد ایک سید صاحب آئے، انہوں نے دیکھا کہ یہاں پٹھان نے اپنے کو سید بنا رکھا ہے تو آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں (نعوذ باللہ منہ) لوگوں نے اس پر ہنسنا شروع کیا تو سید نے کہا کہ جس ملک میں جولاہا پٹھان اور پٹھان سید بن جاتا ہے وہاں سید اگر خدا کا بیٹا بن جائے تو کیا تعجب ہے اس نے سب کی قلعی کھول دی تو میں نے اس حدیث کی شرح میں کہا کہ یہ بہت سخت وعید ہے کہ ایسے شخص کو جنت کی خوشبو بھی نہ آئے گی تو جنت میں کیا جاتا تو معقولی صاحب بولے کہ اس سے دخول جنت کی نفی تو

---

[1] (مجمع الزوائد للھیثمی ۹: ۳۰۱، بلفظ آخیر)

لازم نہیں آتی، ممکن ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو کر بھی خوشبو نہ سونگھے، میں نے کہا یہ کیونکر کہنے لگے اس طرح کہ وہ مزکوم ہو جائے۔ میں نے کہا سبحان اللہ جنت میں بھی زکام ہوا تو جنت کیا ہوئی۔ غرض یہ معقولی محض الفاظ کے چکر میں رہتے ہیں اور امکانات بعیدہ ہی نکالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک معقولی صاحب ایک تیلی کی دکان پر تیل لینے گئے، وہاں دیکھا کہ بیل کی گردن میں گھنٹی پڑی ہوئی ہے، پوچھا بھائی اس گھنٹی میں کیا حکمت ہے، تیلی نے کہا کہ ہم لوگ غریب آدمی ہیں، سارے کام اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں، ہر وقت بیل کے ساتھ نہیں رہ سکتے، یہ گھنٹی اس کے گلے میں اس لیے ڈال دی ہے تاکہ اس کے بجنے سے معلوم ہوتا رہے کہ بیل چل رہا ہے، اگر گھنٹی بند ہوتی ہے تو ہم آ کر بیل کو پھر چلا دیتے ہیں اور چلا کر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ معقولی صاحب بولے کہ گھنٹی کا بجنا بیل کے چلنے کی دلیل تو نہیں ہو سکتی، ممکن ہے کہ وہ کھڑا کھڑا سر ہلاتا رہا، تیلی نے کہا مولوی صاحب میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی، آپ جلدی یہاں سے تشریف لے جائیے، کہیں وہ منطق نہ سیکھ لے، پھر ہماری تو مصیبت آ جائے گی۔

معقولیوں کا وہم

یہ غلو فی المعقول کا نتیجہ ہے کہ ان کو مشاہدات و واقعات میں بھی توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر کمال یہ کہ محض توہمات ہی پر ورق کے ورق سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مسئلہ ان کے یہاں مشہور ہے کہ قضیہ موجبہ میں وجود موضوع شرط ہے نہ معلوم اس دعوے کی دلیل کیا ہے۔ محض توہم ہے اور کچھ بھی نہیں مگر اس مسئلہ کو مان کر پھر جو اشکالات وارد کرنے اور ان کے جواب دینے شروع کیے ہیں تو بڑی لمبی بحث ہوگئی ہے۔ اللہ بھلا کرے حمد اللہ کا اس نے اس کو رد کیا ہے اور کہا کہ قضیہ موجبہ کے لیے وجود موضوع کی ضرورت نہیں صرف ربط موضوع بالمحمول کافی ہے اور بہت سے مسائل معقولیہ اسی شان کے ہیں تو میں نے ایسے ہی معقولیوں کا وہم رفع کرنے کے لیے کہا ہے کہ یہاں تخییر پر رد نہیں اور اگر فمن شاء (اب جس کا جی چاہے) سے تخییر ہی مراد ہوا کرے تو ایک مقام پر ارشاد ہے: "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" (اب جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے) کیا اس کو بھی تخییر پر محمول کیا جائے گا ہرگز نہیں بلکہ "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا"

(اب چاہے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لے) میں ترغیب و تسہیل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ مضامین تذکرہ ہیں جن سے خدا کا راستہ آسان ہو گیا ہے اس لیے ہم اعلان عام کرتے ہیں کہ جس کا دل چاہے خدا کے راستہ پر چلے اب کچھ دشواری نہیں' یہ تو آیت کی تفسیر تھی۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت میں گو "ان ھذہ" کا مشار الیہ ظاہراً صرف سورہ دہر کے مضامین ہیں لیکن یہ شان تمام ہی قرآن کی ہے کیونکہ قرآن میں جابجا قرآن کو تذکرہ اور ذکر اور ذکری کہا گیا ہے جس سے خاص مضامین پر اشارہ نہیں ہے بلکہ سارے قرآن کے مضامین پر اشارہ ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ. (یعنی اس میں خیر خواہی ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس قلب سلیم ہے) اور یہاں یقیناً ذالک سے پورا قرآن مراد ہے اور سورہ عبس میں ہے:

كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ.

(ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن نصیحت کی چیز ہے سو جس کا دل چاہے اس کو قبول کر لے وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں' رفیع المکان ہیں' مقدس ہیں جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے کہ وہ مکرم اور نیک ہیں)

یہاں تو یقیناً "انه تذكرة" سے تمام قرآن ہی مراد ہے تو حاصل اس جملہ کا یہ ہوا کہ قرآن (بلکہ تمام شریعت کیونکہ قرآن ساری شریعت کی اصل ہے باقی سب اس کی شرح ہے۔ اسی واسطے بعض حدیث میں قرآن سے مراد مطلق شریعت بھی وارد ہے۔ چنانچہ: "اِقْضِ بَیْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ"[1] (ہمارے لیے کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے) کہنے پر فیصلہ فرمایا گیا جو کہ قرآن میں نہیں ہے۔ غرض قرآن پاک بلکہ سب دین) تذکرہ ہے اور یادداشت ہے کس چیز کی؟ سبیل رب کی کیونکہ آگے اختیار سبیل رب کو اسی صفت تذکرہ پر مرتب کیا گیا ہے' رب سبیل سمجھئے سبیل کہتے ہیں لغت میں راستہ کو اور راستے کی دو قسمیں ہیں ایک لمبا راستہ جس کو سفر کہتے ہیں اور ایک مختصر اور قصیر راستہ اب غور کیجئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قصیر ہے یا طویل؟ ظاہر ہے کہ طویل ہے۔ یہ راستہ قصیر تو ان کے نزدیک ہو گا جو عید بقر کے نمازی

---

[1] (فتح الباری ۱۳: ۲۸۸)

ہوں ورنہ یہ تو ساری عمر کا قصہ ہے کسی دن بھی اس کے طے کرنے سے بس نہیں کر سکتے۔اگر ہزار سال کی بھی عمر ہو جب بھی نماز فرض رہے گی' روزہ فرض رہے گا' زکوٰۃ فرض رہے گی' غرض کسی وقت فرائض سے سبکدوشی نہیں ہو سکتی' گویا عمر بھر اسی راستہ کو طے کرتے ہیں۔

جنم روگ

جیسے ہمارے حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ آپ کا لڑکا کیا پڑھتا ہے' کہا قرآن حفظ کرتا ہے' فرمایا: ارے اس بیچارے کو کیوں جنم روگ لگایا۔ حافظ صاحب میں مزاح بہت تھا' اس لیے گفتگو کے عنوان ایسے ہی ہوا کرتے تھے مگر حقیقت اس کی یہ تھی کہ حفظ قرآن ایک دن کا کام نہیں' عمر بھر کا کام ہے' ساری عمر اسی میں لگا رہے تب تو محفوظ رہتا ہے ورنہ بہت جلد حفظ سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ رجب کا مہینہ آتے ہی حفاظ کو قرآن یاد کرنے کی فکر ہوگی' دور شروع ہو جائے گا۔ پانی پت میں ایک رئیس ہیں وہ سبعہ قرأت کے حافظ ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر سال ایک قاری کی روایت میں تراویح سناتے ہیں مگر کیا مجال کہ دوسری قرأت اس میں اختلاط ہو جائے۔ اگر قالون کی روایت شروع کریں گے تو اخیر تک قالون ہی کی روایت رہے گی ورش کی روایت کا اس میں خلط نہ ہوگا بڑا اچھا حافظ ہے مگر یہ اس کی بدولت ہے کہ ہر سال رجب سے جو وہ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں پھر کسی کام کو نہیں دیکھتے۔

کلابی تقویٰ

اسی طرح ساری شریعت ہے کہ یہ عمر بھر کا کام ہے ایک دو دن کا کام نہیں' نوافل و مستحبات کو تو آدمی ترک کر سکتا ہے مگر فرائض و واجبات اور تلاوت قرآن کی پابندی کرنے سے کچھ نام بھی نہیں ہوتا' مستحبات و نوافل کی پابندی میں نام اور امتیاز زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان دنیا وظائف کو ناغہ نہیں کرتے مگر نماز قرآن کو ناغہ کرتے رہتے ہیں' فرائض و واجبات کو ضائع کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کو نام مقصود ہے راستہ کا طے کرنا مقصود نہیں ورنہ اہم و اقدم کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ (میرٹھ میں ایک رشوت خوار تھے وہ وظیفہ کے تو اتنے پابند تھے کہ اشراق تک وظیفہ پڑھتے اور درمیان میں کسی سے بات نہ کرتے مگر اسی وقت میں اشارات سے رشوت کا معاملہ بھی طے ہوتا رہتا تھا۔ مقدمہ والا اشارہ سے ایک کہتا

یہ انگلی کے اشارہ سے دو کہتے پھر اشارات ہی میں معاملہ طے ہو جاتا۔ سو یہ تقویٰ کلابی کہلاتا ہے کہ وظیفہ میں بات کرنے سے تو اتنا پرہیز اور رشوت سے پرہیز نہیں کتے کی بھی یہی حالت ہے کہ ٹانگ کی تو اتنی احتیاط کرتا ہے کہ اس کو اٹھا کر موتتا ہے تاکہ پیشاب کی چھینٹ نہ پڑ جائے اور منہ کو گوہ میں بھی ڈال دیتا ہے جیسے ایک تیلن سے کسی نے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں ہے وہ چونکہ نئی نئی دلہن تھی جس کے لیے منہ سے بولنا عیب ہے اس نے زبان سے تو کچھ جواب نہ دیا مگر لہنگا اٹھا کر پیشاب کیا اور پیشاب کے اوپر کو پھاند گئی' مطلب یہ تھا کہ دریا پار گیا ہے۔ یہی حالت اہل دنیا کے وظائف کی ہے۔

ہم ہر وقت سفر آخرت میں ہیں

بہر حال خدا کا راستہ قصیر نہیں بلکہ طویل ہے کہ عمر دراز میں بھی طے نہیں ہو سکتا مگر جن کو توفیق دی گئی ہے ان کے لیے قصیر ہو جاتا ہے۔ گو واقع میں طویل ہے جیسے قیامت کے بارے میں ارشاد ہے: "فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ" (کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا) مگر حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو اتنا چھوٹا معلوم ہوگا جیسے ایک نماز کے شروع سے اس کے ختم کرنے تک فاصلہ ہوتا ہے اور اوپر جو حضرت بایزیدؒ کے قصہ میں طریق دین کا قصیر ہونا بیان کیا گیا ہے مراد اس قصر سے سہولت ہے بمقابلہ مشاق دنیا کے۔ اب سمجھئے اور اسی بات کا سمجھانا اس بیان سے مقصود ہے کہ جب خدا کا راستہ طویل ہے اور ہم اس پر چل رہے ہیں تو ہم ہر وقت سفر میں ہوئے اور قرآن اس سفر کی یادداشت ہے جو اس راستہ سے منازل و مقامات سے ہم کو آگاہ کرتا ہے۔ جب ہم سفر میں ہوئے تو بتلایئے کیا سفر میں بھی چین ہوا کرتا ہے۔ مگر افسوس ہم کیسے بے فکر و مطمئن ہیں۔ گویا وطن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اے صاحب جس کو ہر وقت سفر درپیش ہو وہ کیونکر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتا ہے اور جس کے سامنے اتنا لمبا سفر ہو وہ کیونکر دل کھول کے ہنس سکتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

اسی لیے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسی باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے: "كان دائم الفكرة متواصل الاحزان"[1] کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۷: ۱۵۸)

ہمیشہ فکر وسوچ میں اور رنج وغم میں رہتے تھے اور اس فکر وغم ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھل کر ہنستے نہ تھے۔ حدیث میں ہے: "کان جل ضحکھه التبسم" کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا ہنسنا یہ ہوتا کہ تبسم فرمالیتے تھے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حوصلہ تھا کہ ہماری خاطر سے تبسم بھی فرمالیتے تھے ورنہ جس کے سامنے وہ احوال شدیدہ ہوں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف تھے اس کو تو تبسم بھی نہیں ہوسکتا۔ شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا خوف تھا' آپؐ سے تو سب ذنوب کے بخش دیئے جانے کا وعدہ ہو چکا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ بس آپ کے نزدیک جہنم ہی تو ایک خوف کا سبب ہے۔ صاحب اس سے بڑھ کر عظمت حق کا انکشاف خوف کا سبب ہے جس پر عظمت حق کا انکشاف ہو گیا ہے وہ جہنم کو تو تصور میں بھی نہیں لاتا' پھر اس سے آگے ایک اور مقام ہے جس میں باوجود مغفرت ذنوب کے بھی جہنم سے اطمینان نہیں۔ "وھو انکشاف قدرة الحق" (وہ قدرت حق کا منکشف ہونا ہے) اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "لو علمتم مااعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً"[1] یعنی اگر تم وہ باتیں جانتے جو مجھے معلوم ہیں تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا کرتے۔ اس جگہ کم ہنسنے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل نہ ہنستے مگر یہ محاورہ ایسا ہے جیسا اردو میں آپ کہا کرتے ہیں کہ میں ایسا روگ کم پالتا ہوں یعنی نہیں پالتا اور محاورات اکثر تمام زبانوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ بھی یہ استعمال آیا ہے جہاں قلت کے معنی ہو ہی نہیں سکتے' عدم ہی کے معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی: فَقَلِيلاً مَّايُؤْمِنُونَ. (سووہ ایمان نہیں لاتے ہیں)

قرآن کا محاورہ

اس جگہ عام واعظوں کی ایک غلطی یاد آئی وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلاً وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْراً. (پس چاہیے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) واعظین اس کو امر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم واجب کو ترک کرتے ہو۔ قرآن میں تو کثرت بکاء کا امر ہے اور تم بالکل نہیں روتے۔ مگر یہ ان واعظین کی غلطی ہے یہاں معنی امر مراد نہیں

[1] (مسند احمد ۵: ۱۷۳' تفسیر ابن کثیر ۸: ۲۹۵)

بلکہ امر بمعنی خبر ہے جس میں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جس کی دلیل سیاق وسباق ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

وَقَالُوْا لَاتَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ.

(اور کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے) اور اس کے بعد ارشاد ہے: جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے) اور درمیان میں ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلاً وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْراً. (پس چاہیے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکاء سزاء ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہوسکتی ہے جو سزا پانے والے کے اختیار میں نہ ہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اور اگر یہاں معنی انشاء مراد ہوں گے تو ضحک و بکاء مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزاء نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ یہاں معنی انشاء مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اس کے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں اور خبر کو انشاء کی صورت میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اب سر پکڑ کر روؤ تمہاری یہی سزا ہے۔ یعنی اب روؤ گے اور اپنے کئے کی سزا بھگتو گے۔ پس اسی طرح قرآن کا یہ محاورہ ہے جس سے معنی امر مقصود نہیں اور اگر بفرض محال امر ہی مقصود ہوتا تو سیاق وسباق کی وجہ سے مخاطب کفار ہی ہوتے، مسلمانوں کو پھر بھی خطاب نہ ہوتا اس لیے واعظین کا اس سے مسلمانوں کے لیے کثرت بکاء کا مامور بہ ہونا ثابت کرنا غلط ہے۔ یہ بیچ میں استطراداً ایک فائدہ تفسیر یہ بیان کردیا گیا۔

خاصہ بشریہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر جو امور عظام و احوال شدیدہ تھے ان کے ہوتے ہوئے کسی کو ہنسنے کی تاب نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوصلہ تھا کہ آپ اس کے باوجود بھی تبسم فرمالیتے تھے اس پر اگر یہ سوال ہو کہ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبسم بھی کیوں فرماتے تھے اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ہماری خاطر سے تاکہ لوگوں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے اور وہ یوں نہ کہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ہروقت غمگین رہتے ہیں تو ہمارے تو پھر کہاں ٹھکانا ہے' لوگ اس سے مایوس ہو جاتے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ تبسم فرمالیا کرتے۔ دوسرے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضحک و تبسم خاصہ بشریہ ہے کہ ہنسی کی بات پر ہنسی آ ہی جاتی ہے چاہے اندر سے دل پر کیسا ہی غم کا پہاڑ ہو مشہور ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے کیونکہ خاصہ بشریہ ہے تو صاحبو! جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی حالت تھی کہ آپ ہمیشہ فکرمند اور اندوہگیں رہتے تھے تو ہم آخر کس بات پر بےفکر ہیں اور ہم دنیا سے خوش اور مطمئن کیونکر ہو گئے حالانکہ یہ بےفکری بہت سخت حالت ہے۔ حق تعالیٰ ایک مقام پر کفار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا. (کہ وہ دنیا سے خوش اور مطمئن ہو گئے) اس سے معلوم ہوا کہ رضا بالدنیا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس وقت مذموم ہے جبکہ اس کے ساتھ اور بےفکری بھی ہو ورنہ واطماء نوابھا (اور اس سے مطمئن ہو گئے) نہ بڑھایا جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ مذمت میں اس اطمینان کو بھی دخل ہے۔ گویا اطمینان بالدنیا کفر سے کم ہی ہے مگر ایسا کم ہے۔ جیسا آسمان عرش سے کم ہے مگر فی نفسہ تو بہت بڑا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

(آسمان عرش کے مقابلہ میں بیشک نیچا ہے لیکن مٹی کے ٹیلے سے تو کہیں اونچا ہے)

اطمینان بالدنیا بڑا مرض ہے

اسی طرح اطمینان بالدنیا بہت سخت چیز ہے جبھی تو اس کو کفار کی مذمت میں بیان کیا گیا۔ گو کفر سے کم ہو اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک تحقیق لغت کی بھی بیان کردوں کہ آسمان لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے آس اور مان سے آس بمعنی آسیا چکی کو کہتے ہیں اور مان بمعنی مانند ہے تو یہ لفظ اصل میں آسیا مان تھا۔ کثرت استعمال سے تخفیف کر کے آسیا کو آس بنالیا گیا' آسمان ہو گیا۔ گو ہمیں فارسی دانی کا دعویٰ نہیں مگر جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ اس نئی تحقیق کو سن لیں۔ غالباً ان کے بھی خیال میں یہ بات نہ آئی ہو گی۔ پس آسمان کو آسمان اس لیے کہتے ہیں کہ ان اہل لغت کے نزدیک چکی کی طرح اس میں بھی حرکت دوریہ ہے۔ غرض رضا بالدنیا واطمینان بہاء (دنیا سے خوش ہونا اور اس سے مطمئن ہونا) گو بمقابلہ کفر کے

کم ہے مگر فی نفسہ بہت بڑا مرض ہے اس کا علاج کرنا چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے جو اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ انسان یہ تصور پیش نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں ۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت سے بطور دلالت التزام کے یہ بات ثابت ہے کہ انسان سفر میں ہے اور اس کے لوازم سے ہے بے چینی اور عدم اطمینان کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کے لیے غیر منزل کے ساتھ تو اطمینان اور رضا خود موانع سفر سے ہے جو مسافر غیر منزل سے دل لگا لے گا اور اسی میں قیام کر کے بے فکر ہو جائے گا یقیناً منزل پر نہ پہنچ سکے گا۔ ان سب باتوں کو بھی قرآن نے بتلا دیا ہے کہ دنیا سے رضا اور اطمینان نہ ہونا چاہیے۔ پس قرآن سے بدلالت مطابقی ہمارا مسافر ہونا بھی ثابت ہے اور بدلالت التزامی سفر کے لوازم بھی ثابت ہیں اور اس کے موانع بھی بتلا دیئے گئے ہیں۔

منتہائے سفر

اب اس مضمون میں کیا شبہ ہے اور سنئے لوازم سفر سے طریق کا مبداء و منتہا بھی ہے سو مبداء کے بیان کی تو اس لیے ضرورت نہیں کہ وہ تو چلنے والے کے سامنے ہے اور منتہا کا ذکر قرآن میں جابجا آیا ہے۔ چنانچہ بار بار فرماتے ہیں: وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں): وَاِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (تیرے رب کی ہی طرف لوٹنا ہے): وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے) اور ایک مقام پر صاف ارشاد ہے: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (کہ سیدھا راستہ ہی خدا تک پہنچتا ہے اور بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں اور سیدھے راستہ کی توفیق تو اس کو ہوتی ہے جو طالب حق ہو) وَلَوْشَاءَ لَهَدٰاكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ہم سب کو سیدھے راستہ کی طرف جبراً) ہدایت کر دیتے (مگر چونکہ یہ دارالابتلاء ہے اس لیے نہیں کیا جاتا) لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (دین میں جبر نہیں ہے تحقیق ظاہر ہوگئی رشد گمراہی سے) مشہور تفسیر تو یہ ہے: وَعَلَى اللّٰهِ بیان قصد السبیل و منها جائر (سیدھا راستہ ان میں بعض ٹیڑھے بھی ہیں) مگر اس میں مضاف کا حذف ہے جو بلا ضرورت خلاف اصل

ہے اس لیے میرے نزدیک یہاں ''علی بمعنی الی'' ہے جو قرآن میں جابجا آیا ہے۔ چنانچہ:
بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا بمعنی بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا (اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے) آیا ہے اور بھی اس کی نظائر تلاش سے ملیں گی۔ اس صورت میں حذف کی ضرورت نہ ہوگی تو منتہائے سفر بھی قرآن میں مذکور ہے۔

علامات سفر

پھر لوازم سفر سے علامات بھی ہیں، ہر راستہ کی کچھ علامات ہوتی ہیں تو یہاں بھی کچھ علامات ہونا چاہئیں بلکہ یہاں ضرورت زیادہ ہے کیونکہ یہ سبیل محسوس نہیں بلکہ معنوی ہے سو قرآن میں اس راستہ کی علامات بھی مذکور ہیں۔ فرماتے ہیں: وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے) شعائر اللہ وہی علامات ہیں جو خدا کی طرف چلنے کی دلیل ہیں یعنی نماز و روزہ اور حج اور تمام عبادات یہ سب اس راستہ کی علامات ہیں جن پر کسی کو چلتا ہوا دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف چل رہا ہے۔

لوازم سفر

پھر لوازم سفر سے ضیاء (روشنی) بھی ہے کیونکہ راستہ میں تاریکی ہو تو چلنا دشوار ہے۔ سیر فی الطریق (راستہ میں چلنا) رویت طریق (راستہ دیکھنے) پر موقوف ہے اور رویت بدون ضیاء کے نہیں ہو سکتی تو قرآن میں اس راستہ کے لیے بھی ضیاء بھی ثابت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (یعنی یہ قرآن عام لوگوں کے لیے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لیے بڑی رحمت ہے) اس میں لفظ بصائر سے ضیاء پر دلالت ہے۔ ایک دفعہ مجھے اس آیت میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اس جگہ تین چیزیں کیوں بیان کی گئیں۔ "بصائر وھدی ورحمۃ" (بصیرت، ہدایت اور رحمت) پھر سمجھ میں آیا کہ راستہ چلنے میں ایک تو رہبر کی ضرورت ہے وہ تو ھدیٰ ہے پھر رہبر کی عنایت وشفقت کی ضرورت کہ مختصر اور سہل راستہ سے لے جائے وہ رحمت ہے پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ چلنے والا سوانکھا ہو اگر راستہ حسی ہے تو بصر کی

ضرورت ہے اور معنوی ہے تو بصیرت کی ضرورت ہے اس کا ذکر بصائر میں ہے مگر بصائر سے مراد اسباب بصیرت ہیں یعنی ضیاء کیونکہ قرآن کو جو بصیرت فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسباب بصیرت میں سے ہے۔ پس قرآن میں ضیاء معنوی موجود ہے جس میں تامل کرنے سے بصیرت کام کرنے لگتی ہے اور اس کو راستہ نظر آنے لگتا ہے۔ پس اس آیت سے ضیاء بھی ثابت ہوئی اور دوسری آیات میں تو صاف طور پر لفظ نور وارد ہے۔

لَقَدْ جَآءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ. (یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں) غرض قرآن سے سفر اور لوازم سفر سب ثابت ہیں۔

سلوک عمل بالشریعت کا نام ہے

پھر حضرات صوفیہ کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو ان سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ ان کے کلام میں یہ حقیقت نمایاں طور پر مذکور ہے۔ چنانچہ انہوں نے عمل بالشریعۃ کا نام سلوک رکھا ہے جو سفر کے معنی میں ہے اور شریعت پر چلنے والے کو سالک کہتے ہیں اور اعمال کا نام مقامات رکھا جو منازل کے معنی میں ہے۔ شاید کوئی کہے کہ تم کو صوفیہ سے محبت ہے اس لیے خوش اعتقادی کی وجہ سے یوں سمجھ لیا کہ صوفیہ نے قرآن سے اس مضمون کو سمجھ کر یہ نام رکھے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انہوں نے قصداً قرآن سے سمجھ کر یہ نام نہیں رکھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی طبیعت میں سلامتی ایسی تھی کہ ان کی زبان سے وہی بات نکلی جو خدا تعالیٰ نے قرآن میں بتلائی ہے مگر جب صوفیاء کے کلام میں مضمون جابجا پوری صراحت سے مذکور ہے تو ہم کیوں نہ کہیں کہ انہوں نے حقیقت کو قرآن سے سمجھ کر یہ نام رکھے ہیں۔ چنانچہ عارف فرماتے ہیں:

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم   جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

(منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

اسباب سفر

اس میں تو صاف سفر کے معنی پر دلالت ہے کہ مجھ کو محبوب کا راستہ طے کرنے میں کسی منزل پر چین کیونکر آئے جبکہ ہر مقام پر جرس یہ کہتا ہے کہ اسباب باندھو اور آگے چلو، جرس سے مراد شیوخ کا ارشاد ہے کہ وہ کسی مقام پر توقف کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ہر مقام سے آگے بڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہیست ہر چہ بروئے میرسی بروئے مایست

(بھائی لاانتہا درگاہ ہے جس مقام پر پہنچو وہاں مت ٹھہرو اس سے آگے بڑھو) گو بعض دفعہ توقف کی بھی اجازت ہے جس کی حقیقت آگے بیان کروں گا۔ اگر یاد رہا اور خدا کرے یاد رہے یا شوق قلب مراد ہے کہ کسی مقام پر شوق کو سکون نہیں کیونکہ منزل مقصود اس سے بھی آگے ہے، شوق کو سکون تو وصال تام کے بعد ہوگا جو جنت میں حاصل ہوگا اور یہاں تو ہر منزل پر وصال ناقص ہے۔ گو پہلی منزل کے اعتبار سے کامل ہے، غرض شوق کو یا ارشاد شیوخ کو جرس سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ لشکر کے کوچ کے وقت پہلے گھنٹی بجا کرتی تھی اب بھی اسٹیشن پر بجا کرتی ہے اور آج کل لشکر کے کوچ کے وقت بگل بجایا جاتا ہے مگر طبعاً جرس سے بہ نسبت بگل کے ایک گونہ الفت سی معلوم ہوتی ہے۔ شاید کوئی کہے کہ یہ مولویت کا غلبہ ہے۔ سوالحمدللہ تم نے فضیلت کا خود اقرار کرلیا۔ "**والفضل ماشهدت به الاعداء**" (بزرگی وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں) ہم تو اس پر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو پرانی چیزوں سے الفت ہے جن سے سلف کو الفت تھی اور نئی چیزوں سے وحشت ہے۔ چنانچہ چراغ کی روشنی سے مجھے زیادہ فرحت ہوتی ہے۔ خصوصاً شمع کی روشنی تو بہت ہی دلفریب ہے اور برقی روشنی سے تو نگاہ کو خیرگی دل کو تیرگی ہوتی ہے۔ یہ محض قافیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ غرض عارف نے اس جگہ سلوک کو بالکل سفر کی شکل میں بیان فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

کس ندانست کہ منزل گہ آں یار کجاست ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

(کسی شخص نے نہ جانا کہ محبوب کا ٹھکانہ کہاں ہے بس اتنا ہی ہے کوچ کے گھنٹہ کی آواز ہوتی ہے)

یہاں بھی اس کو سفر کی صورت میں بیان فرماتے ہیں منزل گہ سفر ہی کے مناسب ہے اور جرس کا سفر کے مناسب ہونا پہلے معلوم ہو چکا۔ بعض لوگوں نے جرس سے بنا بر غلو شغل انحد

کی صورت مراد لی ہے جو کبھی بشکل جرس مسموع ہوتی ہے اور اس کو ملکوتی آواز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ شغل انحد کی آواز کوئی غیبی آواز نہیں بلکہ محض ہوا متموج فی الصماخ کی صورت ہے۔ کان کے پردہ میں جو ہوا ہے جب کان بند کر لیے جاتے ہیں تو اس میں تموج پیدا ہو کر قسم قسم کی آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ شغل سلف میں نہ تھا بلکہ صوفیاء نے ہندوستان کے اہل ریاضت سے اس کو لیا ہے۔ اس شغل کو یکسوئی پیدا کرنے میں بہت اچھا دخل ہے اور طریق میں یکسوئی کی حاجت ہوتی ہے اس لیے متاخرین نے یہ شغل اختیار کر لیا ہے اس لیے حافظ کے کلام میں جرس سے یہ صورت مراد ہرگز نہیں اس وقت یہ معروف نہ تھا بلکہ مراد وہی شوق قلب ہے یا ارشاد و شیوخ مطلب یہ ہے کہ کسی کو محبوب کا اصلی مقام معلوم نہیں بس اتنی بات ہے کہ شوق یوں کہتا رہتا ہے کہ اور آگے چلو اور آگے چلو یا شیوخ ہر مقام پر یوں فرماتے ہیں کہ محبوب آگے ہے بڑھے چلو۔ اس میں بھی سفر کے معنی ظاہر ہیں اور مولانا فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید — خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ گو عالم میں کوئی رخنہ نہیں معلوم ہوتا جس سے منزل محبوب کا پتہ لگے بلکہ راستے سب بند نظر آتے ہیں مگر تم کو یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش کرنا چاہیے تم دوڑنا شروع کرو راستہ خود بخود نکلتا چلا آئے گا۔ اس کی نظیر ایسی ہے جیسے کسی سڑک پر دوطرفہ درخت کثرت سے ہوں تو دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے' دونوں طرف کے درخت ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناواقف یوں کہتا ہے کہ آگے راستہ نہیں مگر محقق کہتا ہے کہ تم چلے چلو راستہ ہے۔ یہ درخت دور ہی سے ملے جلے نظر آتے ہیں تم آگے چلو راستہ خود بخود نکلتا آئے گا۔ اب اگر یہ ناواقف مقلد ہے تو یوں کہے گا:

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزاء
دل افگندیم بسم اللہ مجریها و مرسها

(اس دریائے ناپیدہ کنار اور طلاطم اٹھانے والے طوفان میں کشتی دل ہم نے ڈال دی ہے اب اللہ ہی کے نام پر ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا)

اور اگر غیر مقلد ہے تو اپنی نظر قاصر پر اعتماد کر کے رک جائے گا اور مقصود سے رہ جائے

گا مگر یہ اس کی حماقت ہے وہ محقق کے قول پر کیوں نہیں چلتا جو یوں کہتا ہے:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے)

اگر وہ یہ کہے صاحب مجھے تو آگے درخت ملے ہوئے نظر آ رہے ہیں اگر دوڑوں گا تو اندیشہ ہے کہ درختوں سے ٹکرا کر سر پھوٹ جائے گا تو میں کہتا ہوں پھر کیا مضائقہ ہے۔ محبوب کے راستہ میں ایک سر کیا ہزار سر بھی پھوٹ جائیں تو تھوڑے ہیں اور اگر جان بھی جاتی رہے تو عین سعادت ہے۔ ایک طالب سے شیخ نے اس کی ناکامی کی شکایت پر تنگ ہو کر فرمایا تھا کہ پھر میں کیا کروں جا اپنا سر پھوڑے اس نے سچ مچ اپنا سر پھوڑ لیا۔ عاشق کی یہی شان ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ عاشق نواز ہیں فوراً شیخ پر بذریعہ الہام کے عتاب فرمایا کہ کیا حرکت ہے تم ہمارے طالبوں کے سر پھوڑواتے ہو۔ پس اب تو سر پھوٹنے کا بھی خوف نہ کرو جب وہ دوسروں سے بھی سر پھڑوانا گوارا نہیں کرتے تو خود تمہارا سر کیوں پھوڑیں گے تم دوڑنا تو شروع کرو ان شاء اللہ راستہ کھلتا چلا جائے گا۔ بہرحال مولانا نے بھی اسی شعر میں سلوک کو سفر ہی بتلایا ہے۔

مقامات ومنازل سلوک

عارف شیرازی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

تو دستگیر شوائے خضر بے خجستہ کہ من پیادہ می روم و ہمرہاں سوار انند

(اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں)

مرشد سے کہتے ہیں کہ آپ دستگیری کیجئے کیونکہ میں تو مقامات ومنازل کو پیادہ طے کر رہا ہوں اور ہمراہی سوار ہو کر طے کر رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اس میں بھی بالکل سفر ہی کا نقشہ بیان فرمایا ہے۔ سوار اور پیادہ سفر ہی کے لوازم سے ہیں تو صوفیاء کے کلام سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ انسان ہر وقت سفر میں ہے کسی وقت اس کو توقف نہیں، روزانہ کسی مقام کو طے کرنے میں مشغول ہے مگر مقامات سے مراد اعمال باطنیہ ہیں یعنی خوف ورجا محبت وانس، توکل ورضا، شکر وصبر تواضع وغیرہ اور لاہوت وملکوت و

ناسوت یہ مقامات سلوک نہیں ہیں اور بعضوں نے ایک اور قافیہ نکالا ہے ہاہوت نہ معلوم یہ لغت بھی ہے یا نہیں۔ بہت سے ان کو مقامات سلوک سمجھتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ مراتب موجود ہیں ان کو اختیار سے کون طے کرتا ہے کوئی نہیں' ہاہوت درجہ ذات حق ہے اگر یہ لغت صحیح ہو اور لاہوت اجمال صفات ہے اور جبروت مرتبہ تفصیل صفات ہے اور ملکوت عالم ملائکہ ہے اور ناسوت عالم انسان ہے تو ہاہوت ولاہوت وجبروت کا طے کرنا تو انسان سے محال ہے' ذات وصفات حق کے مراتب کو کون طے کر سکتا ہے کہ امکان کا انقلاب وجوب کی طرف لازم آتا ہے اور ناسوت کے طے کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس میں تو آپ موجود ہی ہیں اور ملکوت میں پہنچنا ممکن تو ہے مگر اختیاری نہیں' بعد موت کے خود بخود ہر شخص وہاں پہنچ جائے گا۔ حتیٰ کہ کافر بھی پہنچ جائے گا جہاں اس کی مارکوٹ ہوگی وہ تو ملکوت سے پناہ مانگے گا۔ تو یہ مقامات سلوک نہیں ہیں بلکہ مقامات سلوک وہی اعمال باطنیہ ہیں جن کی تحصیل کا شریعت نے امر کیا ہے اور ہر مسلمان خصوصاً سالک ہمیشہ ان کے طے کرنے میں مشغول ہے کسی وقت توقف نہیں ہوتا' یہ دنیا کا سفر نہیں کہ ایک حد پر ختم ہو جائے بلکہ اس سفر کی کہیں انتہا نہیں۔ ہر دن جو عمل آپ کرتے ہیں اس سے نیا راستہ طے ہوتا ہے آج جو آپ نے نماز پڑھی ہے اس سے بھی کچھ راستہ طے ہوا ہے اور اس کے بعد جو نماز پڑھو گے اس سے بھی راستہ طے ہوگا اور جتنی دفعہ ذکر اللہ کرتے ہو ہر دفعہ میں کچھ راستہ طے ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح روزانہ ہر ساعت میں آپ اس راستہ کو قطع کر رہے ہیں۔ ہاں ان مقامات میں بعض دفعہ کچھ توقف بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں نے اوپر کہا تھا اب میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس طریق میں ایسا توقف تو کبھی نہیں ہوتا جیسا سفر دنیا میں اسٹیشن یا منزل پر سفر دنیا میں ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے سیر بالکل منقطع ہو جاتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں ہر دم سیر ہی سیر ہے کبھی سیری نہیں ہوتی۔ البتہ بعض دفعہ اگلے مقامات کے اعتبار سے کسی مقام پر ظنا توقف معلوم ہوتا ہے کہ سالک اپنے کو متوقف سمجھنے لگتا ہے حالانکہ واقع میں وہ سائر ہے اور اس کی نظیر سفر دنیا میں امریکہ کا ایک واقعہ سنا گیا ہے۔ ایک دوست نے بیان کیا ہے کہ امریکہ میں اسٹیشن پر ریل ٹھہرتی نہیں کیونکہ اس توقف کو وہ لوگ اضاعت وقت سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہر اسٹیشن پر ۱۵ منٹ یا آدھ گھنٹہ ضائع ہوتا ہے وہاں یہ صورت ہے

کہ ہر اسٹیشن پر ایک لکڑی کا اسٹیشن متحرک بنا ہوا ہے اس میں پھٹے بھی لگے ہوئے ہیں جب ریل کے آنے کا وقت ہوتا ہے سب لوگ اس لکڑی کے اسٹیشن پر آ جاتے ہیں اور جس وقت ریل آتی ہے یہ لکڑی کا اسٹیشن کسی حلقہ کے ذریعے سے ریل کے ساتھ مرتبط ہو جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جدا لائن پر چلتا رہتا ہے۔ جب مسافر سوار ہو جاتے ہیں اس وقت ریل کے حلقہ سے اس کا حلقہ الگ کر دیا جاتا ہے ریل آگے چلی جاتی ہے اور یہ اسٹیشن پیچھے رہ جاتا ہے پھر اسٹیشن کے ملازم اس کو بدستور اپنی جگہ پر لے آتے ہیں تو جس وقت ریل سامنے سے آتی ہے اور یہ لکڑی کا اسٹیشن اس کے ساتھ مرتبط ہوتا ہے ریل کے بیٹھنے والے اس وقت یہ سمجھتے ہیں کہ ریل ٹھہر گئی جیسا کہ یہاں جب دو ریلیں ایک رفتار سے ایک سمت کو ساتھ ساتھ چلتی ہیں تو ہر ایک کے مسافر یہ سمجھتے ہیں کہ گاڑی ٹھہری ہوئی ہے حالانکہ دونوں چل رہی ہیں مگر راکب کو اس وقت توقف کا وہم ہوتا ہے۔

غلطی کا منشاء

اسی طرح طریق باطن میں سالک کو کبھی توقف کا وہم ہوتا ہے مگر وہ توقف نہیں ہوتا واقع میں یہ چل رہا ہے لیکن اس کو اپنی سیر کا احساس نہیں ہے اور غلطی کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ترقی کے کچھ آثار غیر لازمہ ہیں، سالک ناواقفی سے ان کو آثار لازمہ سمجھ کر ان کے انتفاء سے ترقی کے انتفاء پر استدلال کرتا ہے۔ پس حقیقی توقف اس سفر میں کبھی نہیں ہوتا اور کسی کو نہیں ہوتا سب برابر مشغول سیر ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ:

سیر زاہد ہر دمے یکسالہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

(زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور عارف ذرا سی دیر میں تخت شاہ تک پہنچ جاتا ہے اور تخت شاہ پر پہنچ کر بھی سیر ختم نہیں ہوتی) اور حصول نسبت جس کو اصطلاح میں تکمیل کہتے ہیں اس کو تکمیل کہنا ایسا ہے جیسے طلباء کی دستار بندی کو تکمیل کہتے ہیں، کیا دستار بندی کے بعد سیر علمی ختم ہو جاتی ہے، ہرگز نہیں بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ سیر شروع ہوتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ راستہ تو ابھی کھلا ہے اور صحیح سیر تو اب ہوگی۔ اے نو آموز طالب علمو! یہ مت سمجھنا کہ دستار بندی اور سند ملنے کے بعد بس کام ختم ہو گیا بلکہ اصلی کام کا وقت تو اس کے بعد آئے گا۔

آپ کمسن ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

مگر جتنی محنت اس وقت کرلو گے اتنی ہی سرعت سیر بعد تکمیل کے نصیب ہوگی۔ پس سمجھ کر کتابیں پڑھو اور ان کو انسان بن کر اپنے اوپر لادو۔ "کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا" (مثل گدھے کے کہ لادتا ہے کتابوں کو) کا مصداق نہ بنو۔ اسی طرح تخت شاہ پر سالک کا پہنچنا اصطلاحی تکمیل ہے حقیقی تکمیل نہیں بلکہ اب تو اصلی سلوک شروع ہوتا ہے اور سیر کا راستہ اسی وقت کھلتا ہے یہاں حقیقی تکمیل کہاں کیونکہ اس راستہ کی انتہا ہی نہیں جو کسی حد پر حقیقی تکمیل ہو جائے۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا　　　که میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا اس لیے کہ مثل انگور کے کاٹنے سے خود بخود بڑھتا ہے)

اور مولانا فرماتے ہیں:

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　ہر چہ بروے می رسی بروئے مایست

(بھائی! محبوب کی درگاہ کی انتہا نہیں ہے جس مقام پر پہنچو مت ٹھہرو آگے چلو)

عارف کو فنائے تام حاصل ہو جاتا ہے

اور یہاں سے ایک شبہ حل ہوگیا وہ یہ کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے اپنے مکتوبات میں جابجا قسم کھا کر یہ فرمایا ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں واللہ مجھے کچھ نہیں آتا، محض احباب کا حسن ظن ہے جو میرے ساتھ ہے۔ اس کلام سے ایک مطلب تو معاندین نے نکالا وہ کہنے لگے کہ وہ واقعی ہم بھی مولانا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جب وہ خود قسم کھا کر اپنی نا قابلیت کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ان کی قسم کو سچا کیسے نہ مانیں وہ جھوٹی قسم تھوڑا ہی کھا سکتے ہیں۔ واہ رے کوڑ مغز بلکہ کوڑ مغز کا بچہ اور یہ بچہ کہنا ایسا ہے جیسے محاورہ میں کہا کرتے ہیں، سور کا بچہ سور نہیں کہتے بلکہ سور کا بچہ کہتے ہیں، یہ اس سے ابلغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا سور ہونا ایسا کامل صفت ہے کہ نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔ اس سے باپ کو گالی دینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کی صفت اس کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تو پورا سور ہے ایسے ہی میں نے کوڑ مغز کا

بچہ کہنے سے کمال وصف کا قصد کیا ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(جب حقیقت کا پتہ نہ چلا بے تکی ہانکنے لگا) اور حقیقی مطلب نے بعض خواص کو بھی چکر میں ڈال دیا کہ وہ بھی اصل مراد تک نہ پہنچے۔ چنانچہ ایک شیخ بھی مولانا کے اس کلام کی وجہ سے تردد وخلجان میں مبتلا تھے' مجھ سے کہنے لگے کہ حضرت نے یہ بات قسم کھا کر کیسے فرمائی۔ حالانکہ ہمارے نزدیک تو حضرت میں ہزار ہا کمالات اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اب ہم اپنے اعتقاد کی تغلیط کریں تو مشاہدہ کی تغلیط ہے اور اس کی تصدیق کریں تو حضرت کی قسم جھوٹی ہوئی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ نہ آپ اپنے مشاہدہ اور علم کی تکذیب کیجئے اور نہ حضرت کی قسم پر شبہ کیجئے' بات یہ ہے کہ جن کمالات کی بنا پر آپ حضرت کے معتقد ہیں' حضرت کی نظر ان کمالات پر نہیں ہے بلکہ ان سے آگے ہے وہ کمالات مستقبلہ متوقعہ کے اعتبار سے قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں اور جن کمالات کو مولانا میں ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں یعنی کمالات واقعہ مولانا ان کی نفی نہیں فرما رہے (اور نہ ان کا اثبات فرماتے ہیں بلکہ ان پر حضرت کی نظر ہے نہیں کیونکہ عارف کی نظر اپنے کمالات پر نہیں ہوا کرتی اور اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو محض ان کو عطائے حق سمجھ کر ہوتی ہے اس وقت بھی مولانا کی قسم سچی ہے کہ واللہ میں کچھ نہیں ہوں کسی قابل نہیں ہوں یعنی جو کچھ میرے پاس ہو سب عطاء و فضل حق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب عارف کو فناء تام حاصل ہو جاتا ہے اس وقت اپنے کمالات پر تو نظر کیا ہوتی اپنے وجود پر بھی نظر نہیں رہتی بلکہ وہ تو یوں کہتا ہے۔ "**وجودک ذنب لایقاس به ذنب**" (تیرا وجود ہی گناہ ہے اس پر کسی گناہ کو قیاس نہ کیا جائے گا) اب جو شخص اپنے وجود کو بھی ذنب سمجھے وہ کمالات کو اپنے لیے کیونکر ثابت کرے گا وہ تو بجز محبوب کے سب کی نفی کرے گا اپنی بھی اور اپنے کمالات کی بھی اور اس کا قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں کسی قابل نہیں کچھ نہیں ایسا ہوگا جیسے ذرہ آفتاب کو دیکھ کر یہ کہے واللہ میں کچھ نہیں یا "قل ھواللہ" کا حافظ سبعہ قرآن کے حافظ کے سامنے یہ کہے کہ واللہ میں حافظ نہیں ہوں' پس حضرت کا قسم کھا کر یہ کہنا غلط نہیں کیونکہ ان پر جس درجہ انکشاف وجود حق وکمالات حق ہے اس درجہ میں ہر شخص یونہی قسم کھا کر اپنے کمالات کی نفی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ (مگر جاننے والا جانتا ہے کہ یہی خود بہت بڑا کمال ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچ گئے واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ (جامع)

تحدث بالنعمت

یہ تو ایک عارف کا کلام تھا جس کی میں نے یہ شرح کی اور الحمدللہ مجھے سب اہل اللہ کے کلام کا فہم عطا ہوا ہے میں مجذوبوں کے کلام کو سمجھ لیتا ہوں۔ چنانچہ ایک مجذوب وحشی کہتا ہے:

بیزارم ازیں کہنہ خدائے کہ تو داری
ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(اس کہنہ خدا سے جو تو کہتا ہے میں بیزار ہوں ہر روز میرا تازہ خدا اور ہے) کچھ ان کو بھی گالیاں کھانے ہی کا شوق ہے۔ ظاہر میں یہ کلام سخت وحشت ناک ہے مگر مطلب سننے کے بعد وحشت نہ رہے گی۔ بات یہ ہے حق تعالیٰ کی کنہ کا علم تو محال ہے اسی لیے تصور بالکنہ کسی کو نہیں ہو سکتا جس کو بھی ہوتا ہے تصور بالوجہ ہوتا ہے اور تصور بالوجہ سے چارہ نہیں کیونکہ غائب کے ساتھ ارتباط قلب بدون کسی واسطہ اور وجہ کے نہیں ہو سکتا مگر جتنے وجوہ سے بھی تصور ہوتا ہے وہ وجہ ذات حق نہیں اللہ تعالیٰ اس سے منزہ اور وراء الوراء ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اے بروں از وہم وقال وقیل من
خاک برفرق من و تمثیل من

(اے اللہ آپ میرے وہم وخیال اور قیل وقال سے پاک ہیں، میرے سر وتمثیل پر خاک پڑے) اس میں تو اللہ تعالیٰ کا تمام تمثیلات سے منزہ ہونا بیان کیا ہے اس کے بعد تمثیلات بیان کرنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔

بندہ نشکیبد زتصویر خوشت
ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

کہ عاشق کو بدون کسی تصور کے چین نہیں آتا اس لیے وہ آپ کے واسطے اچھی سے اچھی تمثیل بیان کر کے اپنی تسلیم کرتا ہے اور اس میں بعض دفعہ وہ حد سے بھی بہت آگے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ

گہ ترا گوید زمستی بوالحسن
یا صغیر السن یا رطب البدن

(کبھی تجھ کو مستی سے بوالحسن یا کمسن یا رطب البدن سے تشبیہ دیتا ہے) مستی کی قید بڑھا کر بتلا دیا کہ ایسی مثال بیان کرنا اور حق تعالیٰ کو صغیر السن وغیرہ کہنا جو بعض مجذوبوں کے کلام میں ہے محض مستی کا اثر ہے ورنہ واقع میں محبوب اس سے منزہ ہے اور بعض صوفیاء کے کلام میں دریا اور ہوا کی تشبیہ وارد ہے وہ بھی محض تسلی اور تفہیم کے لیے ہے ورنہ ذات حق اس

سے بھی منزہ ہے بہرحال یہ تو معلوم ہوگیا کہ جس کو بھی تصور حق ہوتا ہے بالکنہ نہیں ہوتا بلکہ وجہ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن عارفین اور غیر عارفین میں اتنا فرق ہے کہ غیر عارفین کو تو عمر بھر ایک ہی وجہ سے تصور ہوتا ہے اور عارفین کو ہر دن نئے طریقہ سے نئی وجہ سے تصور ہوتا ہے کیونکہ ان پر تجلیات کا ورود ہے ہر دن نئی تجلی ہوتی ہے۔ پس اس شعر میں اس مضمون کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اے زاہد تجھ کو جس وجہ سے تصور حق ہوتا ہے وہ وجہ کہنہ ہے میں اس سے بیزار ہوں مجھ کو تو حق تعالیٰ کا تصور ہر دن نئی وجہ سے ہوتا ہے یعنی میں روزانہ ترقی میں ہوں اور تو ایک ہی وجہ پر ٹھہرا ہوا ہے مگر کلام میں توحش اس لیے ہوگیا کہ اس نے وجہ تصور کو خدا سے تعبیر کیا ہے۔ زاہد کی وجہ کو کہنہ خدا کہہ دیا اور اپنی وجوہ متجددہ کو تازہ خدا کہہ دیا مگر مطلب معلوم ہو جانے کے بعد کچھ اشکال نہیں کیونکہ مجاز کا استعمال منکر نہیں۔ یہ گفتگو درمیان میں آ گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس راستہ کی انتہا چونکہ نہیں ہے اس لیے کسی حد پر تکمیل حقیقی نہیں ہو سکتی اور جس کو تکمیل کہا جاتا ہے اس سے تو سیر کا فتح یاب ہونا ہے کہ اب تک تو قاعدہ بغدادی پڑھ رہے تھے اس تکمیل کے بعد قائمہ بغدادی شروع ہوتا ہے یعنی پہلے تو بیٹھ بیٹھ کر چل رہے تھے اب کھڑے کھڑے چلنا ہوگا' تکمیل درسی تو دو چار سال میں ہو جائے گی مگر تکمیل حقیقی تو درسی ہوگی جس کے معنی تیس سال میں اور یہ بھی حصر کے لیے نہیں بلکہ کثرت مراد ہے یعنی عمر دراز میں بھی نہ ہوگی۔ غرض نصوص سے اور اقوال صوفیاء سے ہمارا ہر وقت سفر میں ہونا وضاحت کے ساتھ ثابت ہے اس وقت ایک اور آیت یاد آئی۔ ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: "اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ." کہ میں اپنے رب کی طرف چل رہا ہوں اس میں بھی سفر کے معنی ثابت ہیں اور حدیث[1] نے تو مطلع بالکل صاف کر دیا۔ "کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرِیْ سَبِیْلٍ." کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر سرائے میں ہوتا ہے یا راستہ چلنے والا راستہ میں ہوتا ہے۔ اب تو ہمارا ہر دم سفر میں ہونا بالکل واضح ہوگیا' کوئی بات مخفی ہی نہ رہی۔ اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ یہ راستہ ہے تو سفر کا اور طویل راستہ ہے مگر حق تعالیٰ اس میں بندہ کی کیسی اعانت فرماتے اور اس کے حال پر کیسی عنایت فرماتے ہیں۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۷۴)

جذب کی حقیقت

صوفیاء نے لکھا ہے کہ سلوک ایک خاص مقام تک ہوتا ہے اس کے بعد جذب ہوتا ہے (جذب کی حقیقت میں آگے بتلاؤں گا) اس کے بغیر کام نہیں چلتا جو لوگ گمراہ ہوئے ہیں وہ وہی تھے جو سالک محض تھے مجذوب نہ تھے جیسے ابلیس و بلعم باعورو غیرہ جذب کے بعد کوئی گمراہ نہیں ہوتا۔ الفانی لا یرد کے یہی معنی ہیں۔ اب جذب کی حقیقت سنئے' جذب کے معنی ہیں لغت میں کشش کرنا' کھینچنا اور اصطلاح میں جذب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اس سے محبت ہو جائے جس کی علامت یہ ہے کہ سالک پر داعیہ اضطرار یہ غالب ہو جائے اور اس سے کوئی واصل خالی نہیں ہوتا خواہ نقشبندی ہو یا چشتی۔ البتہ اکثر نقشبندیہ پر جذب کے آثار بادی النظر میں کم ظاہر ہوتے ہیں مگر اس دولت سے وہ بھی مشرف ہوتے ہیں۔ اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں:

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند   کہ برنداز رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندیہ عجیب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے سالکین کو خدا رسیدہ بنا دیتے ہیں) اور حضرت شیفتہ ذکر خفی کی نسبت فرماتے ہیں:

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن   درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(یعنی وہ اس طرح سالک کو لیجاتے ہیں کہ دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی مگر جذب سے وہ بھی خالی نہیں ہوتے مگر یہ مت سمجھنا کہ راہ مخفی سے لیجانا نقشبندیہ ہی کے ساتھ مختص ہے بلکہ چشتیہ بھی بعضوں کو اسی طرح پہنچاتے ہیں۔)

چشتیہ اور نقشبندیہ کا فرق

یہ چشتیت اور نقشبندیت محض الوان طریق کا نام ہے کہ چشتیہ کا لون یہ ہے کہ وہ اول تخلیہ کرتے ہیں پھر تجلیہ اور نقشبندیہ کا لون یہ ہے کہ وہ اول تحلیہ کرتے ہیں پھر تجلیہ اور یہ بھی متقدمین کا مذاق تھا اب تو دونوں طریق کے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ تخلیہ اور تجلیہ ساتھ ساتھ کرنا چاہیے۔ اب ہر محقق چشتی بھی ہے اور نقشبندی بھی لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ باوجود دونوں کو جمع کرنے کے چشتیہ تخلیہ کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور نقشبندیہ تحلیہ کا اور اس فرق مذاق کی وجہ سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ جس طالب کو جس لون سے مناسبت ہوتی تھی مشائخ اس

کو ایک دوسرے کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ نقشبندیہ اپنے بعض مریدوں کو چشتیہ کے یہاں بھیج دیتے اور چشتیہ بعض طالبوں کو نقشبندیہ کے یہاں بھیج دیتے لیکن آج کل تو ہڑبونگ ہورہا ہے کہ اکثر مشائخ سب کو ایک ہی کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں باقی جو محقق ہیں وہ اب بھی طالب کو اس کی مناسبت کے موافق مشورہ دیتے ہیں۔ مولوی محمد منیر صاحب نانوتوی نے ہمارے حضرت حاجی صاحب سے پوچھا کہ حضرت میرے لیے خاندان چشتیہ میں بیعت ہونا مناسب ہے یا نقشبندیہ میں حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم ہمارے ایک سوال کا جواب دیدو پھر بتلائیں گے۔ ایک شخص ایسی زمین میں جس کے اندر جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے ہیں تخم پاشی کرنا چاہتا ہے تو بتلاؤ تمہاری رائے میں اس کو پہلے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے بعد میں تخم پاشی کرنا چاہیے یا اول تخم پاشی کردے پھر رفتہ رفتہ جھاڑوں کو بھی صاف کرتا رہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میرے نزدیک تو اسے اول تخم پاشی کردینا چاہیے تاکہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہوجائے ایسا نہ ہو کہ جھاڑوں کے صاف کرنے ہی میں عمر ختم ہوجائے۔ حضرت نے فرمایا کہ بس تم نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہوجاؤ تم کو انہی کے مذاق سے مناسبت ہے۔ سبحان اللہ حضرت نے دقیق مذاق کو کتنی سہل مثال سے حل فرمایا' پھر طالب کے مذاق کی کیسی رعایت فرمائی کہ صاف کہہ دیا کہ تم نقشبندیہ سے بیعت ہوجاؤ یہ نہیں کہ سب کو اپنے ہی یہاں بھرتی کرنے کی فکر کریں' جیسا آج کل اکثر ہورہا ہے۔ غرض چشتیت اور نقشبندیت کی حقیقت یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ کے بارے میں ان کا مذاق مختلف ہے یہ فرق نہیں جیسا کہ آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چشتیہ کے یہاں ذکر جہر ہے اور نقشبندیہ کے یہاں ذکر خفی۔ یہ تو ہر شیخ طالب کی طبیعت کے مناسب تجویز کرتا ہے خواہ چشتی ہو یا نقشبندی ہو۔ بہر حال جذب سے نقشبندیہ بھی خالی نہیں ہیں اور چشتیہ کا جذب تو مشہور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بدون جذب کے وصول نہیں ہوسکتا اور بدون وصول کے رجعت سے اطمینان نہیں ہوسکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجذوب خود بھی مطمئن ہوجائے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقع میں اس پر رجعت کا خطرہ نہیں رہتا مگر خود کوئی مطمئن نہیں سالک نہ مجذوب بلکہ ہر شخص لرزاں و ترساں ہے۔ مجذوب اس واسطے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ جذب کا اس کو یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ بعض دفعہ سلوک بصورت جذب نہیں ہوتا ہے جیسا کہ بعض جذب بصورت سلوک ہوتا ہے۔ نقشبندیہ کا جذب اکثر بصورت سلوک ہی ہوتا ہے اسی واسطے ناواقف اس

کے جذب کو نہیں پہچانتا اور ان کو اس سے خالی سمجھتا ہے کیونکہ ان پر اس کے آثار ظاہر نہیں ہوتے لیکن وطن ان کا معمولی ہے۔ فرماتے ہیں:

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو | کہ بنی خندہ برلب ہاؤ آتش پارہ در دل ہا

(اے افسردہ دل زاہد ایک دن رندوں کی مجلس میں جا کر دیکھ کہ دل میں آگ لگی ہوتی ہے اور لب پر ہنسی چھا رہی ہے) اور چشتیہ کا سلوک اکثر بصورت جذب ہوتا ہے جس سے ناواقف ان کو ابتداء ہی سے مجذوب سمجھنے لگتا ہے یہ بھی غلطی ہے تو معلوم ہوا کہ حقیقی جذب کی پہچان دشوار ہے ظاہری علامات اس کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہیں۔ جذب کبھی شورش کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی سکون کے ساتھ لطیف ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق معشوقان نہان ست دستیز | عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر

(محبوبوں کا عشق پوشیدہ ہے عاشق کا عشق علانیہ ہوتا ہے)

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند | عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

(لیکن عاشقوں کا عشق ان کو دبلا و لاغر کرتا ہے۔ معشوقوں کا عشق ان کو موٹا تازہ کرتا ہے)

عشق کی شان

جو شان عشق محبوب کی ہوتی ہے کہ اس میں شورش و اضطراب نہیں ہوتا کبھی عاشق کا عشق بھی ایسی شان کا ہوتا ہے اور کمال کے بعد تو عشاق کے عشق کی اکثر یہی کیفیت ہو جاتی ہے اسی لیے کاملین کی محبت و عشق کا لوگوں کو پتہ نہیں چلتا، بعض لوگ اس کے سکون کو دیکھ کر کہتے ہیں ان کو محبت کی ہوا بھی نہیں لگی حالانکہ ان کو تو ایسی ہوا لگی ہے کہ کرہ ہوا سے پار ہو کر کرہ نار میں پہنچ کر اس سے بھی آگے نکل گئے، اب وہ ہنس رہے ہیں اور معترض سے کہتے ہیں:

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست | حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خو رند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کا حال کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے) لوگ ان کو ہنستا ہوا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ان کو محبت و عشق کا چرکہ نہیں لگا مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ وہ کتنی بلائیں اور مصیبتیں جھیل کر آج اس قابل ہوئے ہیں کہ وصال محبوب سے مسرور ہو کر ہنسیں اور آج سے پہلے ان کی بھی یہ حالت تھی کہ یوں کہہ رہے تھے۔

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں ہائل　　کجا دانند حال سبکساران ساحلہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور بھنور میں کشتی آ گئی ہو تو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں اور دریا میں قدم نہ رکھا ہو)

میں اس شرح میں کہا کرتا ہوں کہ حافظ کی مراد ساحلہا سے ادھر کا ساحل ہے یعنی خوض دریا سے قبل کا ادھر کا ساحل نہیں یعنی عبور دریا کے بعد کا کیونکہ مبتلائے موج دریا کے حال سے بے خبر وہی لوگ ہیں جو ادھر کے ساحل پر کھڑے ہیں جنہوں نے دریا میں قدم بھی نہیں ڈالا اور جو لوگ ادھر کے ساحل پر کھڑے ہیں گو ظاہر میں وہ بھی دوسرے ساحل والوں کی طرح چین میں ہیں اور ہنس رہے ہیں مگر وہ مبتلائے موج کے حال سے بے خبر نہیں ہیں وہ اس خطرہ سے بھی واقف ہیں جس میں یہ مبتلا گرفتار ہے اور اس کے علاوہ دوسرے خطرات سے بھی واقف ہیں کیونکہ وہ تمام دریا کو طے کر چکے ہیں اور اس کے تمام ورطات سے خبردار ہو چکے ہیں وہ تو ایسے باخبر ہیں کہ خود بھی ان سے پار ہو کر نکل گئے اور دوسروں کو بھی نکال سکتے ہیں بلکہ نکال لیتے ہیں۔ اسی لیے ضرورت اس کی ہے کہ شیخ ساحل رسیدہ اور گرداب طے کردہ ہو یعنی صاحب تمکین ہو اور جو شیخ خود صاحب تلوین (مراد وہ تلوین ہے جو قبل از تمکین ہو اور تمکین کے بعد بھی تلوین پیش آتی ہے مگر وہ مشیخت میں قادح نہیں) ہو اس سے الگ ہو جانا چاہیے کیونکہ وہ تو ابھی اپنے ہی بچانے کی فکر میں ہے وہ دوسروں کو کیا بچائے گا تو خود ہی گرداب میں ہے دوسروں کو کیا خاک نکالے گا۔

صاحب تمکین اور صاحب تلوین

اسی حالت کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما　چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

(کل ہمارے پیر مرشد پر سلوک سے حالت جذب طاری ہو گئی جس میں اصلاح نہیں ہو سکتی اس کے بعد ہم یاران طریقت کو کیا تدبیر کرنا چاہیے کہ حالت سلوک واپس آئے اور ہماری اصلاح ہو)

یعنی جس شیخ پر خود ہی سکر غالب ہو وہ طالبین کی کیا تدبیر کرے گا۔ پس راہبر گرگ باران دیدہ کو بنانا چاہیے جو سرد وگرم سب چکھے ہوئے ہو اور صاحب تمکین گرگ باران دیدہ کی علامت یہ ہے کہ اس کی دو ہی باتوں سے سالک کی تسلی ہو جاتی ہے اور صاحب تلوین تو بہت بناتا ہے مگر سالک کی ان سے تسلی نہیں ہوتی اسی علامت کو مولانا فرماتے ہیں:

وعدہا باشد حقیقی دل پذیر　　وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر

(سچے وعدے دل کو لگتے ہیں، مجازی یعنی ناراست وعدے طبیعت میں تردد پیدا کرتے ہیں) مولانا کی فارسی پہلے زمانہ کی فارسی ہے تاسہ کے معنی ہیں اضطراب مطلب یہ ہے کہ شیخ جو وعدہ کیا کرتا ہے کہ یہ حالت فلاں مقام کے حصول کی علامت ہے اور یہ کیفیت فلاں چیز کا اثر ہے اور اب یہ ہوگا تو یہ وعدے اگر صاحب تمکین کی زبان سے نکلیں گے تو سالک کی معاً تسلی وطمانیت ہو جائے گی اور صاحب تلوین کے وعدوں سے خاک اطمینان حاصل نہیں ہوتا بے اطمینانی رہتی ہے۔ حدیث میں بھی یہ مضمون ہے "**الصدق طمانینة والکذب ریبة**"[1] (سچائی اطمینان بخش ہے اور جھوٹ تردد پیدا کرتا ہے) پس کاملین کو ان کی تمکینی حالت دیکھ کر عشق ومحبت کی کیفیات سے خالی نہ سمجھو۔ ان کا عشق پک گیا ہے اس لیے اب وہ اندر اندر اپنا کام کر رہا ہے اور صاحب تلوین کا عشق خام ہے اس لیے دنیا جہان کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔

کاملین کی مثال

کاملین کی ایسی مثال ہے جیسے پکی ہوئی ہنڈیا کہ آگ نے اس کے رگ وپے میں سرایت کر کے ہر چیز کو بھون دیا ہے اور چونکہ اندر تک آگ پہنچ چکی ہے اس لیے آواز نہیں آتی مگر وہ ٹھنڈی نہیں ہے ذرا ہاتھ لگاؤ گے تو بھون دے گی۔ پس کاملین ڈرتے تو اس لیے ہیں کہ بعض دفعہ پکنے کے بعد سکون ایسا کامل ہوتا ہے کہ خود ان کو بھی اپنی مستی کی خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے کو جذب سے خالی سمجھنے لگے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ فی نفسہ وصول کے بعد اب ان پر ارتداد ورجعت کا اندیشہ نہیں رہا۔ مولانا نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ جیسے بالغ

---

[1] (مجمع الزوائد ۱: ۱۴۲)

نابالغ نہیں ہوسکتا اور پکا ہوا پھل کچا نہیں ہوسکتا' گوسٹر جائے گا بس جائے گا مگر کچا کبھی نہیں ہوگا۔ واقعی مثال کے تو مولانا بادشاہ ہیں اوران کی کوئی تخصیص نہیں' عموماً صوفیاء میں معانی کی تحقیق بلکہ اس کے ساتھ فصاحت لفظی بھی بے نظیر ہوتی ہے ان کو الفاظ بھی خوب ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ بالغ کسے کہتے ہیں' فرمایا کہ طبی بالغ تو وہ ہے جس سے منی نکلے اور حقیقی بالغ وہ ہے جو منی سے نکل جائے (یعنی خوداور کبر سے پہلا منی لفظ عربی ہے اور دوسرا فارسی لفظ ہے) اسی طرح ایک بزرگ دوسرے بزرگ کو جو زیادہ خرچ کرتے تھے لکھا ''لاخیر فی الاسراف'' (اسراف میں خیر نہیں ہے) تو دوسرے بزرگ نے ان ہی لفظوں کو الٹ کر جواب دیا ''لااسراف فی الخیر'' کہ نیک کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ ایک بزرگ جارہے تھے' راستہ میں ہوا بہت تیز چلی جس سے میت کی تاریخ وفات نکلتی تھی' بزرگ نے فرمایا یوں مت کہو بلکہ یوں کہوں مات بخیر (مرگیا خاتمہ بالخیر) اس میں بھی وہی تاریخ نکلتی ہے جو مٹی خراب میں نکلتی تھی انہیں حرفوں کو لوٹ پوٹ کر کیسا عمدہ مادہ بنادیا۔ غرض صوفیاء فرماتے ہیں کہ واصل راجع نہیں ہوتا اور اس کی مثال اوپر بیان ہوچکی اور اس کی بھی صوفیاء نے تصریح کی ہے کہ وصول بدون جذب کے نہیں ہوتا تو حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی عنایت ہے اور اس طویل راستہ میں انہوں نے کیسی سہولت فرمادی ہے کہ سلوک کے بعد خود ہی جذب فرمالیتے ہیں اور یہ صوفیاء کی گھڑت نہیں ہے۔

جذب وسلوک

بلکہ قرآن سے اس جذب کا ثبوت موجود ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَن يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُنِيْبُ.

(اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کشش کرلیتے ہیں اور اپنی طرف سے ہدایت کرتے ان لوگوں کو جو ان کی طرف رجوع کرتے ہیں)۔ اس آیت میں جذب وسلوک دونوں کا ذکر ہے مگر نہ اس طرح جیسے ایک جاہل نے کہا ہے کہ قرآن سے صوفیاء کے اشغال ثابت ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''سلطاناً نصیرا و مقاماً محمودا'' (ایک قوت

مدد دینے والی محمود) اور یہی اشغال کے بھی نام ہیں گویا اس جاہل کے نزدیک قرآن میں اس جگہ "سلطاناً نصیرا و مقاماً محمودا" (ایک قوت مدد دینے والی) سے صوفیاء کی اصطلاح مراد ہے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہاں ان الفاظ کے معنی لغوی مراد ہیں اور صوفیاء نے اپنی اصطلاح کو قرآن کے ان الفاظ سے لیا ہے۔ قرآن میں ان کی اصطلاح مراد نہیں ایسے ہی ایک جاہل نے کہا تھا کہ مولوی خواہ مخواہ کھانے پر فاتحہ دینے کو بدعت کہتے ہیں حالانکہ قرآن سے اس کا ثبوت ہے کہ قرآن میں ایک سورت ہی فاتحہ کے واسطے نازل ہوئی ہے اور اسی واسطے اس کا نام قرآن سے لے لیا ہے کہ اس عمل میں سورہ فاتحہ کو پڑھنے لگے اور اس کا نام فاتحہ رکھ دیا یہ الٹی منطق ہے کہ قرآن میں سورہ فاتحہ کا نزول اور اس کا نام اس عمل کے لیے ہے تو میں قرآن سے جذب کا ثبوت اس طرح نہیں دیتا بلکہ الفاظ قرآنیہ کو لغوی معنی پر رکھ کر اور تفسیر سلف کو بحال خود رکھ کر ثبوت دیتا ہوں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کشش کر لیتے ہیں اور اجتباء اور جبی کے معنی لغت میں کشش ہی کے ہیں اور جذب کے معنی بھی یہی ہیں تو اس سے صاف ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو اپنی طرف ہدایت جذب فرماتے ہیں۔ آگے ارشاد ہے: "وَيَهْدِىْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ" (اور اپنی طرف ہدایت کرتے ہیں ان لوگوں کو جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں) اس میں سلوک کا بیان ہے کیونکہ سلوک کے معنی یہی ہیں انابت الی اللہ خدا کی طرف رجوع کرنا اور طلب میں مشغول ہونا سلوک پر فتح باب کا ترتب ہوتا ہے جس کو ہدایت فرمایا گیا ہے۔ وصول اس پر مرتب نہیں ہوتا وصول اجتباء اور جذب سے ہوتا ہے جب تک ادھر سے جذب نہ ہو وصول نہیں ہوسکتا جس درجہ کا بھی جذب ہوگا اسی درجہ کا وصول ہوگا۔ اگر جذب کامل ہے وصول کامل ہوگا اگر جذب قلیل ہے تو وصول بھی قلیل ہوگا۔ ایک بزرگ نے جذب کی حقیقت کو حسی مثال میں خوب بیان فرمایا وہ ایک بادشاہ کے بالا خانہ کے نیچے سے جا رہے تھے بادشاہ نے آواز دی کہ ذرا یہاں تشریف لائیے مجھے ایک سوال کرنا ہے۔ کہا کیوں کر آؤں تم اوپر میں نیچے بادشاہ نے فوراً کمند لٹکا دی کہ اسے پکڑ لیجئے پھر بادشاہ نے کھینچ لیا فوراً اوپر پہنچ گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم خدا تک کس طرح پہنچے بزرگ نے بے ساختہ جواب دیا کہ جس طرح تم تک پہنچا اگر میں ملنا چاہتا اور تم نہ ملنا چاہتے تو قیامت تک بھی میں آپ تک نہ پہنچ سکتا۔ تم نے خود ملنا چاہا تو خود

ہی کھینچ لیا' اس طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنا دشوار تھا کیونکہ طویل راستہ کا قطع کرنا بندہ سے کہاں ممکن ہے اگر وہ ملنا نہ چاہتے تو قیامت تک وصول نہ ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے خود ہی ملنا چاہا اور کھینچ لیا جیسا تم نے کمند سے کھینچ لیا۔ سبحان اللہ اہل اللہ کو ذہانت بھی کیسی عطا ہوتی ہے مگر یہ جب عطا ہوتی ہے کہ پڑھا لکھا سب بھلا دو پھر وہ خود علوم کو تمہارے دل میں نقش کرتے ہیں اور جب تک تم اپنے نقش کو نہ مٹاؤ گے اس وقت تک دوسرا نقش اس پر کیسے ہوگا مگر مٹانے کی توفیق بھی اسے ہی ہوتی ہے جس کو وہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ بس یوں کہو کہ جب وہ کچھ دینا چاہتے ہیں تو خود ہی پہلے نقش کو مٹا دیتے ہیں اور خود ہی دوسرا نقش قائم کر دیتے ہیں مگر خود بھی لگا رہنا ضرور ہے۔

محبت حق سبحانہ وتعالیٰ کا طریقہ

ایک بزرگ جو کہ ان پڑھ تھے محمد شیر شاہ ان کا نام تھا ملا ہوں' میں نے ان سے پوچھا کہ محبت حق کا طریقہ بتلائیے فرمایا ذرا اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑو' میں حیران ہوا کہ میرے سوال کا یہ جواب کیسا مگر تقلیداً میں نے ہاتھوں کو رگڑا' پوچھا کہو کچھ گرمی پیدا ہوئی' میں نے کہاں ہاں ہوئی' فرمایا بس یوں ہی رگڑتے رہو ایک دن گرمی پیدا ہو کر شعلہ محبت بھڑک جائے گا' دیکھئے معقول کو کیسا محسوس بنا دیا اور واقعی کیسا راستہ کو سہل بنا دیا' بس کام میں لگے رہو اسی طرح ایک دن کام بن جائے گا۔ اب میں اسی کام کو بتلاتا ہوں جو تمہارے کرنے کا ہے سو اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں انہی میں لگنے سے کام بنتا ہے اور جو بھی پہنچا ہے انہی سے پہنچا ہے۔ میں اس وقت طریقت کا بھانڈا پھوڑ رہا ہوں' لوگوں نے خواہ مخواہ اندھیری کوٹھڑی میں ان کو ڈال کر مقفل کر رکھا ہے اس کو تو برسر ممبر کہنا چاہیے وہ دو باتیں یہ ہیں ذکر اور اطاعت مگر ان کا طریقہ کسی محقق سے دریافت کرو اپنی رائے سے تجویز نہ کرو۔ حضرت فرید عطار فرماتے ہیں:

گر ہوائے ایں سفر داری دلا   دامن رہبر بگیر و پس برآ

(اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو دامن رہبر کامل کو مضبوط تھام اور پیچھے آ) اور مولانا فرماتے ہیں: -

یار باید راہ را تنہا مرد　　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرد
(ساتھی ضرور چاہیے تنہا راستہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے ہرگز قدم مت رکھے)

قلاؤز کے معنی طائعین کی اصطلاح کے اعتبار سے قل اعوذ نہیں بلکہ قلاؤز تر کی لفظ ہے بمعنی رہبر گو وہ قل اعوذ یا بھی ہو مگر راستہ کا جاننے والا ہو محقق ہو اس سے طریقہ دریافت کر کے ذکر و طاعت میں مشغول ہو ان شاء اللہ واصل ہو جائے گا۔ بس ان دونوں میں خلل نہ آئے باقی کیفیات واحوال کے درپے نہ ہو وہ سب انہی دو کی باندیاں ہیں اور جب تک محقق مل سکے اس وقت تک کتاب سے سلوک طے نہ کرو کتابیں بھی مفید ہیں مگر وہ مریض کے لیے نہیں ہیں بلکہ طبیب کے لیے ہیں۔ یہ طبیب کے ذمہ ہے کہ مواقع اشکال میں قرابادین و قانون کا مطالعہ کر کے علاج کرے۔ مریض کو ان کتابوں کا مطالعہ مفید نہیں اور ان کو مطالعہ کر کے شیخ سے معارضہ کرنا تو سم قاتل ہے وہ دامن جھاڑ کر الگ ہو جائے گا تمہاری کتاب تو انسان کامل یعنی شیخ ہے تم کو مشکل حل کرنا ہو اسی کے مطالعہ سے کرو اسی کو فرماتے ہیں:

وانت الکتاب المبین الذی　　　باحرفہ یظہر المظہر
(اور تو واضح کتاب ہے جس کے حروف سے پوشیدہ اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں) اور فرماتے ہیں:

اے لقاء تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال
(آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے اور ہر مشکل کا حل ہے)

مطالعہ دینی کتب

ہاں اگر کسی کو شیخ محقق نہ ملے تو پھر کتابوں کا مطالعہ کرو مگر ان کتابوں کا جن میں علوم عاملہ کا بیان ہو اصلاح نفس کے طرق مذکور ہوں اس وقت یہ کتابیں بھی بمنزلہ شیخ کے ہوں گی۔ عارف فرماتے ہیں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست　　　صراحی مئے ناب و سفینہ غزل ست

جو زمانہ شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو اور یہ جبھی ہے کہ شیخ محقق میسر نہ ہو ورنہ اس کے ہوتے ہوئے کتاب کی کچھ ضرورت نہیں اسی کو دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

مقام امن و مئے بے غش و رفیق شفیق　　گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مامون مقام اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی خالص شراب اور مشفق شیخ اگر تم کو ہمیشہ میسر ہوں تو بڑی خوش نصیبی ہے) رفیق شفیق سے شیخ ہی مراد ہے۔ بہر حال سالک کو شیخ کے نہ ملنے کے وقت یا شیخ کی اجازت کے وقت ان کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے جن میں طرق اصلاح اور علوم معاملہ مذکور ہوں۔

کتب علوم مکاشفہ و اسرار کے مطالعہ کا حکم

اور جن کتابوں میں علوم مکاشفہ اور اسرار مذکور ہیں ان کو ہرگز نہ دیکھا جائے ان کے متعلق تو صوفیاء خود فرماتے ہیں: "یحرم النظر فی کتبنا" ہماری کتابوں کو دیکھنا حرام ہے ان کو صرف محقق ہی دیکھ سکتا ہے اور وہی ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ یہ باتیں تو برسر ممبر کہنا چاہئیں ان سے بھی میری مراد علوم معاملہ و طرق اصلاح نفس ہی ہیں، علوم مکاشفہ و اسرار مراد نہیں ان کو برسر ممبر نہ کہنا چاہیے ورنہ مخلوق گمراہ ہو جائے گی۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس راستہ کو کتنا سہل بنا دیا ہے کہ خود جذب فرما لیتے ہیں، میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے ہم کسی بچہ کو دور سے دیکھ کر ہاتھ پھیلا دیں کہ ہماری گود میں آ جا اور وہ شوق میں دوڑے اور دو قدم دوڑ کر گر پڑے۔ اس وقت ہم خود دوڑ کر اس کو اٹھا لیتے ہیں اور اگر وہ چلے بھی نہیں تو ہم بھی نہیں لیتے، بس یہاں بھی اسی کی ضرورت ہے کہ تم اس طویل راستہ کے طے کرنے کا قصد کر کے چلو اور گر پڑو (یعنی عجز و عبدیت کا اظہار کرو) پھر حق تعالیٰ خود تم کو اٹھا کر منزل پر پہنچا دیں گے اور اس سے زیادہ سہولت اور دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے مبدا سفر کو حکم دیا، پیچھے ہٹنے کا اور منتہائے سفر کو حکم دیا، آگے بڑھنے کا یعنی جس مسافت کو ہم طے کر رہے ہیں اس میں تنہا ہم ہی متحرک نہیں ہیں بلکہ اس سفر کا مبدا اور منتہا بھی متحرک ہیں، مبدا پیچھے کو ہٹ رہا ہے ہم سے دور ہو رہا ہے اور منتہا آگے کو بڑھ رہا ہے ہم سے نزدیک ہو رہا ہے اب بھلا مسافت جلدی کیوں نہ ختم ہو گی جب تین چیزیں حرکت کر رہی ہیں کہ مسافر خود بھی منتہا کی طرف کو چل رہا ہے اور مبداء بھی بعید ہو رہا ہے اور منتہا بھی قریب ہو رہا ہے اور یہ میری گھڑت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: "**الا ان الدنیا مدبرة والاخرة مقبلة**" کہ دنیا پیچھے کو ہٹ رہی ہے اور آخرت قریب ہو رہی ہے یہ تو سفر اضطراری کی حالت ہے اور سیر

اختیاری جس کو سلوک کہتے ہیں اس کی بھی یہی حالت ہے جو بندہ طلب میں قدم رکھتا ہے اسی وقت سے موانع پیچھے ہٹنے لگتے ہیں یعنی خود بخود مرتفع ہونے لگتے ہیں اور مقصود قریب ہونے لگتا ہے اور اس میں مبالغہ نہیں ہے جب حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوتی ہے تو دنیا خود بندہ کو چھوڑ دیتی ہے اور موانع خود بخود مرتفع ہو جاتے ہیں اور یہ جزو اول ہے دعوے کا۔

تارک دنیا ہونا بڑا مشکل ہے

ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ میاں تارک الدنیا ہونا تو بڑا مشکل ہے مگر جب توفیق حق شامل حال ہوتی ہے تو بندہ متروک الدنیا ہو جاتا ہے کہ دنیا خود اسے چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے اس نے بیوی کو طلاق دیدی اور بیوی نے خلع کر لیا اور اگر دنیا خود اسے نہ چھوڑے تو یہ لاکھ طلاقیں دے وہ لپٹتی ہے اور جہل سے یہی کہتی رہتی ہے کہ تیرے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے، میں نے تو طلاق قبول ہی نہیں کی۔ جیسے ایک جاہل عورت نے اپنے مرد کو یہی جواب دیا تھا اور دوسرا جزو دعویٰ اس حدیث میں مصرح ہے۔ "من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً" الحدیث[1] (جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں) اور مبداء و منتہا کے پیچھے ہٹنے اور آگے بڑھنے کا ایک واقعہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ۹۹ خون کیے تھے پھر اس کو توبہ کا خیال ہوا تو ایک عالم کے پاس گیا اور اپنا قصہ بیان کر کے مسئلہ دریافت کیا کہ اسی حالت میں میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں وہ کوئی جلالی مولوی تھے، کہا تیرے واسطے توبہ کہاں یعنی کیا ۹۹ خون ایک ساعت میں معاف ہو سکتے ہیں، جا تیرے واسطے تو جہنم کا عذاب ہے سائل کو غصہ آیا، اس تلوار سے ان کا بھی خاتمہ کر دیا کہ چلو سو میں ایک ہی کی کسر کیوں رہے۔ اس مولوی نے بھی تو اس کو قتل ہی کر دیا تھا کہ غریب کو رحمت حق سے مایوس کر دیا جس سے کفر کا اندیشہ تھا، شیخ کو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ طالبوں کو مایوس کرے۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ محض نجدی ہونا کافی نہیں وجدی ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ مولوی محض نجدی تھا یعنی زاہد خشک اس لیے اس نے طالب کو مایوس کر دیا۔ اگر وجدی بھی ہوتا تو اس کی طلب کو دیکھ کر پگھل جاتا۔

---

[1] (مسند احمد ۲: ۴۱۳، ۴، کنز العمال: ۱۱۷۹)

ایک صاحب تلوین درویش کی حکایت

رام پور ریاست میں ایک صاحب تلوین درویش تھا اس کو کسی مقام پر قبض ہوا اور یہ یقین ہوگیا کہ میں مردود ہوگیا ہوں' تو اس نے خودکشی کا ارادہ کیا' پھر سوچا کہ لاؤ کسی دوسرے شیخ ہی سے اپنا حال کہوں شاید گرہ کھل جائے' وہاں ایک مشہور شیخ تھے ان کے پاس گیا' انہوں نے پوچھا کون ہو' کہا حضرت میں شیطان ہوں' شیخ نے جواب دیا کہ اگر شیطان ہوتو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ. (بجز اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے نہ گناہوں سے پھرنا اور نہ عبادت پر قوت ہے) اس جواب سے سائل کو اپنی مردودیت کا یقین ہوگیا اور اپنے ایک مرید سے کہا کہ میں خودکشی کرتا ہوں' اگر کچھ کسر رہ جائے تو تم پورا کردینا۔ چنانچہ حجرہ میں جاکر اس نے گردن کاٹ لی اور مرید نے اندر جاکر دیکھا تو کچھ کھال الجھی ہوئی رہ گئی تھی اس نے اس کو بھی الگ کردیا' وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ لوگ آگئے اور مرید کو گرفتار کرلیا' اس نے کہا مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں جب میرا شیخ خودکشی کرکے مرگیا تو مجھے ہی جینے کی کیا تمنا ہے تم شوق سے مجھے قتل کردو۔

احوال وجدی

پھر واقعہ کی تحقیق کی گئی تو مرید کی برات ثابت ہوئی اسے رہا کردیا گیا۔ یہ واقعہ ایک طالب علم نے جو میرے ہم سبق تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا افسوس ہم تو اس شیخ کو اب تک کامل سمجھے ہوئے تھے مگر معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں یونہی شہرت ہی شہرت ہے اس کو اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ سائل پر کیا حالت ہے اور اس کا علاج کیونکر کرنا چاہیے اور اگر اس نے اپنے کو شیطان کہا تھا تو ان کو جواب میں یوں کہنا تھا کہ پھر کیا مضائقہ ہے' شیطان بھی تو اسی کا ہے نسبت و تعلق تو اب بھی منقطع نہیں ہوا۔ اس جواب سے فوراً قبض کھل جاتا مگر ظالم نے لاحول پڑھ کر بے چارہ کو مایوس کردیا۔ دیکھا اپنے وجدی ایسے ہوتے ہیں جو طالب کو کسی حال میں مایوس نہیں کرتے بلکہ اس کے شریک غم ہوجاتے ہیں اور اس کے غم کو بٹا کر کچھ اپنے اوپر بھی لے لیتے ہیں۔ یعنی اس کی حالت پر غصہ نہیں کرتے بلکہ اس کی حالت پر غمگین ہوکر ورطہ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب ان

کی شرکت سے دو دل یک شود بکشند کوہ را ہمارے حاجی صاحب رات کو تہجد میں اکثر سورہ یٰسٓ پڑھا کرتے تھے اور اس کی حکمت میں یہ شعر پڑھتے تھے کہ جب دو دل مل جائیں تو یہ پہاڑ کو بھی توڑ دیتے ہیں اور یہاں تین دل ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ایک مصلی کا دل دوسرا قلب اللیل، تیسرا قلب القرآن یعنی یٰسٓ جس کو حدیث میں قلب القرآن فرمایا ہے تو تین دل مجتمع ہو کر شیطان کو کیسے نہ بھگا دیں گے۔ خوب لطیفہ ہے غرض اس مولوی نے تجدیت سے کام لیا وجدی نہ تھا اس لیے طالب کو مایوس کر دیا۔

رحمت حق

پھر وہ ایک دوسرے عالم کے پاس گیا وہ یا تو محقق تھے یا پہلے واقعہ کو سن کر ان پر خوف طاری ہو گیا تھا ان سے مسئلہ پوچھا تو جواب دیا کہ توبہ تو ہر مسلمان کے لیے ہے خواہ کیسا ہی گنہگار ہو، تمہاری توبہ کیوں نہ قبول ہو گی ضرور قبول ہو گی مگر تکمیل توبہ کے لیے ایک شرط ہے وہ یہ کہ جس بستی میں تم رہتے ہو اس کو چھوڑ دو یہاں کی صحبت اچھی نہیں تم فلاں بستی میں جا کر رہو وہاں کے آدمی اچھے ہیں۔ یہ تو شرط لگانا بتلاتا ہے کہ یہ عالم محض خائف ہی نہ تھا بلکہ محقق تھا۔ یہ جواب سن کر سائل نے توبہ کی اور چونکہ طلب کی شان پیدا ہو چکی تھی اس لیے تکمیل توبہ کے لیے وطن سے ہجرت بھی کی اور اس بستی کی طرف چلا جہاں کے لیے عالم نے وصیت کی تھی، کچھ ہی دور چلا تھا کہ موت کا وقت آ گیا۔

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند ۔۔۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

مگر اس نے اپنے کرنے کا کام اس وقت بھی کیا کہ عین نزع کی حالت میں بھی اس بستی کی طرف اس نے اپنا سینہ ابھار دیا اور کام تمام ہو گیا۔ اب رحمت حق کا کام دیکھئے چونکہ طالب اپنا کام کر چکا تھا اور وصول اس کے اختیار سے باہر تھا تو اب محبوب نے وصول کا خود انتظام کر دیا جس بستی سے اس نے چلنا شروع کیا تھا اس کو حکم ہوا تباعدی کہ تو دور ہو جا، پیچھے ہٹ جا اور جس بستی کی طرف یہ جا رہا تھا اسے حکم ہوا تقاربی کہ تو قریب ہو جا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اجتہاد ملائکہ

اب ملائکہ رحمت و ملائکہ عذاب دونوں آ پہنچے اور ہر جماعت نے اس پر قبضہ کرنا چاہا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ اس کے مستحق ہم ہیں کیونکہ یہ توبہ کر کے اور گناہوں سے پاک ہو کے

مرا ہے۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ نہیں یہ مستحق عذاب ہے کیونکہ تکمیل توبہ کی شرط متحقق نہیں ہوئی' ابھی صلحاء کی بستی میں بھی نہیں پہنچا تو توبہ کامل نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی بعض دفعہ اجتہاد کرتے ہیں' ہر کام صریح نص ہی سے نہیں کرتے۔ جب ان میں باہم اختلاف ہوا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ نے آ کر یہ فیصلہ کیا زمین کو ناپ لو جون سی بستی قریب ہو اسی کے موافق حکم ہوگا۔ اگر قریہ اشرار سے قریب ہو تو اشرار میں داخل کر دو اور قریہ ابرار سے قریب ہو تو ابرار میں داخل کر دو۔ چنانچہ پیمائش کرنے سے ایک ہاتھ قریہ ابرار سے قریب نکلا' پس ملائکہ رحمت کے سپرد ہوا تو جس طرح یہاں حساً مبدا کو بعید اور منتہا کو قریب کیا گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سالک کے لیے معنیً مبدا کو بعید اور منتہا کو قریب کر دیتے ہیں۔ اب بتلایئے یہ راستہ کتنا آسان ہوگیا کہ حق تعالیٰ بندہ کو جذب بھی فرماتے ہیں اور جب تک سلوک رہتا ہے اس وقت بھی یہ سہولت کرتے ہیں کہ مبدا کو بعید ہونے کا اور منتہا کو قریب ہونے کا حکم دیتے ہیں بس اب اس سفر کے طویل ہونے سے گھبرانا نہ چاہیے۔

خلاصہ بیان

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ آپ ہر وقت سفر میں ہیں تو آپ کو مسافر کی طرح فکرمند اور بے چین رہنا چاہیے' بے فکر نہ ہوں' برابر عمل میں لگے رہئے اور اپنی طرف سے راستہ قطع کرنے کی برابر ہمت کیجئے پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات و اعانات کا لطف دیکھئے کہ وہ کیونکر طویل مسافت کو قصیر اور دشوار گزار طریق کو پھولوں جیسا ہلکا بنا دیتے ہیں۔ اگر کبھی سستی ہو جائے تو پھر از سر نو تجدید فکر کیجئے' اگر گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر لیجئے اس سے پھر بندہ رستہ ہی پر آ جاتا ہے' اب آیت کا ترجمہ کر کے میں بیان ختم ہی کرنے والا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ختم اس واسطے بھی کر رہا ہوں کہ اب مضامین ہی ذہن میں نہیں ہیں۔ ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "ان ھذہ تذکرۃ" کہ یہ قرآن اور یہ شریعت یادداشت ہے اس لفظ میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ لغت میں تذکرہ اسی شے کو کہتے ہیں جو شے معلوم کی یاددہانی کرے۔ تو اس میں اس طرح اشارہ ہے کہ یہ سفر ایسا ہے جو تم کو پہلے سے معلوم ہے مگر بھول گئے ہو تو یہ قرآن اس کی یاددہانی کرتا ہے باقی یہ کہ اس راستہ کے معلوم ہونے کی کیا دلیل۔ سو اس کو مولانا بیان فرماتے ہیں:

بشنواز نے چوں حکایت می کند وزجد ائیہا شکایت می کند

(بانسری روح انسانی کی باتیں سنو کہ جدائی سے کیسی حکایت شکایت کررہی ہے)

کز نیستاں تامرا ببریدہ اند ازنفیرم مرد و زن نالیدہ اند

(مجھ کو نیستاں (عالم ارواح) سے جدا کر دیا گیا ہے تو اس درجہ شور شیون میں مبتلا ہوں کہ سننے دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔)

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرح درد اشتیاق

(میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو خود کسی کے فراق سے پارہ پارہ ہوتا کہ اپنا درد اشتیاق کھولوں تب اس کی سمجھ میں آوے)

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش باز جوید روز گار وصل خویش

(ہر شخص کا قاعدہ ہے جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصول کو ڈھونڈتا ہے)

صاحب ذرا تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل سے اپنے ضمیر سے اپنی روح سے باتیں کیجئے وہ اس کا جواب دے گی کہ آپ کس سفر کو بھولے ہوئے ہیں اس سے آپ کو مشاہدہ ہو جاوے گا۔ قرآن بتلا رہا ہے کہ بے شک یہ آپ کو بھولا ہوا سفر یاد دلا رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ تمہارا اصلی وطن یہ نہیں جہاں اب ہو بلکہ اور ہے جس کی طرف جا رہے ہو۔ اے صاحبو! اپنے وطن کو جا رہے ہو اور اتنی سست رفتار کہ بیٹھ بیٹھ کر چل رہے ہو اصل مکان کی طرف تو جانور بھی تیزی سے چلا کرتے ہیں۔ بیلوں کو دیکھئے کہ وطن کی طرف کس شوق سے قدم اٹھا کر چلتے ہیں حیرت ہے کہ آپ انسان ہو کر بھی اپنے اصلی وطن کی طرف تیزی کے ساتھ قدم نہیں اٹھاتے۔ صاحبو! سستی نہ کرو تیزی کے ساتھ چلو تمہارا اصلی وطن اصلی مستقر آ گے ہے۔ تم دنیا میں کہاں پھنسے رہ گئے اس کے ساتھ کیوں دل لگالیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

(تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں) اس میں اس کی تعلیم ہے کہ اگر کسی کو اپنے فہم یا عمل پر ناز ہو اور یوں سمجھنے لگے کہ میں نے راستہ کو بہت جلد طے کیا اور مجھے اس کی معرفت کامل ہے اور میری سیر دوسروں سے کامل ہے تو وہ اس مضمون سے اپنے ناز کا علاج

کر لے کہ تمہاری مشیت حق تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے ان کے چاہنے سے کام بنا ہے اگر وہ نہ چاہتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس پر اگر یہ سوال ہو کہ پھر اس کی کیا وجہ کہ حق تعالیٰ نے کسی کے لیے تو وصول چاہا اور کسی کے لیے نہیں چاہا' سب کو واصل کر دیتے تو اچھا تھا۔ اس کا جواب آگے ہے: "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا." (بے شک اللہ تعالیٰ علم والے حکمت والے ہیں) کہ سب کے واصل نہ بنانے میں بھی حکمتیں ہیں اور کسی کے ساتھ تعلق مشیت ہونا کسی کے ساتھ نہ ہونا حکمت کا مقتضی ہے تم اس میں دخل نہ دو اللہ تعالیٰ خود سب باتوں کو جانتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں حکمت سے کرتے ہیں۔

وجود کفر میں حکمت

ایک دفعہ میرے دل میں یہ خطرہ آیا تھا کہ تھانہ بھون شاہ ولایت صاحب کے مزار پر جو خرافات ہوتی ہیں اگر یہ نہ ہوتیں تو اچھا تھا چونکہ اس خطرہ میں تقدیر سے منازعت تھی' اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی' رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی یوں کہہ رہا ہے۔

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ۔۔۔ آتش کرابسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانہ میں کفر کا ہونا ضروری ہے' دوزخ میں کون جلتا اگر ابولہب نہ ہوتا)

فوراً میرا خطرہ رفع ہو گیا اور عالم میں خیر و شر ایمان و کفر سب کا مطابق ہونا منکشف ہو گیا۔

اسماء الٰہیہ کی قسمیں

محققین نے اس حکمت کو اس سے زیادہ واضح بیان فرمایا ہے کہ صفات الٰہیہ جمیل ہیں اور جمال مقتضی ظہور کو ہے بس اسماء بھی مقتضی ہوں گے' ظہور کو اور اسماء کی دو قسمیں ہیں' جمالیہ' جلالیہ پس بعض کائنات مظہر ہیں۔ جمال کے بعض جلال کے اس لیے عالم میں خیر و شر کا ہونا ضروری ہے لیکن اقتضاء سے مراد معنی لغوی نہیں ہے تا کہ اضطرار کا شبہ کیا جائے بلکہ اصطلاحی معنی مراد ہیں وہ اپنی اصطلاح میں مطلق ترتب کو بھی اقتضاء سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ گو ترتب درجہ لزوم و وجوب میں نہ ہو اسی لیے تو ان کتب کے مطالعہ کی ہر شخص کو اجازت نہیں دی جاتی کہ لوگ ان اصطلاحات و رموز سے ناواقف ہیں۔ بس اب ختم کرتا ہوں' دعا کیجیے حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں اور ہم سب کو اپنے راستہ میں سہولت و جذب عطا فرمائیں۔ آمین

سبیل السعید

عوام پر علماء کا اتباع ضروری ہونے کے بارے میں مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۳ ربیع الثانی ۱۳۴۰ ہجری ڈیڑھ گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا: جسے مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ. (الانعام، آیت نمبر ۱۵)

ترجمہ: (اور یہ کہ دین میرا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے پس اس راہ پر چلو ۱۲ منہ پارہ ۸ رکوع ۶)

تمام دین کا خلاصہ

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حق تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے۔ تمام دین اس کی تفسیر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اس کو سن کر عمل کی رغبت ہوتی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں مگر مخالفت نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہو گئے ہیں ان کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے اور جتنے قواعد وضوابط حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لیے ہیں وہ ضابطہ محضہ نہیں بلکہ عین شفقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ کنویں میں گرنے لگے تو اس کو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچے لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں، شفقت کا ہٹانا یہی ہے نہ یہ کہ اہل حکومت کی طرح ضابطہ سنا دیا جائے جیسے حکام وسلاطین اور ان کے نواب کا طریقہ ہے کہ منادی کرنے والا ایک طرف سے منادی کرتا

چلا گیا چاہے کوئی سنے یا نہ سنے، سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو۔ سو یہ ضوابط ہیں اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں ہاں صورت ضوابط کی ہے سو اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے وقت مقرر کرتا ہے، پرہیز متعین کرتا ہے تو ظاہر میں یہ ضوابط ہیں مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں حقیقت میں ہلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے، اپنی مصلحت کے لیے نہیں لگاتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنی شان حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لیے متعین فرمائے ہیں اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتے تو بندوں ہی کا ضرر تھا۔ پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں ان کا مبنیٰ شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو ان کے اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے کہ بیٹا سمجھ لے اور اس کی سمجھ میں بات آ جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے۔ فرماتے ہیں: "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ" کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے۔ ہذا کا اشارہ اوپر کے احکام کی طرف ہے جو امہات احکام ہیں جو تمام دین کا خلاصہ ہیں مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت "اَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا" (اور یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے) اجمال بعد تفصیل ہے۔ قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرز شفقت کو واضح کروں۔ ایک اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے کہ ہم کو بدون ابتلاء سے محفوظ رکھ کر ہم کو نجات عطا فرماتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطاء فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں۔ (اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے)

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراق یار نہ آن می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر
کنا یتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

(پیر کنعاں نے نہایت عمدہ بات کہی وہ یہ کہ فراق محبوب ایسی مصیبت ہے جو کہ بیان نہیں کر سکتے' واعظ شہر نے ہول قیامت کی جو حدیث بیان کی اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس نے روزگار ہجراں کے بارے میں ذکر کیا)

ابتلاء میں حکمت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَن يُّتْرَكُوْٓا اَن يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. (کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور (ان کو قسم قسم کے مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا) رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے سو اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے ان کا طریقہ یہ ہے "**ابهموا ما ابهم الله**" کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لیے ملائکہ پہلے سے موجود تھے۔ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدون ابتلاء ہی ہے ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت ومنازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لیے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے اور درجہ خاص کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو "**الدین یسر**" (دین آسان ہے) کے خلاف ہوتا اس لیے میں نے یہ قید لگادی۔

کاملین کیلئے احکام الٰہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں

اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الٰہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ

رکھا ہے۔ چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہوگا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتدائے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لیے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار وارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتداء میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لیے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جائے اور عبادت میں لذت وحظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے' گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پنشن دیں گے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے' عفو ومغفرت خلاف عقل ہے۔ پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو بعضے پیروں کی حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مریدان کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے ایک پیرزادہ کو دعوت کے بعد ۵۰ دیئے گئے تو اس نے پھینک دیئے اور کہا کہ کیا ہماری شان پچاس روپیہ کے لائق ہے۔ غرض دوسو روپیہ لے کر ٹلے تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا کہ وہ بندہ کو دانت گھ...

سا دیتے ہیں کیونکہ انتہاء میں طاعت کا بجالانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ آخیر میں وہ حالت ہوجاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہوا۔ ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ''[1] (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے) کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی، آپ کی تو یہ فطرت ہی سے طبیعت تھی مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہوجاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہوجاتی ہے جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے کہ یہ خود دودھ پیئے گا کیونکہ دودھ سے اس کو خود ہی رغبت ہے مگر اظہار شفقت کے لیے چپت لگاتی ہے ایسے ہی منتہی کے لیے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں۔

مبتدی کو احکام میں ثالثی

بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لیے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت ہیں کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے۔ یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے، میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے:

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں　　　جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم

بعض واعظین کی غلطی

یہ آج کل کے واعظوں کی زیادتی ہے کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم کو نہ خدا سے محبت ہے اور نہ خدا کی عظمت ہے، حکام کے سمن اور طلبی پر تو تم فوراً بلا چون و چرا کے عدالت میں حاضر ہوتے ہو خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات کوئی چیز تم کو مانع نہیں ہوتی اور خدا کے احکام میں سو بہانے اور حیلے نکالتے ہو سو یہ دلیل غلط ہے کیونکہ رعایا کو حکام سے محبت نہیں ان کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب

---

[1] (مسند احمد ۶: ۹۱)

نہیں ہوتا' لوگ جانتے ہیں کہ حاکم غیر ہے اس سے ہم کو کیا تعلق اور وہ ہماری راحت و کلفت کا کیوں لحاظ کرے اس لیے ان کے احکام میں منازعت وکشاکشی نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ سے انسان کو محبت ہے اور خاص تعلق ہے ان کی طرف سے جو حکم اور قید آتی ہے اس میں بوجہ ناز کے مچلتا ہے کہ ایسے رحیم وکریم نے میرے اوپر مصیبت کیوں ڈالی' واعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اس لیے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت خالی بتلا کر ان کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں۔ گویا بس ایک یہی واعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے ہیں۔ حضرت عارف شیرازی نے ایسے واعظوں کی خوب خبر لی ہے' فرماتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبری کنند
چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگری کنند

(واعظین جو محراب ومنبر پر جلوہ کرتے ہیں مگر جب تنہائی میں پہنچتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں)

اس میں بعض واعظوں کے دل میں یہ تاویل آ چکی ہے کہ حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت میں جا کر یہ لوگ ذکر وشغل کرتے ہیں۔ جی ہاں بس خوش ہو لو؟ ذرا اس سے آگے بھی پڑھ لو۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتری کنند

(مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ کوئی دانش مندان مجلس سے پوچھے کہ توبہ کی تلقین کرنے والے خود بہت ہی کم توبہ کرتے ہیں)

محبت کا اثر

واعظین گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ وہ خود بھی خلاف ورزی احکام کی کس قدر کرتے ہیں پھر بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی ہیں اور اگر وہ خالی نہیں تو عوام بھی خالی نہیں بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔

محبت کا اثر

اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اس لیے اس مقام پر فرماتے ہیں: "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا" کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس

لیے منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے۔ اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی' خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا' میرا بتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا علم ہو جاوے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا اُف نہ کرتا' ننانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی' کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نہ کی' آخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی' کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا' میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا:

بجرم عشق تو ام می کشند وغو غائیست تو نیز برسر بام آ کہ خوشنما شائیست

(اے محبوب آپ کے عشق کے جرم میں مجھ کو لوگ مار ڈالتے ہیں اور ایک بھیڑ لگا رکھی ہے آپ بھی برسر بام آ جائیے کہ خوب تماشا ہے)

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا۔ جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے' یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں۔ تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا ہلکا کر دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور

مشقت آجاتی ہے نہ اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہوئی کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا' اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی۔اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

ایک سبق آموز حکایت

اور یہیں سے ایک حکایت کی حقیقت معلوم ہوگئی جو مولوی مظہر صاحب رام پوری نے جو میرے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی خدمت میں موجز میں شریک تھے۔(میں نے موجز کو موجز ہی پڑھا ہے ورنہ مطول ہوجاتی) رام پور ریاست کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص صاحب قبض ایک صاحب ارشاد کے پاس گیا۔انہوں نے پوچھا تم کون ہو' کہا میں شیطان ہوں' فرمایا اگر شیطان ہو تو ''لاحول و لا قوة الا باللّٰه'' یہ جواب سن کر اس کو مردودیت کا یقین ہوگیا کہ جب ایک شیخ صاحب ارشاد نے بھی مجھ پر لاحول پڑھ دی تو میرے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں تو اس نے اپنے خادم سے کہا کہ اب اس زندگی سے موت بہتر ہے اس لیے میں خودکشی کروں گا۔اگر کچھ کسر رہے تو تم پوری کر دینا۔چنانچہ اس نے خودکشی کی اور جان نکلنے کے بعد مرید نے الجھی ہوئی کھال کو الگ کر دیا۔اسی حالت میں وہ گرفتار کیا گیا اس نے کہا تم مجھے کیا گرفتار کرتے ہو میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں' جب میرا پیر نہ رہا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا' تم شوق سے مجھے پھانسی دیدو۔اس بیان سے حاکم کو اس کے قاتل ہونے میں شبہ پیدا ہوا تو اس نے واقعہ دریافت کیا' اس نے سب واقعہ بتلا دیا' یہ خبران صاحب ارشاد شیخ کو بھی پہنچی۔انہوں نے بھی تصدیق کی کہ ہاں وہ قبض میں مبتلا تھا اور میرے پاس آیا تھا' کچھ تعجب نہیں کہ اس نے خودکشی کر لی ہو۔

یہ حکایت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے سنی تو فرمایا کہ ہم تو ان صاحب ارشاد کو شیخ سمجھے تھے مگر معلوم ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ان کو چاہیے تھا کہ جب اس نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں تو جواب میں یوں کہتے کہ پھر کیا حرج ہے' شیطان بھی تو اس کا ہے' نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی اس سے تسلی ہوجاتی' شاید تم یہ کہو کہ ان الفاظ سے کیا ہوتا تو تم اس کو کیا جانو؟

الفاظ میں بڑا اثر ہے

جس پر قبض طاری ہو چکا وہ اس کے اثر کو سمجھتا ہے۔ صاحبو! الفاظ میں بڑا اثر ہے اس کو ایک مثال سمجھئے۔ مولوی غوث علی صاحب پانی پتی سے کسی نے شیخ اکبر و فرید عطار و مولانا رومی کے متعلق دریافت کیا کہ وحدۃ الوجود میں گفتگو کرنے والے یہی تین حضرات بڑے ہیں ان میں کیا فرق ہے' فرمایا تینوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تین مسافر کسی گاؤں میں ایک کنویں پر پہنچے' ایک عورت پانی بھر رہی تھی اس سے پانی مانگا مگر ایک نے تو یوں کہا کہ اماں مجھے پانی پلا دے یہ تو مولانا رومی ہیں' دوسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا کی جورو مجھے پانی دیدے' یہ شیخ اکبر ہیں' تیسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا سے یوں تو کرانے والی مجھے پانی دیدے' یہ شیخ فرید ہیں۔ اب غور کر لیجئے کہ ان الفاظ کے اثر میں فرق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ماں کو اماں کہے تو وہ خوش ہو گی اور اگر باوا کی جورو یا باوا سے یوں توں کرانے والی کہے تو اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جائے گی۔ حالانکہ معنی سب کے متحد ہیں مجھ پر خود ایک حالت گزری ہے جس میں الفاظ کے اثر کا مجھے پورا مشاہدہ ہوا ہے' ایک بار مجھے سخت مرض ہوا اور ایک حکیم صاحب کے پاس قارورہ بھیجا' انہوں نے قارورہ دیکھ کر یہ کہا کہ اس شخص میں تو حرارت غریزیہ نام کو بھی باقی نہیں' یہ زندہ کیسے ہے' قارورہ لے جانے والے نے یہ عقل مندی کی کہ حکیم کا مقولہ مجھ سے آ کر بیان کر دیا جس کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا' میں نے ان کو دھمکایا کہ یہ بات کیا میرے سامنے کہنے کی تھی' تم نے بڑی حماقت کی' جاؤ اس کا تدارک کرو۔ انہوں نے تدارک پوچھا' میں نے کہا کہ مکان سے باہر جاؤ اور کچھ دیر میں آ کر مجھ سے یوں کہو کہ میں پھر حکیم صاحب کے پاس گیا تھا' انہوں نے مکرر دیکھ کر یہ کہا کہ پہلے جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی' حالت اچھی ہے کچھ خطرے کی بات نہیں' وہ کہنے لگے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی سکھلائی ہوئی بات کہوں گا تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے کہا تم خواص اشیاء کو کیا جانو جس طرح میں کہتا ہوں تم اسی طرح کرو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ان لفظوں کے سننے سے میری پہلی سی حالت

نہ رہی بلکہ ایک گونہ قوت طبیعت میں پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علاج سے قوت بڑھتی گئی اور حق تعالیٰ نے پوری شفاء عطا فرمادی تو الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے گو ہماری سمجھ میں نہ آئے' اطباء سے پوچھو کہ خفقان میں کہربا کی تعلیق کیوں مفید ہے؟ وہ اس کی وجہ بجز تجربہ کے کچھ نہیں بتلا سکتے۔

نسبت واضافت کا اثر

اسی طرح اہل طریق کوکلمات والفاظ کے اثر کا تجربہ ہو چکا ہے مگر ان کے تجربہ کو اہل ظاہر نہیں جانتے شاید کسی مولوی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے الفاظ سے تسلی کرنا تو جائز نہ تھا کہ شیطان بھی تو اسی کا ہے نسبت پھر بھی باقی ہے کیونکہ اس سے کفار بھی اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ فوری علاج سنکھیا سے بھی کیا جاتا ہے پھر بعد میں سنکھیا کی سنبھال کر لیتے ہیں۔ اس کو بھی اطباء جانتے ہیں اور اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ بعض دفعہ اس کی یہی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے تم اس میں اضافت تشریفیہ کیوں لیتے ہو اور خواہ مخواہ اس کو خلاف شرع پر کیوں حمل کرتے ہو' معنی لغوی پر کیوں محمول نہیں کرتے۔ آخر شیطان بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ (یعنی ان کا پیدا کیا ہوا ہے' ان کا بندہ ہے۱۲) بتلایئے اس میں کیا خرابی ہے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہوگا نسبت اور اضافت کا اثر اہل محبت پر کس قدر ہوتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ میرا راستہ ہے اس سے محبت کو ہیجان ہو گیا اور اب موانع کا ارتفاع آسان ہو گیا' اب یہ حال ہوتا جاتا ہے کہ:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شد مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں' دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں)

اور اب عاشق زبان حال سے اور بعض دفعہ زبان قال سے یوں کہنے لگتا ہے:

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے' دل فدا ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنج دینے والا ہے)

بعض سنیاسیوں کے ذکر و شغل کا سبب

''اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا'' (یہ دین کا میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے) کو سن کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہے گا کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بعض سنیاسی ذکر و شغل کرتے ہیں اور لذائذ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا منشاء وہی محبت ہے گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو ذکر الٰہی سے گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں ان کے لیے نجات کا سبب نہ ہو مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ مل جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ. کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اگر ذاکر طالب آخرت ہے تو اس کو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی اور طالب دنیا ہے تو اس کو دنیا میں کیفیات نفسانیہ ذوق و شوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا اجر ہے اسی لیے محقق حضرات نے فرمایا ہے کہ کیفیات نفسانیہ کے درپے نہ ہو کیونکہ وہ تو چٹنی ہے اور چٹنی مطلوب نہیں بلکہ مطلوب غذا ہے۔ اب اگر کوئی چٹنی ہی سے پیٹ بھر لے تو اس کا معدہ خراب ہو جائے گا۔ بس چٹنی کا کام یہ ہے کہ غذا کے ساتھ تھوڑی سی کھالی جائے تاکہ غذا اچھی طرح کھائی جائے۔ میں نے اس کے متعلق ایک فیصلہ کیا ہے جو مختصر ہے۔ گو یہ لفظ دعوے کا ہے مگر میرا مقصود دعویٰ نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے کہ ہم یوں کہتے ہیں کہ میں نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور دعویٰ تو جب ہو کہ یہ فیصلہ میں نے اپنے آپ کیا ہو' نہیں نہیں بلکہ یہ ان حضرات کا طفیل ہے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور طوطا اگر کچھ پڑھنے لگے تو یہ اس کا کمال نہیں بلکہ پڑھانے والے کا کمال ہے تو وہ فیصلہ اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ کیفیات محمود تو ہیں مگر مقصود نہیں اور غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنالینا عصیان باطنی اور بدعت باطنیہ ہے اس لیے ان کے درپے نہ ہو۔ ان کی تمنا نہ کرو' ہاں دعا کا مضائقہ نہیں کیونکہ دعا میں خاصیت یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شکایت و قلق پیدا نہیں ہوتا اور تمنا کے پورا نہ ہونے سے شکایت و قلق ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے امور اختیاریہ و غیر اختیاریہ کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تمنائے موہوب سے ممانعت

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا.

(اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فوقیت بخشی ہے' مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں)

میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہے۔ ایک موہوب جس کو "مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ" (اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے) اور "وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ" (اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو) میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے مکسوب جس کو "لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ" (مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے) میں اکتساب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا کرنا نہ چاہیے نہیں بلکہ مکسوب کا اہتمام وفکر کرنا چاہیے مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اس میں نہی تحریم کے لیے ہے یا کراہت تحریم کے لیے یا کراہت تنزیہ کے لیے اس سے مجھے بحث نہیں عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کر دے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کس قدر ناگوار ہے۔ اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں۔

ہمارے جذبات کی رعایت

اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب کے لیے ان کا دل للچائے گا' ضرور اس لیے دعا کی اجازت دیتے ہیں۔ "وَاسْئَلُوا

اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ‘‘ (اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو) کہ دعا کر سکتے ہو آ گے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے: ’’اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا.‘‘ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لیے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔

یہ تو کیفیات کے متعلق فیصلہ کا ذکر تھا اور اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیفیات کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں تو جو چیز کافر کو بھی حاصل ہو سکے اس کے درپے نہ ہونا چاہیے اور نہ ان کیفیات کے حصول پر اکتفا کرنا چاہیے کیونکہ نجات کا مدار اعمال مکسوبہ ہے۔ ان کیفیات سے قرب ونجات میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی (ہاں یہ ضرور ہے کہ عادۃً عمل مجرد عن الکیفیۃ سے عمل مع الکیفیۃ میں خود شان اکتساب کی زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ اکمل ہونے کے سبب افضل ہوگا۔۱۲) غرض خدا کا راستہ سن کر کفار کو بھی حرکت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک دفعہ کو بے اختیار اس راستہ پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ سے سب کو محبت ہے جس کی وجہ سے جس چیز کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے اس سے بھی محبت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ بس لذت نسبت ہی پر کفایت نہ کرنا بلکہ آگے بڑھو اور کام کرو۔ ’’فاتبعوہ‘‘ کہ اس راستہ کا اتباع کرو اس پر چلو کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو کافر سے نہیں ہو سکتی۔ کیفیات تو کفار کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں مگر صراط خداوندی کا اتباع کافر سے بحالت کفر نہیں ہو سکتا یہ تو تمہید تھی اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں جو مختصر ہی ہے اور مقصود تو ہمیشہ مختصر ہے اور تمہید اس کی بہت ہی ہوتی ہے جیسے روٹی مختصر ہے اور تمہید اس کی بہت لمبی ہے یہ تو حسیات میں ہے اور طریق باطن میں بھی مقصود مختصر اور تمہید مطول ہوتی ہے۔

تمام سلوک کا خلاصہ

چنانچہ مولانا گنگوہیؒ کا ارشاد ہے کہ سلوک کا جو حاصل پندرہ سال کے بعد معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوتا تو اس کے لیے ہم اتنا وقت صرف نہ کرتے' میں نے اپنے دل میں کہا

کہ یہ حاصل پندرہ برس کی محنت سے پہلے معلوم ہی کیوں ہوتا ہے (اور یہ بھی حضرت قدس سرہ کا کمال تھا کہ ان کو پندرہ برس میں خلاصہ معلوم ہو گیا' بہت سوں کو تو تیس اور چالیس سال کے بعد جا کر کہیں مقصود کا پتہ لگتا ہے ۱۲) پس یہ مختصر ایسا ہے جیسے ایک بڑے دفتر حساب کا خلاصہ میزان کل ایک سطر میں لکھا ہوتا ہے کہ کل میزان دس ہزار پانچ سو دس ہے مثلاً یہ لفظ تو ایک سطر سے کم میں بھی آ جائے گا مگر کیا آپ میزان کو بدون تمام دفتر جمع کیے معلوم کر سکتے تھے' ہرگز نہیں' غرض حق تعالیٰ نے یہاں تو صراط کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی اضافت فرمائی ہے: "قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ." (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ یہ (دین) میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہے میں اور جس نے میرا اتباع کیا) اور ایک مقام پر انبیاء و علماء سب کی طرف اس کی اضافت ہوئی ہے۔ "وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ" (اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو) اور ایک مقام پر خود سالک کی طرف اضافت کی گئی ہے: "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" (جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے) گو یہ اضافت صریح نہیں مگر سالک کو اس طریق کے ساتھ تلبس ہونے پر یہ آیت ضرور دال ہے کیونکہ لفظ سبیل اس میں اتخذ مفعول بہ ہے اور فاعل سالک ہے اور متخذ و متخذ میں تلبس ضرور ہوتا ہے اور اضافت سے میری یہی مراد ہے' اضافت نحویہ مراد نہیں۔

اضافات متعددہ کی شان

اب ان اضافات متعددہ کے اسباب سنئے' حق تعالیٰ کی طرف تو اس طریق کی اضافت اس لیے ہے کہ وہ واضع طریق ہیں اور منتہائے طریق ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لیے ہے کہ آپ داعی اور مبلغ ہیں اور یہی وجہ نسبت الی العلماء کی ہے اور سالک کی طرف اضافت کا منشا یہ ہے کہ وہ طالب سبیل ہے اور فقہاء نے اصول میں بیان فرمایا ہے کہ جہاں ایک چیز دو کی طرف منسوب ہو وہاں ان دونوں چیزوں میں غایت تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اصولیین نے حرمت مصاہرت کے مسئلہ میں اس کی تقریر کی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ ولد

منسوب ہے واطی اور موطو کی طرف اس لیے کہ ان دونوں میں تعلق قوی ہو گیا' پس دونوں کے اصول وفروع ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے تو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ سبیل حق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ غایت تعلق مع الرسول کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو بہت تعلق ہے اور منشاء اضافت الی الرسول کا یہ ہے کہ آپ داعی الی طریق اللہ ہیں جس کی طرف ''ادعوا الی اللّٰہ'' (میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں) میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے۔ مگر بواسطہ رسول کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلاواسطہ ہے پس واسطہ اور بلاواسطہ کا فرق ہے مگر نفس نسبت مشترک ہے تو قاعدہ مذکورہ بالا کے موافق یہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ نسبت مشترک اور سالک کی طرف بھی اس کی اضافت ہے تو جو اس راستہ پر چلنا شروع کرتا ہے۔

اتباع علماء کی ضرورت

اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص تعلق ہو جاتا ہے جب یہ سمجھ گئے تو اب سنو! کہ مجھے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے جس کا حاصل یہ شعر ہے:

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش از چراغ

(موسم گل ختم ہو گیا اور چمن اُجڑ گیا' گلاب تو ہے نہیں جس سے اس کی بو حاصل ہو چونکہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا' اب اس کی جگہ چراغ ہی کافی ہے اس کے بغیر اور چارہ کیا ہے)

یعنی اس وقت مجھے علماء کی شان بیان کرنا اور ان کا درجہ بتلانا ہے جو اس اضافت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو شخص اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے اس کے لیے بجز اتباع علماء کے کوئی صورت نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی حیات ہی ہے مگر حیات صوریہ کے مقابلہ میں اس کو وفات کہنا ضرور صحیح

ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ حی لایموت ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے بجز انبیاء علیہم السلام کے بلاواسطہ کوئی مستفید نہیں ہوسکتا اور ہم تو صحابہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بلاواسطہ مستفید نہیں ہوسکتے تو اب بجز اتباع علماء کے ہمارے لیے دین پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔

آج کل کے حضرات مدعی اجتہاد کے احوال

مگر حالت یہ ہے کہ بہت لوگوں کو اتباع علماء سے آج کل عار ہے بلکہ بعض کو تو اتباعِ آئمہ سے بھی عار ہے۔ آج کل بعض لوگوں کو مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ پڑھ کر اجتہاد کا دعویٰ ہے مگر اس اجتہاد کی حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث تنہا نماز پڑھتے تو سکون سے پڑھتے اور امامت کرتے تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھتے' کسی نے ان کو ٹوکا کہ تم امامت کے وقت اس قدر کیوں ہلتے ہو تو کہا حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کا ترجمہ نکال کر لائے جس میں "من ام منکم فلیخفف"[1] کا ترجمہ لکھا تھا جو شخص امام بنے وہ ہلکی نماز پڑھے' مجتہد صاحب نے ہلکی کو ہل کے پڑھا اور نماز میں ہلنے لگے۔ صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج کل دعویٰ اجتہاد وہی کرتا ہے جس کو علم سے مس بھی نہیں ورنہ صاحب علم کبھی دعویٰ اجتہاد نہیں کرسکتا کیونکہ جب کمال علم حاصل ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاہل ہیں۔ چنانچہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ عمر بھر پڑھنے پڑھانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم جہل مرکب سے جہل بسیط میں آ گئے۔ بھلا ایسا شخص دعویٰ اجتہاد کیوں کرسکتا ہے۔ بس مدعی وہ لوگ ہیں جن کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی ان کو اجتہاد کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔

اجتہاد امر ذوقی ہے

ایک صاحب نے ریل میں مجھ سے سوال کیا تھا کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ تم اس کی حقیقت اصطلاحی الفاظ میں تو کیا سمجھو گے' میں ایک مثال سے اس پر تنبیہ کیے دیتا ہوں' بتلاؤ اگر دو شخص سفر میں ہوں اور صبح کی نماز کا وقت آئے اور پانی موجود نہ ہو اس لیے دونوں کو تیمم کرنا پڑے مگر ایک نے تو وضو کا تیمم کیا' دوسرے نے بوجہ رات کو احتلام

---

[1] (مسند احمد ۴: ۱۱۹)

ہو جانے کے غسل کا تیمّم کیا تو ان دونوں میں سے امام کون بنے اور کس کی امامت افضل ہے؛ کہا کہ اس شخص کی جس نے وضو کا تیمّم کیا ہے کیونکہ طہارت تو دونوں کو برابر حاصل ہے اور حدث ایک کا اصغر ہے اور دوسرے کا اکبر اس لیے وضو کے تیمّم والے کی طہارت اقویٰ ہے۔ میں نے کہا یہ تو تمہارا اجتہاد ہے۔ اب سنو فقہاء نے تیمّم غسل والے کو امامت کے لیے افضل فرمایا ہے وہ یہ بات سن کر بڑے حیران ہوئے اور وجہ پوچھنے لگے کہ فقہاء نے یہ بات کہاں سے فرمائی۔ میں نے کہا کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ جب پانی موجود نہ ہو تو تیمّم طہارت کاملہ ہے حدث اکبر کے لیے بھی اور حدث اصغر کے لیے بھی۔ جب تیمّم طہارت کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمّم کیا ہے وہ افضل ہے کیونکہ نائب اکمل کا اکمل ہے اس لیے غسل والے کا تیمّم اکمل ہے (اسی طرح عطاء ابن ابی رباح سے سوال کیا گیا کہ عورتیں اگر باہم جماعت کریں تو امامت کے لیے ان میں کون افضل ہے: فرمایا کہ جو حاملہ ہو "**لکون طهرها اکمل من طهر غیر الحامل لبرائتها من الحیض مادامت حاملاً**" یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دے سکتا) اس دلیل کو سن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات کا کام تھا۔ صاحبو! تم جب چاہو امتحان کرلو کہ حدیث سے بیس احکام تم مستنبط کرو اور وجہ استنباط پیش نظر رکھو پھر ان احکام کے متعلق فقہاء کا کلام اور ان کا استدلال معلوم کرو تو واللہ خود قسم کھا کر کہو گے کہ فقہاء حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔

عمل بالحدیث کا مفہوم

اہل حدیث کو فقہاء پر یہ اعتراض ہے کہ یہ احادیث کے خلاف مسائل بیان کرتے ہیں؛ میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی اگر عمل بکل الحدیث ہے تو اس معنی کے تو تم بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ بہت سی احادیث کو جو حنفیہ کے موافق ہیں تم چھوڑتے ہو اور اگر اس کے معنی عمل ببعض الحدیث ہیں تو اسی معنی کے ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمہارے دلائل بخاری و مسلم میں ہیں اور ہمارے دلائل مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں ہیں وہ بخاری مسلم کے بھی استاد اور استاد الاستاد ہیں۔ گو شاگرد زیادہ مشہور ہو جائے پھر اس کی کیا وجہ کہ تم آئمہ فقہاء کو حدیث کا مخالف کہتے اور ان پر طعن

کرتے ہواور دراصل ہم کو غیر مقلدوں سے اسی کی زیادہ شکایت ہے کہ وہ ہمارے آئمہ کو برا کہتے ہیں اگر وہ آئمہ کو برا نہ کہیں تو تقلید یا ترک تقلید سے ہم کو زیادہ بحث نہیں یہ تو ہر شخص کا خدا کے ساتھ اجتہادی معاملہ ہے خواہ تقلید سے خدا کو راضی کر لے یا ترک تقلید سے۔ ہمارا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ہم بدون تقلید کے دین پر عمل نہیں کر سکتے' اگر کسی کا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ترک تقلید سے بھی دین پر عمل ہو سکتا اور خدا راضی ہو سکتا ہے تو اس کو اختیار ہے ہم اس کے ساتھ نہ الجھیں گے مگر اس کی کیا وجہ کہ وہ مقلدوں سے الجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آئمہ کو برا کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کے آئمہ کو برا نہیں کہتے بلکہ ہم تمام محدثین کو بھی اپنا امام سمجھتے اور ان کی عظمت کرتے ہیں اور کسی کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتے۔

مدعیان عامل بالحدیث کو دو نصیحتیں

ایک دفعہ قنوج گیا تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی' حنفیوں نے تو مجھے منع کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار کہیں سنکھیا نہ دیدیں مگر میں نے دعوت قبول کی اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمک خوار ہو گیا ہوں اس لیے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہو گئی۔ اس خیر خواہی کی بناء پر میں آپ کو دو نصیحت کرتا ہوں ایک یہ کہ بدگمانی نہ کرو' دوسرے یہ کہ بدزبانی نہ کرو' غیر مقلدوں میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں۔ اسی وجہ سے وہ آئمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک تاویل و قیاس کے معنی مخالفت حدیث ہیں۔ گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہو۔

ایک عامی کا عجیب استدلال

ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بناء پر سخت الزام دیا۔ ان سے پوچھا کہ "من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر" کے کیا معنی ہیں' کہا کہ معنی کیا ہوتے۔ تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے' عامی نے کہا کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں ہے کہ "لاصلوٰۃ لمن لم یقر ابام الکتاب"[1] (جو شخص سورۃ الفاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں) تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اس میں کچھ تاویل

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۱۹۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۸۲۲)

نہیں تارک صلوٰۃ ہوئے اور تارک صلوٰۃ کافر ہے تو کیا حنفی سب کافر ہیں۔ جناب وہ عالم دم بخود ہو گئے اور ایسے خاموش ہوئے کہ کچھ جواب نہ بن پڑا کیونکہ وہ محض اس بات پر ان کی تکفیر نہیں کرتے پس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کر سکے کیونکہ تاویل اور قیاس کرنا ان کے نزدیک شرک وکفر میں داخل ہے مگر عامی نے ان کو الزام دے کر بتلا دیا کہ بدون تاویل وقیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک عامی لوہار تھا۔ غرض مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور بات ہے مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان کریں تو حقیقت معلوم ہو جائے وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھول کر رکھ دے گا اور ان سے اقرار کرائے گا کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را　　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ اصلی ہے یا نہیں، چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہو سکتا)

شاہد آں نیست کہ موے ومیانے دارد　　　بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ وہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

اجتہاد ایک خاص آن ہے جو امر ذوقی ہے محض کتابوں کے یاد کر لینے کا نام اجتہاد نہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست　　　نہ ہر کہ سر بتراشید قلندری داند

(جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرے لازم نہیں کہ وہ دلبری جانتا ہو اور جو شخص آئینہ بنانا جانتا ہو لازم نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو اس میں بال سے زیادہ باریکیاں ہیں جو شخص سر منڈ والے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

البتہ دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے ایک طب باطنی میں ایک ظاہری میں جو شخص ان میں مجتہد نہ ہو اس کو علاج کرنا جائز نہیں۔

علماء کو احکام شریعت کے دلائل و حکم بیان نہ کرنے کی ضرورت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل عوام کو اتباع علماء سے عار ہے۔ حتیٰ کہ بعض کو آئمہ کے اتباع سے بھی عار ہے مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا کا راستہ بدوں اتباع علماء و اتباع آئمہ کے نہیں مل سکتا' عوام اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے طریقہ یہی ہے کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر ان کا اتباع کریں۔ ان کو علماء سے دلائل و حکم دریافت کرنے کا حق نہیں' صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے اور علماء کو بھی چاہیے کہ عوام کے سامنے دلائل و حکم بیان نہ کیا کریں۔ میرا یہی طرز ہے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے' سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی' میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا۔ جنایت و عقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا' میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے آپ بدون علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھئے' کہا اس میں ایک نفع ہے میں نے کہا وہ کیا' کہا زیادت اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد: وَلٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ. (اور لیکن میرے دل کے اطمینان کے لیے) میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی وہ آپ کو بھی نافع ہو' بس اس پر وہ خاموش ہو گئے' علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیے کہ دلائل و حکم و اسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں اس سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ پھر وہ کوئی حکم بدون علت و حکمت معلوم کیے بغیر قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی علل و حکم دقیق ہوتی ہیں' عوام بیان کے بعد بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت و حکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ عوام کے سامنے صرف احکام بیان کیے جائیں یہ تو علماء کا کام ہے اور عوام کا فرض یہ ہے کہ علماء کا اتباع کریں خود اجتہاد نہ کریں ان سے احکام دریافت کریں' علل و حکم دریافت نہ کریں۔

بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے

علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ جس کے سر پر بڑے موجود ہوں اس کو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیے بلکہ جہاں تک ہو اپنے کو گم کرو، گمنامی میں رہو کیونکہ بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے اور شہرت سے دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

خویش را رنجور ساز د زار زار　　　تاترا بیروں کنند از اشتہار

اشتہار خلق بند محکم است　　　بند ایں از بند آہن کے کم است

چشمہاؤ خشمہاؤ اشکہا　　　برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے، یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے، غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

یعنی اشتہاری آدمی مجرم ہوتا ہے (یہ لطیفہ ہے) یہ تو آج کل قانون بھی ہے۔ پس سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹے بن کر رہو اس میں دین کی بھی سلامتی اور دنیا کی بھی اور جس کے سر پر کوئی بڑا نہ ہو اس کے لیے میں دوسرا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس کے مستحسن ہونے پر قسم کھا سکتا ہوں وہ یہ کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرے۔ ان شاء اللہ غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد میں ایک نئی بات کہتا ہوں جو اکثر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے کہ مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت کا حق نہیں، اگرچہ دوسری شق بھی مباح ہو کیونکہ مرید کا تعلق شیخ سے استاد شاگرد جیسا نہیں ہے بلکہ اس طریق میں مرید شیخ کا معاملہ ایسا ہے جیسے مریض اور طبیب کا معاملہ ہے کہ مریض کو فتوئی طبیب کی مخالفت جائز نہیں ایسے ہی یہاں مرید مریض ہے اور شیخ طبیب ہے اس لیے مرید کو شیخ کی مخالفت جائز نہیں، وہاں دوسرا شیخ اس شیخ کے اجتہاد سے مزاحمت کر سکتا ہے جیسے ایک طبیب دوسرے طبیب سے مزاحمت کر سکتا ہے مگر مرید تو تربیت میں طبیب نہیں اور جب تک طبیب نہیں اس وقت تک مریض ہے۔ پس اس کے ذمہ اتباع قول طبیب لازم ہے ہاں یہ شرط ہے کہ اس کا قول خلاف شریعت نہ ہو۔ اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو مخالفت جائز بلکہ لازم ہے مگر ادب کے ساتھ (گو واقع میں خلاف شریعت نہ ہو مگر یہ تو اپنے علم کا مکلّف ہے ۱۲)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا ذوق

جیسے حضرت سید صاحب بریلوی کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصور شیخ تعلیم فرمایا تو سید صاحبؒ نے اس سے عذر کیا کہ مجھے اس سے معاف فرمایا جائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(امر مباح جو بظاہر شریعت کے خلاف ہونے سے منکر معلوم ہوتا ہے اگر مرشد بتلائے تو اس پر عمل کرتے)

سید صاحب نے عرض کیا کہ مے خواری تو ایک گناہ ہے۔ آپ کے حکم سے میں اس کا ارتکاب کرلوں گا پھر توبہ کرلوں گا مگر تصور شیخ تو میرے نزدیک شرک ہے اس کی کسی حال میں اجازت نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ جواب سن کر سید صاحب کو سینہ سے لگالیا کہ شاباش جزاک اللہ تم پر مذاق توحید واتباع سنت غالب ہے اب ہم تم کو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے۔ تصور شیخ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر سبیل حق منقطع نہیں ہوا۔ اس کو علماء سے معلوم کرو اور یہ رحمت ہے کہ نبوت ختم ہوگئی ورنہ انکار نبوت سے کفر لازم آجاتا اور بہت سے مسلمان نبیؐ کے انکار سے کافر ہو جاتے' اب کفر سے تو بچ گئے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی امتی کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا ہاں گناہ لازم آئے گا اگر علماء ومجتہدین سے مخالفت ومنازعت کی گئی ہے۔

مجتہدین کا وجود رحمت خداوندی ہے

صاحبو! مجتہدین کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہے کہ ان حضرات نے محنت کر کے احکام دین کو مدون کیا اور ہم کو پکی پکائی روٹی ملی ہے مگر بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم تو خود ہی پکا لیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پکا کر دیکھ لو' پھر دونوں کا موازنہ کرلو' خود فرق واضح ہو جائے گا' پس اجتہاد نہ کرو بلکہ اہل اجتہاد کا اتباع کرو۔ مجتہدین فی الاحکام الظاہرہ کا بھی اور مجتہدین فی الاحکام الباطنہ کا بھی تو یہ سبیل حق قیامت تک بواسطہ علماء کے باقی رہے گا جو اتباع

علماء ہی سے آپ کو مل سکتا ہے۔ بدون اس کے راستہ نہیں مل سکتا۔ مقصود تو ختم ہو گیا اب ایک بات باقی رہی کہ اس سبیل کی اضافت سالک کی طرف جو کی گئی ہے یہ باعتبار غایت ہونے کے ہے کیونکہ یہ اس کا مقصود ہے، سالک نہ اس کا موجد ہے نہ مبلغ وداعی ہے نہ داعی کا وارث ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو علماء سے خاص تعلق ہے۔ پس علماء کو چاہیے کہ وہ بھی حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کریں تاکہ فیض میں برکت ہو، محض تعلق علم کافی نہیں بلکہ تعلق عملی وحالی کی ضرورت ہے اور عوام کو علماء سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیے، یعنی تعلق اتباع کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بواسطہ علماء ہی کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ وقت زیادہ نہیں ہے جن حضرات کی فرمائش سے یہ بیان ہوا ہے وہ اسی ریل سے جانے والے ہیں اور اب ریل کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین.

اسباب الفضائل

فضائل دینیہ کے طالبین کی اصلاح کے متعلق جامع مسجد دیو بند میں ۹ صفر ۱۳۳۴ ہجری یوم جمعہ سوا دو گھنٹہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جسے مولانا محمد عبداللہ صاحب نے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۱۵۰۰ تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٰات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِمَّا اکْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوْا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا.(النساء آیت نمبر ۳۲)

ترجمہ: (اورتم اپنے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے' مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔)

فضائل دینیہ سے متعلق اغلاط العوام

یہ ایک آیت ہے سورہ نساء کی جس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے بعض ان غلطیوں کی اصلاح فرمائی ہے جو فضائل دینیہ کے مختلف لوگوں کو واقع ہو جاتی ہیں۔ یہ خلاصہ اور حاصل ہے اس آیت کا اور وہ غلطیاں مختلف ومتعدد ہیں اور ان کے تعدد کی وجہ سے لوگوں کے متعدد طبقے ہیں۔ اول طبقہ تو وہ ہے کہ جن کو فضائل کا اہتمام ہی نہیں اور نہ ان کے حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں اور وجہ اس عدم اہتمام کی یہ ہے کہ فضائل دینیہ کو فضائل میں شمار ہی نہیں کرتے۔ اس لیے ان کو وہ مطلوب ہی نہیں اور ان سے بڑھ کر وہ طبقہ ہے جو فضائل دینیہ کو (نعوذ باللہ) فضول سمجھتے ہیں بلکہ طالبات فضائل کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ بکثرت ایسے

لوگ بھی اہل اسلام میں موجود ہیں۔ الحمدللہ اکثر تو نہیں ہیں اور خدا تعالیٰ وہ دن نہ کرے کہ اکثر ہوں لیکن کثیر ضرور ہیں اور منشاء ان کے تمسخر اور فضول سمجھنے کا یہ ہے کہ وہ دنیا کی اس درجہ پرستش کرتے ہیں کہ اسی کو اپنا قبلہ توجہ بنالیا ہے اس لیے وہ دین اور فضائل دینیہ کے طالبوں سے تمسخر کرتے ہیں اور عام صلحاء سے گذر کر علماء سے استہزاء سے پیش آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان علماء ہی نے مسلمانوں کی راہ ماری ہے ان سے جب سنا جاتا ہے دین ہی کا سبق سنا جاتا ہے دنیا کی ضرورت سے یہ بے خبر ہیں کبھی ان سے دنیا کے متعلق کوئی مضمون ہی مسموع نہیں ہوتا حالانکہ اگر دنیا نہ ہوتو یہ لوگ جو مفت کی روٹیاں کھار ہے ہیں یہ ان کو کہاں سے ملے' کس قدر کم عقل ہیں کہ جس درخت پر بیٹھے ہیں اسی کی جڑ کاٹتے ہیں ان سے زیادہ احمق کون ہوگا اور کہتے ہیں کہ ان کے وجود سے کوئی نفع نہیں بلکہ ضرر ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کو انہوں نے بند کر دیا ہے ہم کو اس طبقہ سے مفصل گفتگو کی ضرورت نہیں اس لیے مفصل دلائل عقلیہ کی ضرورت تو اس وقت ہو جبکہ یہ کتاب وسنت کو نہ مانتے ہوں اور جبکہ مسلمان ہیں اور کتاب وسنت کے معتقد ہیں اس لیے ہم کو وہ آیات یا احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جو ان کے دعوے کے صریح معارض ہیں ہاں جو اس میں واقعی شبہات پیدا ہوں ان کا دفع کرنا ہمارے ذمہ ضروری ہے باقی عناد کا جواب بجز اس کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے کہ "لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ." (ہمارے عمل ہمارے لیے اور تمہارے عمل تمہارے لیے) بہرحال اس وقت ہم کو ردوقدح کی ضرورت نہیں۔

دنیا کی ضرورت بدیہی ہے

مختصر طور سے غافل کو یہ کافی ہے کہ غور کرنا چاہیے کہ ان حضرات کا طعن اور استہزاء علماء ہی تک محدود نہیں رہتا' اس کی نوبت تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر بحکم الٰہی مخلوق کو دین کی طرف بلایا ہے اور دنیا اور اہل دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور دنیا کے کام جو تبعاً واضطراً لذ الذین کیے ہیں سو یہ امر آخر ہے گفتگو تو اس میں ہے کہ دنیا کی طرف ترغیب دینا سو یہ کبھی کسی نبی نے نہیں کیا اور دنیا کی طرف ترغیب دینے کی ضرورت بھی نہیں اس کی طرف تو پہلے سے رغبت موجود ہے فطری

طور سے ہر شخص بلکہ ہر ذی روح کھانے پینے کی ضرورت کا احساس کرتا ہے سو جو امر ایسا ہو کہ اس کی طرف فطری طور سے انجذاب ہو اس کی طرف کیا ضرورت ہے کہ انبیاء و علماء و مصلحین قوم ترغیب دیں۔ ہر وقت ہر آدمی کے اندر دو واعظ ایسے ہیں کہ جو اس کی طرف مائل کرتے ہیں جس میں ایک کا نام پیٹ ہے اور دوسرے کا نام پیٹھ ہے یہ دو واعظ ایسے ہیں جو ہزاروں واعظوں کا مقابلہ کرتے ہیں پس جو شے اتنی بدیہی ہو انبیاء کو کیا ضرورت ہے کہ اس کے اندر اپنا وقت ضائع کردیں اور قطع نظر اس کے کہ دنیا کی ضرورت محسوس ہے یا نہیں اور اس کی ترغیب کی ضرورت ہے یا نہیں۔

حضرات انبیاء کی بعثت کی غرض

آپ غور فرمائیے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کس لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف الانبیاء ہیں، کوئی کمال انبیاء سابقین میں ایسا نہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ ہو۔ آپ کی بعثت کی غرض کو بیان کردینا گویا سب انبیاء کی بعثت کی غرض کو بیان کردینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تشریف آوری کی غرض قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمائی:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.

(یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا مومنین پر جبکہ بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ پڑھتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور پاک کرتے ہیں ان کو اور سکھلاتے ہیں ان کو کتاب اور حکمت اور بیشک تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں) اس آیت سے معلوم ہوا کہ فرض منصبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محض دین تھا۔

دنیا کی ترغیب علماء کے ذمہ نہیں

اور علماء ورثۃ الانبیاء ہوتے ہیں پس آپ کے ورثہ سے اس کے خلاف کی کیسے توقع ہوسکتی ہے اور اگر وہ ایسا کریں تو وہ سچے وارث نہیں ہیں اور اس سے بڑھ کر میں عرض کرتا ہوں

کہ جو حضرات علماء کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ دنیا کی ترغیب دیں اگر خدانخواستہ علماء ان کی رائے کے موافق عمل کرنے لگیں تو ذرا اپنے وجدان کی طرف غور کریں کہ ان کے بارے میں کیا فتویٰ ان حضرات کا ہوگا۔ سب سے پہلے یہی حضرات ان علماء سے بداعتقاد ہو جائیں گے، غرباء جو محبِ دین ہیں وہ تو ان علماء کے فعل کو کسی محمل حسن پر بھی محمول کرلیں گے اور تاویل کریں گے کہ میاں کوئی ضرورت دینی ہوگی لیکن یہ حضرات سب سے پہلے مخالف ہوں گے اور کہیں گے کہ میاں ان کو دنیا کے قصوں میں گھسنا کیا زیبا تھا، انہوں نے کیوں خواہ مخواہ اس میں ٹانگ اڑائی۔ چنانچہ جو عالم اس قسم کے ہیں ان کو لوگ سب کچھ کہتے ہیں اور سارا اعتقاد رخصت ہو جاتا ہے علم و فضل کا اقرار اسی شخص کا کرتے ہیں جس کو سمجھتے ہیں کہ دنیا سے اس کو کم تعلق ہے، مسائل کی تحقیق کا جب وقت آتا ہے تو اسی عالم کی طرف رجوع کرتے ہیں جو تارک الدنیا ہو اور جو عالم اہل دنیا سے ملتا ہو اور دنیوی قصوں میں دخیل ہو اس کا اعتبار نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ میاں وہ تو دنیا دار ہیں اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس مسلک کو وہ خود اپنے برتاؤ سے مذموم سمجھتے ہیں علماء کو اس کی طرف بلانا چاہتے ہیں۔

علماء کی اصل ذمہ داری

پس علماء کا کام صرف دین کی ترغیب دینا اور دنیا میں انہماک سے بچانا ہے، ان کا یہی بڑا احسان ہے کہ اگر کسی کو راغب الی الدنیا دیکھیں تو اس کو مانع نہ ہوں۔ علماء پر اس اعتراض اور رائے دینے کی میں نے ایک مثال تجویز کر رکھی ہے کہ جس کو میں نے پہلے بھی متعدد بار بیان کیا ہے اس مثال سے یہ مضمون خوب منقح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مریض جو سالہا سال سے مرض دق میں مبتلا ہے لیکن ابھی تک لاعلاج نہیں ہوا، معالجہ کی غرض سے مثلاً حکیم محمود خان کے پاس دہلی گیا اور حکیم صاحب کا مکان تلاش کر کے ان کی خدمت میں پہنچا۔ حکیم صاحب کو نبض دکھائی۔ انہوں نے نسخہ لکھ دیا، جب نسخہ لے کر ان کے مکان سے نکلا تو دیکھا کہ ان کی دہلیز میں ایک چمار بیٹھا جوتی سی رہا ہے، چمار نے پوچھا کہ کیوں میاں کہاں گئے تھے، مریض نے کہا کہ میں بیمار ہوں حکیم صاحب سے نسخہ لکھوا کر لایا ہوں، چمار نے کہا حکیم صاحب نے نسخہ تو لکھ دیا اور تم کو یہ رائے نہ دی کہ تمہاری جوتی پھٹ رہی ہے اس کو سلوا

لؤ حکیم صاحب کو اتنی عقل نہیں کہ جوتی سلوانے کی رائے دیتے، معلوم نہیں کہ یہ حکیم کیوں بنے ہیں جن کو اس کی ضرورت کا بھی احساس نہیں۔ پس جن حضرات کے نزدیک اس چمار کی رائے صحیح ہے وہ تو ہمارے مخاطب نہیں اس لیے کہ جو اتنے احمق ہیں کہ اس چمار کے اعتراض اور رائے کو صحیح بتارہے ہیں وہ قابل خطاب نہیں ہیں ان سے گفتگو کرنا لا حاصل ہے اور یہ رائے چمار کی غلط ہے تو بس ہمارے پاس سے ایک بہت اچھا جواب الزامی حاصل ہو گیا کہ جیسے آپ اس چمار کو یہ جواب دیں گے کہ حکیم صاحب کا یہ فرض منصبی نہیں ہے کہ جوتی سلوانے کی ترغیب دیں اور اگر حکیم صاحب جوتی کے متعلق کچھ نہ کہیں تو ان پر بالکل الزام نہیں ہے ان پر تو الزام جب ہے جبکہ وہ جوتی سلوانے سے منع کریں بلکہ اگر وہ اس کی ترغیب دیں تو ان پر اعتراض ہے کہ انہوں نے اپنا فرض منصبی چھوڑ کر دوسرا کام کیوں کیا۔ ایسے ہی ہم ان حضرات کو جواب دیں گے کہ علماء اطباء روحانی ہوتے ہیں ان کا فرض منصبی دین کی ترغیب ہے اگر دنیا کے متعلق یہ کچھ بولیں تو ان کا منصب نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ دنیا کی تحصیل سے منع کریں تو بیشک ان پر الزام ہے اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو ایسے علماء بہت دیکھے ہیں کہ تحصیل دنیا سے منع کرتے ہیں چنانچہ اگر کسی تجارت کی صورت کے متعلق ان سے دریافت کیا جائے تو لایجوز اگر کسی نوکری کو پوچھا جائے تو لایجوز جواب ملتا ہے۔ غرض انہوں نے بجز لایجوز کے کوئی سبق نہیں پڑھا ہے اس کا جواب بھی اس مثال میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اگر وہ چمار جوتی ایسی طرح سیئے کہ پاؤں کو بھی جوتی کے ساتھ سی رہا ہو اور پاؤں کیلیں لگا دینے کی وجہ سے بے حس ہو رہا ہو اس لیے اس کو الم محسوس نہیں ہوتا تو اس وقت حکیم صاحب کہیں گے کہ کم بخت تو کیا کر رہا ہے اس وقت تو بوجہ بے حس ہونے کے الم نہیں معلوم ہوتا لیکن یاد رکھ کہ زخم پڑ جائے گا اور پلیوں دوڑ جائے گی اور اس وقت اگر حکیم صاحب نہ بولیں گے تو ان پر الزام ہے اسی طرح علماء جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کمانے میں دین کا فساد ہے تو وہ ضرور ایسی دنیا سے منع کریں گے اور اگر حدود کے اندر رہ کر دنیا حاصل کریں گے تو اجازت دیں گے ورنہ وہ یہ کہیں گے:

مبادا دل آں فرو مایہ شاد ۔۔۔ کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(ایسے کمینے اور کم ظرف کو کبھی خوشی حاصل نہ ہو جو دنیا کے لیے اپنا دین برباد کر دے)

الحاصل بعض حضرات وہ ہیں جن کو فضائل دینیہ کا انکار ہے لیکن یہ لوگ تعداد میں طبقہ اولیٰ سے کم ہیں اور طبقہ اولیٰ گو منکر تو نہیں ہیں لیکن کالمنکر ہیں انکار اور اعتراض اس درجہ کا نہیں ہے مگر حالاً منکر ہیں کہ ان کو اہتمام کسی درجہ میں ان کی تحصیل کا نہیں ہے۔

معاصی کی تاویل امر قبیح ہے

دوسرا طبقہ وہ ہے کہ جس وقت ان کے سامنے فضائل دینیہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو متاثر ہوتے ہیں' گردنیں جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا کہیں دنیا میں ایسے پھنسے ہیں کہ خلاصی نہیں ہوتی' انہوں نے اپنا لقب سگ دنیا اور گنہگار رکھا ہے یہ پہلو سے اچھے ہیں اپنے گناہوں کا ان کو اعتراف تو ہے ان سے امید ہے کہ کبھی نہ کبھی توبہ کی توفیق ہو جاوے گی' مجھے اس کی شکایت ہے اور بارہا یہ مضمون بیان کیا ہے کہ صاحبو! اگر آپ سے معاصی چھوٹ نہیں سکتے اور یہ سمجھ رہے ہو کہ ان کے ترک میں ہماری دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں جیسے رشوت وغیرہ تو خدا کے لیے اتنا تو کرو کہ ان کو حرام اور گناہ اور اپنے آپ کو گنہگار مبتلا تو سمجھو اس میں تمہارا کوئی دنیا کا حرج نہیں ہے جو اغراض اور حاجات تم گناہوں میں سمجھ رہے ہو وہ جس طرح ان کو بدون گناہ سمجھے پوری ہو رہی ہیں۔ اسی طرح ان کو گناہ سمجھ کر کرنے میں بھی پوری ہوں گی۔ مثلاً رشوت کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ اگر نہ لیں گے تو کام نہ چلے گا اس لیے کہ پچاس کا خرچ ہے اور دس کی آمدنی ہے تو یہ خیال اگرچہ غلط ہے اس لیے کہ حلال کی آمدنی میں حق تعالیٰ وہ برکت عطا فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سے کام بن جاتے ہیں اور تمام روپیہ اپنے ہی کام آتا ہے اور حرام کی آمدنی میں ایسی بے برکتی ہوتی ہے کہ باوجود کثرت ظاہری کے روپیہ ضائع ہوتا ہے اور حاجتیں باقی رہ جاتی ہیں ہم نے بہت دیکھا ہے کہ ایسے لوگوں کا روپیہ اکثر ان کے کام نہیں آتا لیکن ہم نے تسلیم کر لیا کہ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا ہے لیکن اس کو حرام سمجھنے سے تو کوئی کام بند نہیں ہوتا' آپ لیتے رہیں مگر ساتھ ہی اس کے اس کو گناہ اور اپنے کو عاصی اور نافرمان بھی سمجھو' اس کے حال سمجھنے پر تو کوئی کارروائی موقوف نہیں ہے میں نے ڈھاکہ میں اس مضمون کو بیان کیا تھا وہاں ریش کے دشمن بہت سے مجھ کو نظر آئے' میں نے کہا تھا مجھے آپ صاحبوں سے یہ امید تو ہے نہیں کہ میرے کہنے

سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں گے مگر خدا کے واسطے اس کو حرام تو سمجھو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں تو کہیں ڈاڑھی رکھنے کا حکم آیا نہیں پھر ہم کیوں رکھیں' ان حضرات کا یہ عذر اس وقت مسموع ہوتا جبکہ دلائل شرعیہ قرآن شریف ہی میں منحصر ہوتے۔ قرآن مجید میں بہت سے مسائل منصوص نہیں ہیں۔ آج کل یہ عام عادت ہوگئی ہے کہ ہر مسئلہ کی دلیل قرآن مجید سے مانگتے ہیں اور ہمارے بعض علماء بھی ایسے خلیق ہیں کہ وہ سوچ ساچ کر نکالتے ہیں۔

عوام کا ایک بے جا مطالبہ

یاد رکھو یہ راہ کھولنا سخت مضر ہے اس لیے کہ تم نے بہت عرق ریزی کر کے ان کے ایک سوال کا جواب دیدیا وہ دوسرا سوال کریں گے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ منصوص نہیں ہے تو لامحالہ تم کو کسی نہ کسی مقام پر بلکہ اکثر مواقع میں ساکت ہونا پڑے گا اور اس سکوت کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ مسئلہ شریعت میں ثابت نہیں ہے اور نیز قرآن سے مسائل کو نکالنا اور اس کی کوشش کرنا کہ ہر مسئلہ قرآن سے ثابت ہو در پردہ اس کا دعویٰ ہے کہ دلیل صرف قرآن ہے اور حدیث واجماع امت وقیاس کوئی شے نہیں ہے۔

ادلہ اربعہ

علماء کو چاہیے کہ ایسے لوگوں سے باضابطہ گفتگو کریں اور ادلہ اربعہ میں سے جس دلیل سے وہ مسئلہ ثابت ہو ثابت کریں اور موٹی بات ہے کہ اثبات مدعا کے لیے مطلق دلیل کی حاجت ہے دلیل خاص کی ضرورت نہیں جو دلیل خاص کا مطالبہ کرتا ہے وہ سخت بے ادب اور بارگاہ سے نکال دینے کے قابل ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً عدالت میں کسی شخص کا مقدمہ پیش ہو اور مدعی نے گواہ پیش کیے اور مدعا علیہ یہ کہے کہ اس میں شک نہیں کہ یہ گواہ مجروح نہیں ہیں مگر میں جب تسلیم کروں گا کہ فلاں مولانا صاحب اور فلاں جج صاحب گواہی دیں گے تو حاکم عدالت اس کو جواب دے گا کہ اثبات مدعا کے لیے مطلق گواہ کی ضرورت ہے' خاص گواہ کی ضرورت نہیں۔ جب عدالت نے ان کو گواہ تسلیم کرلیا ہے تو تم کو خاص گواہ کے مطالبہ کرنے کا حق نہیں' اس پر بھی اگر چوں و چرا کرے گا تو سخت بے ادب سمجھا جاوے گا اور کان پکڑ کر نکال دیا جاوے گا۔ بہرحال یہ راہ نکالنا سخت ضرر رساں ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ایک شخص کو ڈاڑھی رکھنے کے لیے کہا' اس نے

یہی کہا کہ قرآن میں ڈاڑھی رکھنے کی نسبت حکم نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے قصہ میں ہے: "لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ"، (تم میری ڈاڑھی مت پکڑو) اگر حضرت ہارون کے ڈاڑھی نہ ہوتی تو کیوں فرماتے، وہ سن کر چپ ہو گیا، میں نے کہا کہ جناب اس سے ڈاڑھی کا وجود ثابت ہوا، وجوب تو نہ نکلا حالانکہ مقصود وجوب کو ثابت کرنا ہے ایسی لچر بات کسی کے مقابلہ میں پیش کرنا مناسب نہیں۔ غرض یہ وطیرہ اختیار کرنا کہ ہر مسئلہ کو قرآن سے ثابت کیا جاوے کسی طرح مناسب نہیں۔ میں یہ قصہ بیان کر رہا تھا کہ میں نے ڈھاکہ میں کہا تھا کہ مجھے یہ توقع تو ہے نہیں کہ آپ حضرات ڈاڑھی رکھ لیں گے لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ ڈاڑھی منڈانے یا کترانے سے مقصود کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ لوگ اس کو تزئین سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تہجین ہے مگر میں نے مانا کہ تزئین ہوتی ہے لیکن حلال سمجھنے کو تزئین میں کوئی دخل نہیں کیا، خوبصورتی اس پر موقوف ہے کہ اس کو حلال بھی سمجھا جاوے، خوبصورتی مزعوم تو حرام سمجھنے کی حالت میں بھی حاصل ہے، صرف فرق اس قدر ہے کہ حلال سمجھنے والے کا دین زیادہ برباد ہوا اور حرام سمجھ کر منڈانے والے کا کم۔ الحاصل یہ دوسرے طبقہ والے طبقہ اولیٰ سے بہتر ہیں کہ بفضلہ تعالیٰ ان کو اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے اور حق کو سن کر متاثر ہوتے ہیں، دو چار آنسو بھی بہا لیتے ہیں لیکن ان کی معراج بس یہاں ہی تک ہے مجلس وعظ ہی تک یہ ندامت مقصود رہتی ہے یہ کبھی نہ ہوگا کہ آئندہ کو ان معاصی کے ترک کا قصد کر لیں اور اعمال صالحہ کے اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیں اور باوجود اعتقاد صحیح ہونے اور کسی وقت ندامت ہونے کے جوان کو ترک معاصی کی ہمت نہیں ہوتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ معاصی میں وہ اپنے نزدیک لطف اور مزہ اور اس کے ترک میں کلفت اور مشقت کا خیال کیے ہوئے ہیں حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔

جملہ معاصی میں سخت کلفت ہے

جس قدر گناہ ہیں ان کے نہ کرنے میں اس قدر تکلیف نہیں جس قدر کہ ان کے کرنے میں ہے نہ کرنے سے تو تھوڑے دنوں کی کلفت ہے اور اس کے بعد حلاوت ہی حلاوت ہے اور کرنے سے فوراً تو کوئی حظ ہوتا ہے اس کے بعد روح کو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ جس نے اول بار کوئی گناہ کیا ہو اور اس سے پہلے اس گناہ کا وہ شخص مرتکب نہ ہوا ہو وہ اس کو خوب سمجھ سکتا ہے کہ پہلے میرے اندر کیا تھا اور اب کیا ہوگا۔ واللہ وہ اپنے اندر سخت کدورت محسوس کرے گا اور اپنے کو سخت لعنت ملامت کرے گا اور اپنی موت کو زندگی پر ترجیح دے گا

باقی ہم لوگوں کو تو اس لیے احساس نہیں رہا کہ گناہ کرتے کرتے قلب کا احساس باطل ہو گیا ہے اس لیے گناہ کے اندر جو کلفت اور کدورت ہے وہ محسوس نہیں ہوتی جس نے آنکھ کھول کر کبھی راحت حقیقی نہ دیکھی ہو اس کو تکلیف کا احساس نہ ہوگا لیکن اگر آپ اس کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک طریقہ ہے کہ جس کو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس سے چالیس روز مستعار لے لو اور ان دنوں میں اس سے صلح کر لو اور اس کو کہو کہ صرف ان چالیس روز کے لیے تو معاصی کو چھوڑ دے اور اطاعت اختیار کرے، اس کے بعد پھر تجھ کو آزادی ہے اور یہ چالیس روز اس طرح گزار دو کہ کسی قسم کی معصیت اس میں سرزد نہ ہو، فضول کلام، غیبت، فضول میل جول بدنگاہی غرض تمام گناہوں کی چالیس دن کے لیے تعطیل کر دو لیکن بداعتقادی کے ساتھ نہیں میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اعتقاد ایسا کرو یعنی یہ اعتقاد کہ اس سے نورانیت ہو گی بلکہ ذہن دونوں امر سے خالی کر لو۔ جب یہ چالیس دن اس حالت سے گزر جاویں اس کے بعد اندازہ کر لو کہ ہمارے قلب کی پہلے کیا کیفیت تھی اور اب کیا کیفیت ہے۔ واللہ قلب میں اس وقت ایک ایسی حلاوت اور لطف پاؤ گے جو اس چالیس روز سے پہلے نہ تھی اور یہ معلوم ہوگا کہ ہم تو جہنم میں تھے اب جنت میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ گناہ میں کیا کلفت ہے اور طاعت میں کیسی حلاوت ہے۔ غرض گناہ کے چھوڑنے میں تھوڑے دنوں کی کشاکشی ہے اس کے بعد راحت دائمی ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

(کچھ دن جدوجہد کر پھر آرام سے رہ)

طاعت میں عجیب حلاوت ہے

اور آپ خود مشاہدہ کر لیجیے جن حضرات نے طاعت کو اختیار کر لیا ہے اور دنیا کو چھوڑ دیا ہے وہ کس راحت اور اطمینان کے اندر ہیں۔ واللہ ان حضرات کی طمانیت اور راحت وہ ہے کہ جو ہفت اقلیم کے بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ ہم کو یہ درجہ کہاں نصیب ہو سکتا ہے، صاحبو! ممتنع اور محال نہیں ہے اعمال صالحہ اختیار کرو اور معاصی کو ترک کرو، تم کو بھی ایسی ہی راحت میسر ہو جاوے گی۔ الحاصل کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ اس کے نہ کرنے میں کلفت ہو لیکن میں آپ کے زعم کے موافق گفتگو کرتا ہوں کہ جن گناہوں کے

چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے ان کے چھوڑنے میں آپ کو کیا عذر ہے۔ مثلاً رشوت کے بارے میں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر چھوڑ دیں گے تو گھی نہ ملے گا مگر ڈاڑھی رکھنے سے کون سی مصلحت برباد ہوتی ہے ابتدائے عمر میں تو اس لیے منڈانا شروع کی تھی کہ خوبصورت معلوم ہوں گے لیکن اب بوڑھے ہو کر منڈانے میں کیا مصلحت ہے۔ اسی طرح اور بہت سے گناہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیں تو دنیا کا کچھ بھی نقصان نہیں ہے، خدا کے لیے ایسے ہی گناہ چھوڑ دو غرض یہ طبقہ فضائل دینیہ کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہے گو اعتقاد صحیح ہے۔

فضائل دینیہ کے طریق تحصیل میں غلطی

تیسرا طبقہ وہ ہے کہ ان کو فضائل دینیہ کے حاصل کرنے کی رغبت اور توجہ ہے اور دنیا کو اعتقاداً اور حالاً فانی سمجھتے ہیں مگر ان میں یہ کمی ہے کہ فضائل کے حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے اس پر نہیں چلتے، چاہتے ہیں کہ ہم کو کرنا تو کچھ نہ پڑے اور فضائل حاصل ہو جاویں اور جو طریقہ اپنے نزدیک انہوں نے فضائل کی تحصیل کا تجویز کیا ہے وہ طریقہ نہیں ہے اور وہ طریقہ مجوزہ ان کا یہ ہے کہ مثلاً کوئی کتاب دیکھی اور کوئی مضمون عبرتناک نظر آیا، کہنے لگے کہ آہ اور جو کچھ رو دیئے بس جنید ہو گئے، ختم شد آگے صفر ہے۔ جب اپنے دنیوی کاروبار میں مشغول ہوئے پھر ویسے ہی ہو گئے۔ بہر حال یہ طبقہ طبقہ ثانیہ سے بہتر ہے اس لیے کہ ان کو توجہ تو ہے لیکن کمی ان میں بھی ہے اور بہت بڑی کمی ہے۔

اصلاح کیلئے صرف تمنا اور دعا کافی نہیں

چوتھا طبقہ وہ ہے کہ ان سے آگے بڑھتے ہیں ان کو فضائل دینیہ کی طرف رغبت ہی نہیں بلکہ تمنا کا درجہ ہے لیکن تحصیل کی تمنا نہیں بلکہ حصول کی ہے چاہتے ہیں کہ آپ سے آپ حاصل ہو جاویں۔ کیوں صاحبو! کون سی شے ہے جو خود بخود حاصل ہوتی ہے اور اپنے نزدیک انہوں نے بھی ایک طریقہ تجویز کیا وہ یہ ہے کہ جب کسی بزرگ سے ملے تو ان سے عرض کیا کہ حضرت گناہوں کی طرف بہت میلان ہے کچھ توجہ فرمائیے، بس اپنے نزدیک اپنی سعی ختم کر چکے اور یقین کامل ہو گیا کہ حضرت کی توجہ سے سب گناہ خود بخود چھوٹ جاویں گے۔ سبحان اللہ اچھا طریقہ تجویز کیا ہے جن حضرت سے توجہ کے خواہاں ہیں ان سے تو

پوچھئے کہ ان کے اندر سے معاصی کا میلان کس طریقہ سے دفع ہوا ہے اور کیا کیا ان کو کرنا پڑا۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت بارہ تسبیح بتلا دیجئے‘ حضرت خفا ہوکر فرمانے لگے کہ واہ ساری عمر میں ایک یہی شے تو حاصل ہوئی‘ یہی تجھے بتلا دوں‘ میاں جس طرح ہم کو ناک رگڑ کر ملی ہے اسی طرح تم ناک رگڑو‘ جی چاہے گا بتلا دیں گے‘ تم چاہتے ہو کہ مفت سفت میں دولت حاصل ہو جائے‘ دیکھو اگر کسی تاجر کے پاس جاؤ اور یہ کہو کہ ایسا طریقہ بتلا دو کہ دس روپیہ روز آ جایا کریں‘ دیکھو وہ کیا جواب دے گا‘ وہ یہ کہے گا کہ میاں تم احمق ہو‘ کام کرو‘ ہمارے پاس اصول تجارت سیکھو‘ ہماری خدمت کرو اور خدا تعالیٰ پر نظر رکھو‘ اس کے بعد تجارت کرو‘ دیکھو اللہ تعالیٰ برکت کرنے والے ہیں‘ بتدریج ہماری طرح مالدار ہو جاؤ گے تو صاحبو! یہی حال فضائل دینیہ کا ہے اس کے لیے بھی طریقہ ہے کام کرو اور اس کے ساتھ دعا بھی بزرگوں سے کراؤ‘ باقی نری دعا پر رہنا تو ہوس خام ہے‘ نری دعا پر رہنے والے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی بزرگ سے یہ کہے کہ حضرت ایسی دعا کرو کہ میرے بچہ پیدا ہو جاوے‘ ان بزرگ نے پوچھا کہ بھائی نکاح بھی کیا ہے کہا کہ حضرت جی نکاح کا تو ارادہ نہیں ہے اب اگر ان بزرگ نے دعا کا وعدہ کر لیا تو یہ ان کی بزرگی ہے ورنہ قاعدہ کے موافق تو جواب اس کا ظاہر ہے کہ میاں نکاح کرو‘ اس کے بعد دعا کراؤ‘ پس جس طرح بغیر نکاح کے لڑکا پیدا ہونے کی دعا کراتا ہے اسی طرح بغیر کام کیے میلان الی المعاصی کے چھوٹنے اور فضائل کے حصول کی دعا کراتا ہے اور اگر خرق عادت کے طور پر کسی مرد کے پیٹ میں بچہ رہ بھی گیا تو جننے کے وقت مصیبت پڑے گی وہ نکلے گا کدھر سے‘ بلا طریقہ پر چلے خرق عادت کے طور پر کسی بزرگ کی توجہ سے اگر کسی کو کچھ حاصل ہوا بھی ہے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے مرد کے پیٹ میں بچہ رہ جانا جن کو اس طرح کچھ ملا ہے ان کا انجام ہلاکت ہوا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا قصہ ہے کہ ان کے یہاں ایک مرتبہ کچھ مہمان آئے اور حضرت کے گھر میں کچھ نہ تھا‘ پڑوس میں ایک باورچی رہتا تھا‘ اس کو خبر ہوئی اس نے بہت عمدہ کھانا کافی مقدار میں تیار کر کے حضرت کے مہمانوں کو کھلا دیا‘ حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ کچھ ہم سے مانگو‘ اس نے عرض کیا کہ حضرت جو کچھ مانگوں گا وہ آپ دیں گے‘ فرمایا کہ ہاں اگر امکان میں ہوا

تو دوں گا۔ اس نے عرض کیا کہ آپ تو آپ آپ کے غلام دے سکتے ہیں، عرض کیا کہ مجھے اپنے جیسا بنا لیجئے، حضرت سن کر خاموش ہو گئے اور دل میں بہت پیچ وتاب کھایا، اس لیے کہ اس نے درخواست ایسی شے کی کی کہ جس کا یہ اہل نہیں تھا۔ اسی واسطے مولانا فرماتے ہیں:

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ — برنتابد کوہ رایک برگ کاہ

(جو کچھ مانگو اندازہ سے مانگو گھاس کا ایک پتہ پہاڑ کو نہیں اکھاڑ سکتا) اور فرماتے ہیں:

چار پا راقدر طاقت بار نہ — برضعیفاں قدر ہمت کار نہ

طفل راگرناں دہی بر جائے شیر — طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(چوپایوں پر ان کی طاقت کے موافق بوجھ رکھ کر کمزوروں سے طاقت کے موافق کام لو شیر خوار بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دینے لگے تو وہ غریب تو اس روٹی سے مر ہی جائے گا)

اگر کوئی شیر خوار بچہ کو بجائے دودھ کے روٹی دے دے تاکہ جلدی جلدی بڑھے تو وہ بجائے بڑھنے کے جلدی ختم ہو جائے گا۔ ایسے ہی اگر کسی کی توجہ سے دفعتہً کوئی شے حاصل ہو جائے اور ظاہر ہے کہ پہلے سے اس کی استعداد اور قابلیت نہ تھی تو انجام اس توجہ کا ہلاکت ہوگا، ایسی توجہ کو خونی توجہ کہتے ہیں۔

حکایت حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ

مولانا مولوی محمد منیر صاحب مرحوم نانوتویؒ بڑے ظریف تھے، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب نانوتہ تشریف لائے، دو چار خادم بھی ہمراہ تھے اور ان پر کیفیات طاری ہو رہی تھیں۔ مولانا محمد منیر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کو یہ کیفیتیں کبھی نصیب نہ ہوئیں، حضرت نے فرمایا کہ چاہتے ہو تو آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ، مولوی صاحب نے فرمایا کہ حضرت اس طرح تو منظور نہیں، مولوی صاحب نے بڑی فہم اور دانائی کی بات کہی اس لیے کہ اس توجہ سے دو صورتوں میں سے ایک صورت ہوتی یا تو کچھ اثر نہ ہوتا تب تو فضول وقت ضائع ہوتا اور اگر کچھ اثر ہوتا تو وہ پائیدار نہ ہوتا، اس کے زوال کے بعد پھر حسرت اور افسوس اور زیادہ ہوتا یا اگر قوی توجہ ہوتی تو اندیشہ جسمانی ضرر کا بھی تھا، اگر کوئی کہے کہ اگر توجہ سے مر جائیں گے تو کچھ پروا نہیں، ایسی تو موت بھی اچھی۔ بات یہ ہے

کہ مرنا بھی وہی اچھا ہے جو طریقہ کے ساتھ ہو' اپنے ہاتھوں سے جان دینے سے کیا فائدہ اور یہ کوئی کمال نہیں' مقصود تو زندہ رہ کر اعمال صالحہ اور طاعت کرنا ہے۔ بہر حال اگر کوئی شخص ایسی توجہ دے بھی تو ہرگز نہ لو الحاصل حضرت خواجہ صاحب چونکہ وعدہ کر چکے تھے اس لیے اس کے ایفاء پر مجبور ہوئے اور اس کی طرف متوجہ ہوئے جس کا یہ اثر ہوا کہ اس کی صورت شکل تک آپ جیسی ہوگئی مگر تھوڑی ہی دیر میں جاں بحق ہوا' غرض اس طبقہ کی غایۃ سعی فضائل دینیہ کے لیے یہ ہوئی کہ کسی بزرگ سے دعا کرالی' توجہ کے طالب ہوگئے' باقی اس کے لیے خود کچھ عمل نہیں کرتے۔

حصول فضائل دینیہ کیلئے محض وظائف کافی نہیں

پانچواں طبقہ وہ ہے کہ ان کی نظر اور آگے پہنچی کہ انہوں نے نری توجہ ہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ عمل بھی کیا لیکن عمل بھی وہ جو اس کے لیے موضوع نہیں ہے ان کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو بھوک لگ رہی ہو اس کو کسی نے کہا کہ بھائی کرو اور کھاؤ۔ انہوں نے یہ کہا کہ آٹا گوندھ کر اس کے دائرے اور مثلث اور مربع بنانے لگے' ظاہر ہے کہ عاقل اس کو یہ کہے گا کہ میاں اس حرکت سے پیٹ نہ بھرے گا' پیٹ بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کہیں سے تو الاؤ آگ لاؤ' ایندھن جمع کرو اور روٹی بنا کر توے پر ڈالو پھر اس کو سینکو' پھر کھاؤ' حضرت ہر شے کا ایک طریقہ ہے کہ بدون اس کے وہ شے عادۃً حاصل نہیں ہوا کرتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

اطلبوا الارزاق من اسبابها وادخلوا الابیات من ابوابها

(روزی کو اس کے اسباب اور وسائل کے ذریعے تلاش کرو اور گھروں میں دروازہ کے راستہ داخل ہو) اس طبقہ نے کیا کیا کہ کسی بزرگ سے ملے' ان سے عرض کیا کہ حضرت گناہوں کی طرف بہت میلان ہے کوئی وظیفہ بتا دیجئے۔ وہ بزرگ بھی نرے بزرگ ہی تھی انہوں نے ایک وظیفہ بتا دیا اور یہ بھی ساتھ میں کہہ دیا کہ جی لگا کر پڑھا کیجیو یہ قید ایسی لگائی کہ اس بیچارے کو اور مقید کر دیا' اگر یہ نہ کہتے تو شاید کچھ جی اس کا لگ بھی جاتا مگر اب تو ضرور جی ہٹے گا جیسے کیمیا گر کے پاس کوئی گیا اور کہا کہ میاں ہم نے سنا ہے تم کو کیمیا آتی ہے اس نے کہا کہ ہاں آتی ہے اس نے کہا کہ بھائی ہم کو بھی بتا دو' کہا کہ اچھا فلاں بوٹی جو فلاں

جنگل میں ہے لے آ ؤ مگر توڑتے وقت بندر کا خیال نہ آنے پاوے اب وہ بیچارا جب جنگل جاتا ہے بندر کا خیال موجود سخت حیران ہوا اگر وہ بندر کا ذکر نہ کرتا تو کبھی اس کو خیال نہ آتا لیکن یہاں نفی میں اثبات ہوگیا اب جا کران بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت اس وظیفہ میں تو جی نہیں لگتا انہوں نے جی لگنے کے لیے ایک اور وظیفہ بتا دیا۔ وھکذا اب یہ شخص مجموعہ وظائف ہوگیا لیکن مقصود اب بھی حاصل نہ ہوا اس لیے کہ جو طریقہ مقصود تھا وہ بیچارے کو کسی نے نہ بتایا اب اس کی حالت یہ ہوئی کہ مایوس ہوگیا اور سمجھ گیا کہ میرا مقصود مجھ کو حاصل نہ ہوگا حالانکہ وہ درگاہ ایسی ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو وہ مایوس نہیں ہوسکتا۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　　بر کریماں کارہا دشوار نیست

(تو یہ خیال نہ کر کہ بھلا ہماری پہنچ اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا) جس نے کبھی تمام عمر میں اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا ہو اور برسوں سے معاصی میں مبتلا ہو وہ بھی اگر توجہ کرے تو اس کے لیے بھی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کی تو یہ شان ہے:

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو

دارو گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے چلا جائے اس دربار میں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں) فرماتے ہیں:

باز آ باز آ ازانچہ ہستی باز آ　　　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　　　صد بار اگر توبہ بہ شکستی باز آ

(تو جیسا بھی گنہگار ہے اپنے گناہ سے باز آ جا اگر چہ تیرا گناہ کفر اور آتش و بت پرستی ہی ہو ہمارا دربار مایوسی اور ناامیدی کا دربار نہیں ہے سو دفعہ بھی اگر تو نے توبہ توڑ دی تو پھر بھی توبہ کر لے)

لیکن ان حضرت شیخ کی بدولت آج یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طالب مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور اس نے بطالت اور تعطل اختیار کر لیا میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں کہ جو ایسے ناواقف شیوخ کے ہاتھ میں جا پھنسے ہیں اور حیران و سرگرداں ہو کر بیٹھ رہے اور ان کی مقصد برآری نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ مرض کو سمجھا نہ دوا کو اور نہ ان کو اس کی تمیز ان مریضوں اور اطباء کا ایسا ہی قصہ ہے جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک کنیزک کا قصہ لکھا ہے

کہ وہ مرض عشق میں مبتلا تھی اور بہت سے اطباء اس کا علاج کر رہے تھے اس کو کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا اس کے بعد ایک طبیب الٰہی آیا اور اس نے اس کو دیکھ کر کہا:

رنجش از صفراء و از سودا نبود — بوئے ہر ہیزم پدید آید ز دود

(اس کی بیماری کا سبب صفراء یا سوداویت کا غلبہ نہیں ہے ہر لکڑی اس کے دھوئیں کی بو سے پہچان لی جاتی ہے)

بے خبر بودند از حال دروں — استعید اللہ مما یفترون

(جن طبیبوں نے علاج کیا ان کو اندرونی بیماری کا پتہ نہ چلا، پناہ مانگتا ہوں اطباء کے اس افتراء اور بہتان سے)

(اطباء جسمانی نے اس کا مرض نہیں پہنچانا علاج مرض کے خلاف ہونے سے بیماری اور بڑھ گئی)

گفت ہر دارد کہ ایشاں کردہ اند — آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

اس طبیب الٰہی نے جو اس کا علاج کیا وہ ایک معمولی تھا کہ اس کے محبوب کو کسی ترکیب سے گھلا دیا، عشق اس کا ختم ہو گیا۔

شیخ محقق کا طریقہ علاج

اسی طرح محقق جو علاج کرتا ہے وہ بہت معمولی ہوتا ہے، بہت لمبا چوڑا نسخہ نہیں لکھتا۔ مثلاً وساوس کا خلجان ہوا غیر محقق تو کوئی وظیفہ بتلا دے گا اور اس سے یہ مرض اور بڑھے گا۔ محقق صرف یہ کہے گا کہ وساوس کا آنا مضر نہیں ہے اس لیے کچھ خیال نہ کرو۔ اگر آتے ہیں تو آنے دو دیکھئے دو کلموں میں علاج ہو گیا اس لیے یہ شخص علت سمجھ گیا، وہ یہ ہے کہ یہ اپنے نزدیک وساوس اور خطرات کو منافی اس طریق کے سمجھ رہا ہے اس لیے اس کے غم میں گھلا جاتا ہے اس نے اس کی بیخ ہی کو قطع کر دیا کہ کچھ پروا نہیں، یہ کسی حالت میں مرض نہیں فوراً سکون ہو جائے گا اور خطرات قطع ہو جائیں گے۔ حقیقت میں محقق کا وجود حق تعالیٰ کی بڑی بھاری نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (آپ کہہ دیجئے کہ کیا علم والے اور جاہل برابر ہیں) محقق حجۃ اللہ علی الارض ہوتا ہے وہ قرنوں میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح میلان الی المعاصی کے مرض کو سمجھو غیر محقق تو اس کے لیے کوئی وظیفہ یا ذکر بتائے گا اور محقق کہے گا کہ اس کا یہ طریق نہیں ہے اس کا طریق یہ

ہے کہ عمل میں سعی کرو اس کی برکت سے ملکات رذیلہ خود بخود زائل ہو جائیں گے اس کا قصد ہی نہ کرو کہ میلان الی المعاصی دفع ہو جائے اس کے قصد کرنے سے مشقت بڑھتی ہے ہاں جو عمل تمہارے اختیار میں ہے وہ کرو یعنی اعمال صالحہ ان کی شرائط کے ساتھ کرو اسی طرح مثلاً کسی نے شکایت کی کہ نماز میں مزہ نہیں آتا تو غیر محقق تو اس کے لیے کوئی وظیفہ بتائے گا اور محقق کہے گا کہ نماز مزہ کے لیے موضوع نہیں ہے اس کی غرض اصلی رضائے حق تعالیٰ ہے اور ثمرہ وہاں ملے گا اس پر اگر وہ سائل کہے کہ بے شک مزہ مقصود نہیں ہے لیکن مزہ سے نفس کو سہولت ہو جائے گی' محقق جواب دے گا کہ سہولت ہو یا مشقت ہو تم پڑھے جاؤ دنیا دارالمحنت ہے دارالراحت نہیں ہے۔ دیکھو اگر تمہاری ساری عمر مصیبت میں گزر جائے تو آخر اس کو جھیلتے ہی ہو' نماز کی تکلیف بھی برداشت کرو اور دیکھو اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ فلاں شے نہ کھانا ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تم تمام عمر اس شے کو چھوڑ دو گے۔ افسوس ہے کہ ایک سول سرجن کے کہنے سے تم نے ساری عمر کو ایک لذیر شے کو چھوڑ دیا اور پرہیز کی مصیبت برداشت کر لی اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کہ عالم علم اولین و آخرین ہیں آپ کے فرمانے سے تم سے تھوڑی سے مشقت برداشت نہیں کی جاتی۔ صاحبو! یہ علوم جو درس کتب میں مفقود ہیں اور انہی کی وجہ سے ضرورت ہے کسی محقق کے پاس رہنے کی۔

ایک مبتلائے عشق مجازی کا علاج

میرے پاس ابھی ایک شخص کا خط آیا ہے وہ بیچارے ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہیں' وہ مختلف لوگوں کی طرف رجوع کر چکے تھے' کسی نے ان کو وظیفہ بتا دیا' کسی نے کوئی عمل بتا دیا اور زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور سخت پریشان ہو کر انہوں نے میرے پاس لکھا تو گو میں محقق نہیں ہوں لیکن الحمدللہ محققین کی زیارت کی ہے ان کے طفیل سے میری سمجھ میں آ گیا' میں نے ان کو لکھا کہ تمہاری یہی ہوس بیجا ہے کہ یہ مرض زائل ہو اگر نہیں زائل ہوتا نہ ہو' محبوب حقیقی کو جبکہ یہی منظور ہے کہ تم اسی میں رہو تو تم کون ہوتے ہو کہ اس کو زائل کرو' ہاں جو عمل تمہارے اختیار میں ہے وہ کرو یعنی معصیت مت کرو عفت اختیار کرو' اپنے قصد سے اس سے بات مت کرو' اس کو مت دیکھو' اس کی باتیں کسی دوسرے سے نہ سنو اور اس کا خیال اور ارادہ بھی مت کرو' یہ خیال دل سے نکلے۔ دیکھو اگر خدا تعالیٰ تمہاری آنکھیں پھوڑ دے تو

آخر اندھے ہی رہو گے بس اس کو بھی ایسا ہی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو بہت سے مصالح اور حکم کی وجہ سے تم کو اسی مرض میں رکھنا منظور ہے۔

چونکہ بربندت بہ بندو بستہ باش چوں کشاید چابک و برجستہ باش
دوست دارد دوست ایں آشفتگی کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی
جان صدیقاں ازیں حسرت بریخت کاسماں برفرق ایشاں خاک بریخت

(جب وہ باندھ دیں بندھے رہو اور جب وہ کھول دیں تو کھل جاؤ اور خوشی سے کودنے لگو دوست ایسی پشیمانی کو پسند کرتے ہیں لاحاصل کوشش بھی کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے صدیقین نے اسی حسرت میں جانیں دیں کہ آسمان نے ان کے سروں پر خاک چھانی)

اور اگر اسی مرض میں تم مرجاؤ گے تو شہید مرو گے اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے:
"من عشق فکتم وعف کان له اجر شهید"[1] یعنی جو شخص عاشق ہو پس عفت اختیار کرے اور عشق کو چھپا دے اور مرجاوے تو شہید ہے۔ اگرچہ محدثین نے اس حدیث میں کلام کیا ہے لیکن "الدواء الکافی" میں اس کو ثابت لکھا ہے اور اگر یہ حدیث ثابت بھی نہ ہو تو قواعد شرعیہ کلیہ سے ثبوت اس کا ہوسکتا ہے اس لیے کہ سیف حدید سے سیف عشق اشد ہے اس لیے کہ سیف حدید سے تو ایک ہی مرتبہ کام تمام ہوجاتا ہے اور نشتر عشق ہر وقت قلب پر لگتا ہے پھر اخف کے تحمل سے شہادت ہوتی ہے جیسے بہت امراض سے شہادت وارد ہے کہ اس میں تحمل کلفت کا تو اشد کے تحمل سے شہادت کیوں نہ ہوگی اس کے بعد جوان صاحب کا خط آیا تو انہوں نے لکھا کہ مجھے اب بالکل سکون ہوگیا اور ٹھنڈک پڑگئی دیکھئے اس کے ازالہ کے علاج اور فکر سے تو سکون نہ ہوا اور اعتقاد عدم سکون سے سکون ہوگیا۔

ذکر و شغل کے قیود قربات مقصود نہیں

پس علاج یہ ہیں اور ذکر کی ضربیں لگانا علاج نہیں ہیں یعنی مؤثر مستقل نہیں ہاں معین ہیں اصل مؤثر طاقت حق ہے باقی ذکر و شغل ضرب کے ساتھ یا بلا ضرب کے حبس کے ساتھ یا بلا حبس کے اور ان کے ثمرات یہ سب معین ہیں اصل شے ان میں طاعت ہے باقی یہ قیود ضرب

[1] (کنز العمال: ۱۱۲۰۳، البدایۃ والنہایۃ ۱۱:۱۱۱)

جس وغیرہ قربات مقصود نہیں ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی استاد شفیق کسی شاگرد کو مطالعہ کی تاکید کرے اور اس کا طریقہ بتلائے اور کہے کہ تکرار کیا کرو اور یہ دیکھ کر دماغ میں خشکی نہ ہو جائے یہ بھی کہہ دیا کہ گاجریں ابال کر کھالیا کرو اس شاگرد نے یہ کیا کہ مطالعہ وغیرہ تو چھوڑ دیا بس گاجریں ہی کھانا شروع کر دیں حالانکہ وہ مقصود نہ تھیں بلکہ معین مقصود تھیں۔ اسی طرح ضرب اور حبس قربات مقصود نہیں مگر بعض عوارض اور موانع ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کو کیا جاتا ہے ان کو ثواب نہ سمجھنا چاہیے اور دوسری مثال لیجئے کہ جیسے کوئی شیخ اپنے مرید کو قوت اور شب کو بیدار رہنے کے واسطے یہ بتائے کہ سنکھیا کے تیل کی ایک سینک پان میں کھالیا کرو تو ان بزرگ نے حرارت غریزیہ کے مشتعل کرنے اور ہمت بڑھانے کے لیے بتلایا ہے اگر وہ مرید نری سینکیں ہی کھایا کرے تو اور اسی کو مقصود سمجھ لے اور کام کچھ نہ کرے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ بس یہی درجہ ہے ضرب اور حبس کا کہ شیخ کامل اگر کسی کے لیے تجویز کرے تو یہ نافع اور معین ہے۔

ثمرات صرف آخرت کے لیے موعود ہیں

بہرحال اصل شے طاعت ہے اور یہ اس کی تدابیر ہیں' باقی رہے ثمرات سو وہ آخرت میں موعود ہیں دنیا میں بھی اگر بعضے حاصل ہو جاویں تو زائد ہیں اور نہ ہوں تو کچھ ضروری نہیں ہیں' بہت سے ذاکر شکایت کیا کرتے ہیں اور بعضے عوام بھی کہ ہم اتنے دنوں سے نماز پڑھتے ہیں یا ذکر کرتے ہیں اور حلاوت نہیں آتی یا جی نہیں لگتا۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہر امر میں حکمت ہے

صاحبو! خدا تعالیٰ کے ذمہ کوئی قرض نہیں' خدا تعالیٰ نے کہیں وعدہ نہیں فرمایا ہے' سو وہ ان شاء اللہ وہاں ملے گی منتظر رہو' باقی حلاوت بھی بعضوں کو نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہے کہ کسی کو دیتے ہیں کسی کو نہیں دیتے جس کے لیے جو شے مناسب ہے وہی اس کو عطا ہوتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی طبیب کے پاس دس مریض جائیں اور دل میں یہ ٹھان لیں کہ ہم کو خمیرہ گاؤزبان مروارید ی ملے گا اس نے ایک تو خمیرہ گاؤزبان ہی بتایا اور اس کو کیوں نہیں بتایا تو طبیب جواب دے گا کہ احمق ہوئے ہو تمہارے امراض کے لیے یہی دوائیں مناسب ہیں۔ جب مواد فاسدہ دور ہو جائیں گے اس وقت خمیرہ کھانا اسی طرح طاعت کے اندر کسی کو گھبراہٹ اور پریشانی اور دل نہ لگنا ملتا ہے تم کون ہوتے ہو کہ دلچسپی اور شوق کو اپنے لیے تجویز کرو۔

کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

(جو کچھ ہمیں ساقی نے دے دیا ان کی مہربانی ہے)

"اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌ بَصِيْرٌ."

(بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے) وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر ہم ان کو لذت اور شوق اور مزہ عطا کریں گے تو ان کو عجب پیدا ہو جائے گا کہ جوان کو ہلاک کر ڈالے گا۔

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند او مصلحت تو از تو بہتر داند

(وہ شخص جو تجھے تونگر نہیں سمجھتا وہ اس کی مصلحت تجھ سے زیادہ سمجھتا ہے) "پدرا عسل بسیار ست ولیکن پسر گرمی دارست" (والد کے پاس بہت سا شہد ہے لیکن بیٹے کا مزاج سخت گرم ہے) پس یہ وجہ ہے کہ یہ عطایا مختلف ہیں معطی لہ کی استعداد کے موافق عطا کیے جاتے ہیں۔

ذکر وطاعت کا نقد ثمرہ

ہاں ایک عطیہ مشترکہ ہے جو سب کو علی حسب الاستعداد عطا ہوتا ہے وہ کیا ہے تسلی اور اطمینان ذکر وطاعت کا یہ اثر ہے کہ کرتے کرتے ایک تسلی کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔

تسلی داد ہر کس را برنگے

(ہر شخص کو اس کی حالت کے موافق دلاسا دے دیا) اور حق تعالیٰ کی معرفت اور محبت کی وجہ سے وجداناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ معاملہ میرے ساتھ ہوتا ہے سب خیر ہے۔ الحاصل اس طبقہ نے عمل کیا لیکن وہ عمل نہ کیا جو فضائل کے حصول کے لیے موضوع ہے۔ چھٹا طبقہ وہ ہے کہ انہوں نے عمل بھی وہی کیا جو اس کے لیے موضوع ہے لیکن فضائل وہ طلب کیے جن کا عطا ہونا عادت الٰہیہ کے خلاف ہے۔ ایسی تمنا بھی شرع کے خلاف ہے۔

قطبیت کے طالب

ایک شخص ہم کو ملے جو قطبیت کے طالب تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں وہ گئے وہ بھی پسند نہ آئے جب میں گنگوہ گیا' حضرت نے فرمایا کہ بھائی وہ فلاں شخص آئے تھے' قطبیت کے طالب تھے یہاں قطبیت کہاں تھی اس لیے چلے گئے۔ یاد

رکھو قطبیت اور غوثیت مکتسب نہیں ہے بعض لوگ اس دھن میں ہوتے ہیں کہ ہم کو خضر علیہ السلام مل جاویں' خضر علیہ السلام کا ملنا بھی کوئی امر مکتسب نہیں ہے اور اگر مل بھی گئے تو تم کو کیا ملے گا۔ ایک شخص تھے ان کو خضر علیہ السلام ملے' کہا السلام علیکم' انہوں نے کہا وعلیکم السلام' خضر علیہ السلام نے پوچھا کہ تم نے مجھ کو پہچانا بھی انہوں نے کہا نہیں' فرمایا میں خضر ہوں وہ شخص بولے بہتر ہے اللہ تعالیٰ بھلا کرے خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے مجھ سے کچھ دعا نہ کرائی کہا کہ بس حضرت خود ہی دعا کریں گے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میاں تم بھی عجیب آدمی ہو' بہت لوگ تو میرے ملنے کی تمنائیں کرتے ہیں اور تم نے کچھ بھی قدر نہ کی' کہا کہ بس آپ کی زیارت ہوگئی یہی کافی ہے۔ خضر علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ نہیں مجھ سے ضرور دعا کراؤ' ان سے کہا کہ اچھا یہ دعا کرو کہ میں نبی ہو جاؤں' خضر علیہ السلام نے کہا یہ تو نہیں ہوسکتا' کہنے لگے کہ پھر جو ہوسکتا ہے وہ تو خود ہی ہوگا' آپ کی دعا کی کیا ضرورت ہے لیکن اس حکایت سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ دعا بے کار ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرات اولیاء اللہ کی شان حق تعالیٰ کے دربار میں بلاتشبیہ ایسی ہو جاتی ہے جیسے کوئی کسی بادشاہ کا مزاج شناس ہوتا ہے اور ان پر ایک حال ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ سے ہمارا امتحان مقصود ہے اس لیے وہ لب کشائی نہیں کرتے' بعض لوگ کشف و کرامت کے طالب ہوتے ہیں یہ بھی مکتسب نہیں ہیں۔ ساتواں طبقہ وہ ہے کہ انہوں نے عمل بھی کیا اور فضائل میں سے انہی فضائل کے طالب ہوئے جو عادۃً مکتسب ہیں اور تمام شرائط عمل کے بجالائے اور بالکل اعتدال پر رہے لیکن ان کے اندر ایک اور باریک خرابی پیدا ہوگئی وہ یہ ہے کہ ان میں عجب پیدا ہوگیا اور اس کی وجہ سے ان کو دعویٰ ہوگیا استحقاق کا' بہرحال اس قدر غلطیاں ہیں گو طالبین فضائل کو پیش آتی ہیں۔

شان نزول

حق تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب کی اصلاح فرمائی ہے۔ پس یہ مضمون اس قدر مہتم بالشان اور ضروری ہے کہ جس کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ عاملین کو بھی معطلین کو بھی۔ چنانچہ تمام طبقات کی اصلاح کو اس آیت سے مفصلاً عرض کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ. ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ مت تمنا کرو ان

چیزوں کی کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے' مردوں کے لیے وہ شے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے وہ شے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کرو' بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے کو جاننے والے ہیں۔ شان نزول اس آیت کا ایک قصہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ فرمایا تھا: يَالَيْتَنَا كُنَّا رِجَالًا. یعنی کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل مثل جہاد وغیرہ کے ہم بھی حاصل کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی اس آیت سے کل طبقات موجود مذکورہ سابق کی غلطیاں رفع ہوتی ہیں' اول طبقہ تو وہ تھا جو فضائل کے منکر یا کالمنکر ہیں ان کی اصلاح تو اس طرح ہوئی کہ جب خود اللہ تعالیٰ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو "مابه الفضيلة" یعنی فضائل کو ضروری تو سمجھتے ہیں لیکن ان کی طرف توجہ نہیں ہے ان کی اصلاح مافضل الله سے ہوئی اس لیے کہ جو شے حق تعالیٰ کے نزدیک قابل فضیلت ہے وہ بہت ضروری اور اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اس کے سوا اور سب اشیاء کی تحصیل متاخر ہونا چاہیے' طبقہ ثالثہ و رابعہ و خامسہ اس امر میں مشترک ہیں کہ انہوں نے فضائل کی تحصیل کے طرق متعددہ اپنی رائے سے تجویز کیے اور اسی اختلاف وتعدد طریق کی وجہ سے ان میں تعدد ہوا۔

فضائل شرعیہ کے لیے اعمال شرعیہ موضوع ہیں

لیکن یہ امر سب میں مشترک ہے کہ جو عمل فضائل کی تحصیل کے لیے موضوع ہے وہ نہ کیا ان کی اصلاح لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا سے ہوئی۔ حاصل یہ ہوا کہ نری تمنا اور رغبت سے یا کسی بزرگ کی توجہ دعا سے یا صرف کتاب دیکھنے سے یا وظائف پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ فضائل کے لیے اعمال شرعیہ موضوع ہیں وہ فضائل موقوف علیہ ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے گو کبھی خرق عادت کے طور پر بلا اکتساب بھی بعض کو بعض فضائل حاصل ہوئے ہیں لیکن عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ بغیر اکتساب کے حصول نہیں ہوتا' طبقہ سادسہ وہ ہے جنہوں نے اعمال بھی کیے لیکن ایسی چیزوں کی تمنا کی جو اختیار سے باہر ہیں جیسے کشف وکرامت وقطبیت وغیرہ "وَلَا تَتَمَنَّوْا" سے اس غلطی کی بیخ کنی ہوتی ہے اور یہ

چیزیں خواہ ایسی ہوں کہ جو شرعاً ممتنع ہوں جیسے نبوت اور خواہ ممکن ہوں لیکن اکتساب کو اس میں دخل نہ ہو جیسے کشف و کرامت اور قطبیت و غوثیت اگر کوئی کہے کہ ایسے امور کے لیے دعا کریں، بات یہ ہے کہ دعا بھی ان ہی امور میں ہوتی ہے جن میں عمل کو دخل ہے یا ان کو عمل میں دخل جیسے شوق وغیرہ ہاں جو فضائل دینیہ نہیں ہیں تو گو اختیار سے خارج ہوں جیسے بارش اور دفع بلا وغیرہ ایسے امور کے لیے دعا مشروع ہے لیکن غور کر کے دیکھا جاتا ہے تو ان امور میں بھی عمل کو دخل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا

(تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ، بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے، کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا) دیکھو استغفار کو بارش میں دخل ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ابر ناید از پے منع زکوٰۃ   ور زنا افتد وبا اندر جہات

(زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے بارش بند کر دی جاتی ہے اور زنا کی بدولت ہر طرف وبا پھیلتی ہے)

امور تکوینیہ میں دعا جائز ہے

بہر حال امور تکوینیہ میں دعا جائز ہے خواہ عمل کا دخل اس میں ظاہر نہ ہو باقی امور تشریعیہ اور فضائل دینیہ میں دعا انہی امور میں ہے کہ جن کے حصول میں عمل کو دخل ہے یا ان کو عمل میں دخل ہے بخلاف کرامت وغیرہ کے طبقہ سابعہ وہ تھا کہ جن کو عمل کے ساتھ عجب پیدا ہو گیا تھا، ان کی غلطی کی اصلاح "وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ" سے ہوئی یعنی اے عاملین عمل کر کے ناز مت کرو اور اس پر اعتماد نہ کرو اس لیے کہ تمہارا عمل محض کوئی شے نہیں اصل چیز فضل ہے اس کو مانگتے رہو اور یہ عمل کا تم سے ہو جانا یہ فضل ہی سے ہوا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر بہت صاف ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ

(یعنی جو اطاعت کرے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے وہ نبی اور صدیق اور شہداء اور صالحین اور یہ لوگ اچھے رفیق ہیں) یہ یعنی طاعت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق اللہ کا فضل ہے پس

جب یہ اعمال بھی اسی کا فضل ہیں تو عجب اور ناز کا کیا محل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعمال علت نہیں ہیں صرف شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ بمعنی "لو لاہ لامتنع" اصل کام فضل ہی سے چلتا ہے باقی بہانہ ہے کہ اس کی نسبت حکم ہے مگر ایسا بہانہ ہے کہ تم بہانہ کرو ہم فضل کریں گے، عمل پر وعدہ فضل ہے اور بدون عمل کے وعدہ نہیں ہے، غرض اصلی شئے فضل ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو عمل کی وجہ سے جنت میں جاوے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دریافت فرمایا: "وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"[1] یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی عمل سے جنت میں نہ جائیں گے اللہ اکبر ایسے سوال کی ہمت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہوسکتی تھی اور کسی کا کیا حوصلہ ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا سوال کرتا، بڑے شکر کا مقام ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مجمع ایسا ہے بے تکلف تھا کہ جن کی بدولت ہم کو ایک ایسا بڑا علم کا ذخیرہ پہنچا کہ وہ دوسروں کے واسطہ سے ہرگز نہ پہنچ سکتا تھا۔

تعدد کثرت ازواج رسول کریمؐ میں حکمت

بعض مخالفین کثرت ازواج پر اعتراض کرتے ہیں لیکن علاوہ اور بہت سی حکمتوں اور مصالح اور ضرورتوں کے یہ کتنی بڑی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی کہ علم کا وہ باب جو کسی کے ذریعے مفتوح نہیں ہوسکتا تھا وہ ہم کو حضرات ازواج مطہراتؓ کے معرفت پہنچا۔ احسان ماننا چاہیے ان بیبیوں کا تم خود اپنے دل میں ٹٹولو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان وشوکت وہیبت خدا داد کے پیش نظر ہوتے ہوئے کہ جس کی وجہ سے صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسے بیٹھے رہتے تھے "کان علی روسنا الطیر" یعنی گویا کہ ہمارے سروں پر پرندہ بیٹھا ہے۔ یعنی جیسے کسی کے سر پر پرندہ بیٹھ جائے اور وہ یہ چاہے کہ اڑے نہیں تو وہ جیسے بے حس وحرکت ہوتا ہے اس طرح ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتے تھے تو کس کی ہمت تھی کہ بولے اور سوال کرے اور سوال بھی ایسا یہ بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس میں بہت سے ایسے امور کھپ جاتے ہیں جو اوروں سے بے ادبی اور گستاخی شمار ہوں۔ افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اٹھو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔

---

[1] (الصحيح لمسلم صفات المنافقين ب: ۷ ا مشکوٰۃ: ۲۳۷۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ان کا شکریہ ادا نہ کروں گی، میں تو اپنے اللہ تعالیٰ کا شکر کروں گی، دیکھئے اگر کوئی اور شخص اس کلمہ کو کہے تو سخت بے ادبی اور گناہ ہے لیکن زوجیت کا ایسا علاقہ ہے کہ یہ کلمہ اس میں بے حد لطف دے رہا ہے۔ الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ"[1] یعنی میں بھی عمل سے جنت نہ جاؤں گا مگر جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھ کو ڈھانپ لیں۔ پس جبکہ حضور سید الاولین والاخرین صلی اللہ علیہ وسلم ہی یہ فرما دیں تو آج کون شخص ہے جو اپنے عمل پر اعتماد کرے حالانکہ عمل میں آپ کے برابر تو کوئی کیا ہوگا، قریب بھی آپ کے کوئی نہیں بلکہ بعید اور ابعد بھی نہیں کہا جا سکتا، کہاں ہمارا عمل کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی یہ نہ کہے کہ میں تمام رات جاگتا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔

عمل کا موقوف علیہ طلب صادق ہے

اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو نفلیں ہم سب کی تمام عمر کی عبادت سے کہیں زیادہ ہیں، ہمارے اندر وہ اخلاص وہ محبت کہاں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بڑا رتبہ ہے، ہمارے حضرت پیر مرشد فرماتے تھے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اور اسی واسطے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایک مد اوروں کے احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ پس اس تفاوت کے ہوتے ہوئے آج اگر کوئی عمل پر مدعی استحقاق ہو بڑا نادان ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جب فضل ہی پر مدار ہے تو ہم کو عمل کی کیوں تکلیف دی۔ بات یہ ہے کہ دیں گے تو فضل ہی سے لیکن عمل توجہ فضل کی شرط ہے، مؤثر مستقل نہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ فضل و رحمت عمل خالص سے متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ." یعنی بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے اور احسان سے مراد عمل خالص ہے اس لیے کہ احسان کی تفسیر حدیث میں یہ آئی ہے: "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ"[2] (تو خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے وقت یوں خیال کر کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے) اور اس عمل کا موقوف علیہ طلب صادق ہے بس وہ

---

[1] (الصحیح لمسلم صفات المنافقین ب:۱۷، مشکوٰۃ: ۲۳۷۲)

[2] (الصحیح للبخاری ۶: ۱۴۴، کنز العمال: ۵۲۴۹)

اس کو دیکھتے ہیں کہ بندہ ہماری طرف متوجہ بھی ہوا ہے یا نہیں۔ اگر طلب نہ ہو تو عمل نہیں ہوتا اور عمل نہ ہو تو فضل متوجہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ. (یعنی کیا ہم تم کو اپنی رحمت چپکا دیں اور تم اس سے کراہت کرنے والے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ رحمت اور فضل طلب ہی پر متوجہ ہوتا ہے پس اول طلب صادق ہے اس کے بعد عمل ہے پھر عطا جو کچھ ہوتا ہے وہ فضل سے ہوتا ہے۔ دیکھو دودھ دینے والی ماں ہی ہے لیکن وہ اس کی منتظر رہتی ہے کہ بچہ مانگے بچہ کا فعل صرف اس قدر ہے کہ وہ ماں کی طرف چلتا ہے باقی دینے والی ماں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

تا نگرید طفل کے جوشد لبن تا نگرید ابر کے خندد چمن

(بچہ جب تک روئے نہیں ماں کو بھی دودھ پلانے کا خیال نہیں آتا جب تک بارش نہ برسے چمن میں بہار نہیں آتی)

اور فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالاؤ پست

(پانی کی تلاش مت کرو بلکہ پانی کی پیاس پیدا کرو تا کہ تمہارے لیے پانی اوپر نیچے جوش مارنے لگے)

حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

سایہ معشوق گرافتاد بر عاشق چہ شد ماباو محتاج بودیم او بما مشتاق بود

(معشوق کا سایہ عاشق پر اگر پڑ گیا تو کیا ہو گیا' ہم اس کے منتظر تھے وہ ہمارا)

حافظ صاحب ذرا دل چلے اور آزاد ہیں اس لیے ان کے کلام میں ذرا آزادی ہے اور مولانا رومی اسی مضمون کو ادب سے فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالاؤ پست

(پانی کی تلاش مت کرو بلکہ پانی کی پیاس پیدا کرو تا کہ تمہارے لیے پانی اوپر نیچے جوش مارنے لگے)

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے اگر پانی کے طالب ہیں تو پانی بھی ان کا طالب ہے............!)

ہر کہ عاشق دید بس معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم ایں وہم آں

(جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق مت سمجھو اگرچہ نسبت دونوں طرف ہے)

آگے فرماتے ہیں:

عشق معشوقاں نہاں ست وستیر عشق عاشق بادو صد طبل ونفیر

(معشوق کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے عاشق کا عشق ظاہر و باہر ہے)

لیک عشق عاشقان تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

(لیکن عاشقوں کا عشق دبلا کر دیتا ہے اور معشوق کا عشق موٹا اور فربہ کرتا ہے)

یعنی حضرت حق کی محبت مخفی ہے اس لیے کہ وہ ذات پاک انفعال سے بری ہے اور ہمارے اندر انفعال ہے اس لیے ہمارے عشق کا شور وغل ہے بہر حال حق تعالیٰ کی رحمت خود ڈھونڈتی ہے صرف تھوڑی سی طلب ہماری ہونی چاہیے آگے وہ خود توفیق ویسے عطا فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: "**فاما من کان من اھل السعادۃ فسیسر لعمل اھل السعادۃ**"[1] (یعنی جو شخص اہل سعادت سے ہے اس کو اہل سعادت کے عمل سہل کر دیئے جاتے ہیں)

ہمارے اعمال کی مثال

پس ہمارے اعمال کی اور حق تعالیٰ کے عطا کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کریم ہو اس کے پاس جو سائل زنبیل لے کر جاتا ہے اس کو دیتا ہے اور جس کے پاس زنبیل نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ دینے کے لیے تو میرے پاس سب کچھ ہے لیکن میں اس لیے نہیں دیتا کہ تم زنبیل لے کر نہیں آئے اور زنبیل بھی اس نے ہی عطا کی ہے۔ پس ہمارے اعمال بمنزلہ زنبیل کے ہیں کہ وہ بھی ان کی ہی توفیق سے ہیں، باقی دیتے ہیں محض فضل سے۔ دوسری مثال اور لیجئے جن کے گھروں میں بچے ہیں ان کو شب وروز یہ قصہ پیش آتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ ہے جو دور کھڑا ہے اور ہم نے اس کو بلایا اور ہم کو یہ معلوم ہے کہ کتنی سعی کرے لیکن ہم تک نہیں پہنچ سکتا لیکن ہم اس کے منتظر رہتے ہیں کہ دیکھیں یہ کیا کرتا ہے۔ وہ بچہ چلتا ہے اور گر پڑتا ہے پھر

---

[1] (الدر المنثور ۶: ۳۵۹)

اٹھتا ہے پھر گرتا ہے، یہاں تک ہے کہ جب وہ اپنی کوشش پوری صرف کر دیتا ہے اور پھر بھی یہ مسافت اس سے قطع نہیں ہوسکتی تو رونے لگتا ہے پھر یہ ممکن نہیں کہ اس کو روتا دیکھ کر ہم کو صبر آوے فوراً دوڑ کر اس کو اٹھا لیتے ہیں۔ پس یہ مسافت واقع میں ہم نے ہی قطع کی ہے لیکن بعد اس کے گرنے اور کوشش کے بچہ اگر یہ سمجھے کہ یہ مسافت میں نے قطع کی ہے تو وہ نادان ہے اسی طرح ہمارا عمل ہے کہ وہ ہم کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے والا نہیں ہے لیکن شرط کے درجہ میں ضروری ہے کہ باقی کام فضل ہی سے ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

خود بخود آں بت عیار ببرمی آید — نہ بزور نہ بزاری نہ بزرمی آید

(خود بخود ہی وہ تو اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہے بغیر قوت بغیر رونے دھونے کے)

اس شعر میں بت عیار کا لفظ حق تعالیٰ شانہ کی شان میں بے ادبی ہے اس لیے میں نے اس کو اس طرح بدل دیا ہے۔ ع خود بخود آں شد دلدار الخ۔

تقرب خداوندی

اور نرے اشعار ہی سے یہ مضمون ثابت نہیں بلکہ حدیث قدسی میں ہے:

من تقرب الى شبراً تقربت اليه ذراعا ومن تقرب الى ذراعًا تقربت اليه باعا ومن اتانى يمشى اتيته هرولةً.[۱]

(یعنی حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میرے پاس چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں) پس یہ راہ عشق تقرب سے قطع نہیں ہوتا بلکہ تقربت سے ہوتا ہے اور العبد واصل مجازاً کہا جاتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے اللہ واصل الی العبد اب آپ کو اس تقریر سے عمل کا درجہ معلوم ہوگیا کہ وہ نہ مؤثر تام ہے اور نہ مستغنی عنہ پس جب عمل کی یہ حالت ہوئی تو اس پر عجب اور ناز نہ کرنا چاہیے بلکہ عمل کر کے فضل کی طلب ہونا چاہیے۔ اس لیے ارشاد ہے: "وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ" (اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو) اب یہاں پر شبہ ہوسکتا تھا کہ ہم فضل کا سوال کریں لیکن معلوم نہیں کہ ہماری درخواست کی وہاں تک اطلاع بھی ہوگی اور اگر اطلاع ہوگی تو ہم کو وہی شے ملے گی بھی یا

---

۱ (مسند احمد ۲: ۴۱۳، کنز العمال: ۱۱۷۹)

نہیں اس لیے آگے اس شبہ کو زائل فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا." (یعنی اللہ تعالیٰ بے شک ہر شے سے واقف ہیں) پس سائل کے سوال کی بھی اطلاع ہے اور جب خود سوال کا امر فرمایا ہے تو سوال پر دیں گے بھی ضرور۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شے تم مانگتے ہو وہ نہیں ملتی مگر اس سے اعلیٰ درجہ کی شے دے دیتے ہیں کہ تمہارا ذہن بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی سائل نے کریم سے ایک پیسہ مانگا اس نے ایک اشرفی نکال کر دیدی، اب اگر سائل عقلمند ہے تو نہایت خوش ہوگا اور مسرت سے پھولا نہیں سماوے گا اور اگر نادان ہے تو شکایت کرے گا کہ ہم نے ایک پیسہ مانگا تھا وہ ہم کو نہ ملا۔

ہماری دعا کی کیفیت

اسی طرح ہماری دعا کی کیفیت ہے کہ ہم جو کچھ مانگتے ہیں ہم کو بعض دفعہ وہی شے اور بعض مرتبہ اس سے بڑھ کر ملتی ہے لیکن چونکہ ہم کو اس کی اطلاع نہیں ہوتی اس لیے شکوہ ہوتا ہے کہ میاں ہماری تو دعا کرتے کرتے زبان گھس گئی قبول نہیں ہوتی اور اس نادان کو یہ خبر نہیں کہ جو شے میں نے مانگی تھی مجھ کو اس سے بہتر مل گئی بلکہ یہ شخص اپنے لیے بعض مرتبہ ایسی شے کا سوال کرتا ہے کہ اگر وہ مل جائے تو اس کے لیے مضر ہے اس لیے وہ عطا نہیں ہوتی اس سے بہتر کوئی شے ملتی ہے اور خصوصاً دین کے متعلق جو دعا ہے وہ تو ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔ غرض دنیا کے متعلق دعا ہو یا دین کے متعلق وہ قبول ضرور ہوتی ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ دین تو چونکہ خیر محض ہے اس لیے وہ تو بعینہ عطا ہوتا ہے اور دنیا میں جو شے مانگتا ہے تو چونکہ بندہ اپنے مصالح سے واقف نہیں ہے اس لیے بسا اوقت ایسی شے کا سوال کر دیتا ہے جو اس کے لیے کسی طرح مصلحت نہیں ہے اس لیے بعض اوقات وہ شے بعینہ نہیں ملتی بلکہ اس کا کوئی نعم البدل ملتا ہے خواہ اس کو اس کی اطلاع ہو یا نہ ہو اور صاحبو! کوئی مانگنے والا ہو وہ تو بڑے دینے والے ہیں اور جو کچھ اب تک دیا ہے انہوں نے ہی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد
آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو خواب و خیال میں نہیں ہوتا وہ عطا کرتے ہیں)

خودکہ باید ایں چنیں بازار را که بیک گل می خرد انبار را

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لے)

تمام شبہات کا ازالہ

بہر حال "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا." (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) سے ایسے تمام شبہات کا ازالہ ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری دعاؤں کا بھی علم ہے اور یہ بھی علم ہے کہ کونسی شے تم کو دینا مناسب ہے آیا وہ جو تم نے مانگی ہے یا وہ جو اس سے بہتر ہے اس نے دی۔ ان شبہات سے فضل کی درخواست میں کوتاہی نہ کرو۔ الحاصل اس آیت سے بحمد اللہ فضائل کے متعلق تمام طبقات کی غلطیوں کی اصلاح باحسن وجوہ ہوگئی اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ اس آیت میں للرجال نصیب سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال وہ ہیں جو مردوں کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں اور بعض اعمال جو عورتوں سے زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں میرا اصل مقصود آج کے بیان سے ان اعمال ہی کا بیان کرنا تھا اور یہ خیال تھا کہ آیت کے ایک جزو "لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا" (مردوں کے لیے ان کے اعمال کا ثمرہ ہے) کا بیان مردوں کے مجمع میں ہوجائے گا اور دوسرے جزو یعنی "وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ" (اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا ثمرہ ہے) کا بیان عورتوں کے مجمع میں کر دیا جائے گا لیکن تمہید میں وقت گزر گیا اور مقصود تک نوبت نہ پہنچی مگر بحمد اللہ جس قدر بیان ہوا ہے فی نفسہ وہ بھی نہایت ضروری مضمون تھا۔ اس لیے صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اکتساب فضائل کا طریق

ہاں اب ضرورت اس کی ہے کہ اکتساب فضائل کا طریقہ اور مقصود العمل بتلا دوں پس جاننا چاہیے کہ وہ دو جزو سے مرکب ہے اول علم دوسرے عمل لیکن علم سے مراد مڈل پاس ہونا یا انٹرنس یا بی اے ہونا نہیں اس کو تو نادان لوگ علم کہتے ہیں اس کو علم کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے ہاتھی کی تصویر کو بچے ہاتھی کہتے ہیں بلکہ ہم تو علوم درسیہ مروجہ مدارس عربیہ کی بھی جبکہ وہ صرف الفاظ کے درجہ میں ہوں اور عمل اس کے ساتھ نہ ہو علم نہیں کہتے ہیں اور ہم کیا نہیں کہتے حق تعالیٰ نے خود ایسے علماء کو جاہل فرمایا۔ چنانچہ علماء یہود کی نسبت ارشاد ہے: "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" (کاش اگر وہ

جانتے) پس مراد علم سے وہ علم دین ہے جو خوف وخشیت کے ساتھ ہو لیکن اس کو سن کر کوئی یوں نہ سمجھے کہ ہم سب کو مولوی ہونے کو کہتے ہیں بلکہ اگر سب مولوی ہونا چاہیں تو ہم خود روک دیں گے اس لیے کہ سب مولوی ہو جائیں تو دنیا کا انتظام کون کرے بلکہ مراد ہماری یہ ہے کہ جو نوعمر فارغ ہیں اور قابلیت ان میں ہے ان کو علوم دینیہ درسیہ پڑھا کر عالم بناؤ اور جو دنیا کے کام میں مشغول ہیں وہ دو قسم کے لوگ ہیں جو ایک تو وہ جو پڑھے لکھے ہیں وہ اردو میں جو کتب دینیہ علماء محققین کی تصنیف ہیں کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں خود دیکھنا کافی نہیں اور جو پڑھے لکھے نہیں ان کے لیے ہر محلّہ میں اس کا انتظام ہو جاوے کہ مسجد میں جب نماز کے لیے جمع ہوں تو جو ان میں پڑھا ہوا ہو وہ پہلے خود کتاب کا مطالعہ کر لے اور جو مقام سمجھ میں نہ آئے ان کو کسی عالم سے حل کر لے اور اگر کوئی عالم وہاں موجود ہوں تو ان سے پڑھ لے اور پھر یہ ان کو سنایا کرے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں یہ ان پڑھ لوگ ضرورت دین سے واقف ہو کر مولوی بن جاویں گے لیکن اس سے یہ شبہ نہ کرو پھر ان مدارس کی کیا ضرورت رہے گی اس لیے کہ یہ علم دین جو تم کو حاصل ہوگا یا اب جس قدر حاصل ہے انہی علماء باضابطہ کی بدولت ہے اور عورتوں کے لیے یہ طریقہ ہے کہ مرد ان کو سنایا کریں جو پڑھے ہوئے ہیں کتاب پڑھ کر سنایا کریں اور جو ان پڑھ ہیں وہ جو مسائل مساجد میں سے سن کر آویں وہ سنایا کریں بلکہ اس کا بھی قصد نہ کریں کہ عورتیں جمع ہو کر اپنا کام دھندا چھوڑ کر سنیں بس گھر میں پڑھنا شروع کر دیا کرو اس طریقہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہوگا بلکہ میں تو اس قدر وسعت دیتا ہوں کہ اگر عمل کا ارادہ بھی نہ ہو تب علم بھی حاصل کر لو ان شاء اللہ بہت سے مفاسد کم ہو جاویں گے دین کے بھی اور دنیا کے بھی کم از کم اسی قدر فائدہ ہوگا کہ جن گناہوں کو گناہ نہیں سمجھتے ان کو گناہ سمجھنے لگیں گے رفتہ رفتہ ندامت پیدا ہوگی اور کسی وقت اگر رائے بدلی تو اس وقت اپنے پاس عمل کرنے کے لیے ایک ذخیرہ مفت میں حاصل ہوگا اور اگر رائے بدلی اور ندامت ہوئی اور علم نہ ہوا اور اتفاق سے کوئی موقع بھی ایسا نہیں ہے کہ عالم وہاں موجود ہو تو اس وقت سخت حسرت ہوگی اس وقت اس شخص کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی خارش میں مبتلا ہوا اول تو خشک تھی کھجلانے میں مزہ آیا اس وقت بہت سے اطباء اور اس کے خیر خواہوں نے اس کو نسخے بتلانا چاہے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ انہوں نے ہر چند کہا کہ میاں یہ نسخے استعمال مت کرنا لیکن تم ان کو یاد کر لو لکھ لو کام آئیں گے لیکن اس بھلے مانس نے کچھ نہ سنا رفتہ رفتہ وہ اطباء اس کے شہر سے چلے گئے رحلت کر گئے اور اس کی خشک خارش تر ہو گئی اور تمام بدن پھوٹ پڑا اور کوڑھ تک

نوبت پہنچ گئی۔ اس وقت اگر اس کو ایک آدھ نسخہ بھی یاد ہوتا تو کیسے کام آتا اس وقت بہت پچھتاتا ہے اور حسرت اور افسوس کرتا ہے لیکن اب کیا ہوتا ہے آخر وہ روز سیاہ دیکھنا پڑا کہ اسی میں ہلاک ہوگیا اور تندرستی کی شکل تک نہ دیکھی اور ایک اس بات کا التزام کرو کہ تم کو اپنے دنیوی یا دینی معاملات و واقعات میں جو صورت پیش آیا کرے اس کی تحقیق کرلیا کرو کہ شرعاً یہ صورت جائز ہے یا ناجائز اگر کوئی عالم تمہارے پاس موجود نہ ہو تو کسی عالم کے پاس خط بھیج کر دریافت کرلیا کرو اور نہ ڈرو کہ اگر ہم دریافت کریں گے تو عمل کرنا فرض ہوجائے گا اس لیے کہ مرض بھی ہے۔

وجوب عمل علم پر موقوف نہیں

جیسے ایک ڈوم کی حکایت ہے اس نے وعظ میں سنا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہوجاتا ہے اس نے کہا کہ میں چاند ہی نہ دیکھوں گا اور ۲۹ شعبان سے گھر کے اندر محبوس ہوکر بیٹھ گیا' کھانا بھی وہاں کھاتا اور پاخانہ پیشاب بھی وہاں کرتا' ایک روز بیوی نے کہا کہ کم بخت تجھے کیا ہوگیا' ایسا کیوں احدی بن گیا کہ گھر میں ہگتا موتتا ہے' بیوی کے کہنے سننے سے باہر نکلا مگر اس صورت سے کہ منہ پر کپڑا رکھے ہوئے اور آنکھوں کو چھپائے ہوئے کہ کہیں چاند نظر نہ آجائے' اسی ہیئت سے جنگل پہنچا اور قضائے حاجت کے بعد طہارت کے واسطے تالاب پر آیا اور نظر نیچے کیے ہوئے تھا' جب پانی کے پاس آیا تو تالاب میں چاند کا عکس نظر آ گیا تو آپ فرماتے ہیں کہ بندہ خدا میں تو تجھ کو دیکھتا نہیں تو کیوں خواہ مخواہ میری آنکھوں میں روزہ فرض کرنے کو گھسا آتا ہے' بڑے بڑے ثقہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم وعظ سنیں گے یا مسئلہ دریافت کریں گے تو اس پر عمل کرنا فرض ہوجائے گا اس لیے ہم سنتے ہی نہیں۔ یاد رکھو عمل کرنا بغیر سنے اور جانے بھی فرض ہے جب تم مسلمان ہو تو تمام احکام اسلام کے تم پر فرض ہیں۔ پس یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وجوب عمل علم پر موقوف ہے چونکہ تحقیق اور وجود خارجی عمل کے بغیر نہیں ہوسکتا پس علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے اس سے ایک واجب تو ادا ہوگا' دوسرے کو بھی توفیق ہوجائے گی۔ غرض پوچھا کرو کہ جائز ہے یا ناجائز اور علم سے دینی فائدہ یقینی ہے کم از کم کاموں میں جو خرابیاں اور گناہ پیدا ہوجاتے ہیں علم سے ان کی اصلاح ہوجاتی ہے اور نقصان دنیوی کچھ ہوتا نہیں اس کی ایک مثال عرض کردیتا ہوں اس سے یہ مضمون خوب واضح ہوجائے گا۔ مثلاً تم کو چاندی خریدنا منظور ہے اور چاندی کا نرخ مثلاً سستا ہے کہ روپیہ کی سوا تولہ آتی ہے تو اگر تم کو علم ہوگا تو تم دس روپیہ کی چاندی خرید کر روپیہ دے دو گے اور اس میں سود کا گناہ ہوگا جس کا ادنیٰ گناہ یہ ہے کہ جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا بتلائیے آپ کا اس سے کیا حاصل ہوا اگر آپ

مسئلہ کے موافق چاندی کی فروخت کرؤ گناہ سے بھی بچ جاؤ اور حرج بھی کچھ نہیں اور نہ اس میں کچھ مشقت ہے' مثال مذکور میں دس روپیہ کی چاندی آپ کو خریدنا منظور ہے تو آپ یہ کریں کہ نو روپیہ ایک روپیہ کے پیسے اس کو دو یا چار آنے ہی کے پیسے دے دو اس طرح سے سود نہ ہوگا اور گناہ سے بچ جاؤ گے اور نقصان بھی کچھ نہیں۔ پس خدا کے لیے علم ضرور حاصل کرلو' سستی نہ کرو کہ میاں کون سیکھے جب علم ہوگا تو کبھی نہ کبھی تم کو خدا تعالیٰ کے سامنے ضرور جھکا دے گا لیکن اس کو سن کر ڈرے ہو گے کہ ہم تو کبھی علم نہ سیکھیں گے اس سے ہمارے عیش میں خلل پڑے گا' نماز' روزہ کرنا پڑے گا۔ صاحبو! عیش برباد نہ ہوگا جس کو تم عیش سمجھ رہے ہو وہ سراپا کدورت اور مصیبت ہے' عیش کی تو صورت بھی نہیں دیکھی' طریقہ پر چلنے سے البتہ راحت اور عیش حاصل ہوگا۔

دستور العمل برائے عمل

الحاصل ایک جزو تو دستور العمل کا علم تھا جس کے متعلق بقدر ضرورت بیان ہو گیا' دوسرا جزو اس دستور العمل کا عمل ہے اس میں بالخصوص علماء اور طلباء سے خطاب کرتا ہوں کہ آپ حضرات جو نرے علم پر ناز کرتے ہیں اور فضائل و درجات عالیہ علم کا مستحق اپنے کو سمجھتے ہیں اور بے موقع عوام کے سامنے "فضل العالم علی الجاهل کفضلی علی ادناکم"[1] (عالم کی فضیلت جاہل کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے میرا مرتبہ تمہارے کم درجہ آدمی کے مقابلہ میں) پڑھ دیا کرتے ہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ فضائل کون سے علم کے ہیں' مطلق علم کے یا علم مع العمل کے' اگر عالم بے عمل کے لیے وعیدیں کتاب و سنت میں نہ ہوتیں تو تمہارا ناز کسی درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاتا اور جبکہ تم خود وعیدیں علماء سوکی دیکھتے ہو تو نفس علم کیسے باعث فخر آپ کے نزدیک ہے۔ یاد رکھو ایسا علم حجۃ اللہ علی العبد ہے خدا تعالیٰ کے لیے اس تار کو چھوڑ دو اور عمل میں کوشش کرو۔ ہمارے بعض طالب علموں کا خیال ہے ابھی تو ہم پڑھ رہے ہیں جب پڑھ لیں گے اس وقت عمل کریں گے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے جس گناہ کو تم آج نہیں چھوڑ سکتے اور جس طاعت کو اس وقت اختیار نہیں کر سکتے اور نفس پر تم کو قابو نہیں تو کل بطریق اولیٰ تم سے عمل نہ ہو سکے گا بلکہ آج عمل کرنا سہل ہے اس لیے کہ جس قدر مدت گزرے گی نفس کے اندر اخلاق رذیلہ زیادہ متمکن ہوں گے۔

درختیکہ اکنوں گرفت است پائے ۔۔۔ بہ نیروے شخصے برآید ز جائے

(جو درخت کہ ابھی لگایا گیا ہو اور جڑیں کمزور ہوں وہ کسی بھی آدمی کے کھینچنے سے اپنی جگہ سے اکھڑ جائے گا)

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۶۸۲' کنز العمال: ۲۸۷۹۵)

دگر ہمچناں روز گارے ہلی بگردونش از بیخ برنگسلی
چشمہ شاید گرفتن بہ میل چو پرشد نہ شاید گذشتن بہ پیل

(اور اگر کچھ دنوں تک یونہی چھوڑ دیا جائے تو گردوں سے بھی جڑ سے نہیں اکھڑ سکتا جو چشمہ آب سرمہ کی سلائی سے بند ہوسکتا ہے جب بھر جائے تو ہاتھی بھی شاید اس سے نہ گزر سکے)

مستحق فضائل

دوسرے یہ کہ اس وقت تو تمہارا علم تازہ ہے جب ابھی اس کا اثر نہ ہوا تو آئندہ ہوگا۔ گو ممتنع تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہوگا اس لیے اس خیال خام کو چھوڑ دو اور جو کچھ پڑھتے جاؤ ساتھ ساتھ عمل کرتے رہو اور اگر بدعملی کی یہی حالت رہی اور اسی حالت میں تحصیل علم سے فارغ ہو گئے اور مخدوم بن کر کہیں رہے تو لوگوں پر آپ کے اعمال کا بڑا اثر پڑے گا' اس کا گناہ بھی آپ پر ہی ہوگا اور عوام الناس کو جس قدر شکایتیں اور الزامات علماء پر ہیں وہ اس بدعملی کی بدولت ہیں اور عمل کرنے سے اس کی مراد صرف روزہ نماز اور بہت سی نفلیں مراد نہیں ہیں' نماز روزہ کو بفضلہٖ تعالیٰ آپ لوگ کرتے ہی ہیں بلکہ میرا روئے سخن بیشتر اخلاق کے متعلق ہے۔ تکبر تحاسد غیبت تباغض خصوص معاصی قلب کے اور معاصی نگاہ کے ان کو چھوڑ دو اور ان کے معالجہ کی فکر کرو اور خصوص وہ جو احوال کے متعلق ہیں خدا تعالیٰ سے خشیت اور محبت دین کی محبت اور جن سے نفع تم کو پہنچے ان کی اطاعت اور خدمت اختیار کرو اور بالخصوص حرص اور طمع کے پاس بھی نہ جاؤ اس سے دنیاداروں کی نظر میں آپ لوگوں کی بڑی سبکی ہوتی ہے اس لیے جہاں ادنیٰ احتمال بھی اس کا ہو ہرگز وہاں نہ جاؤ اور نہ وہ فعل اختیار کرو۔ اگر چہ تم تنگی کی حالت میں ہو' بالکل مستغنی رہو مگر استغناء میں اتنا بڑا نہ ہو کہ لوگ تم کو متکبر سمجھیں' میرا المقصود یہ ہے کہ نہ دنیاداروں سے تملق ہو اور نہ تکبر استغناء ہو تواضع لیے ہوئے اگر آپ لوگ اس طرح زندگی بسر کرو گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی نظر میں بھی معزز رہو گے۔ الحاصل اکتساب فضائل کا طریقہ علم و عمل ہے اگر اس پر عمل کریں گے تو آپ فضائل کے مستحق ہو جاویں گے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم سب کو توفیق عمل عطا فرماویں۔

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین. وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمدٍ وعلٰی الہ واصحابہ اجمعین.

الباطن

ازالہ غفلت وضرورت اصلاح باطن کے متعلق بمقام مسجد مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد ۱۳/ ربیع الاول ۱۳۲۶ ہجری یوم جمعہ ایک گھنٹہ ۵۵ منٹ چوکی پر بیٹھ کر خطاب فرمایا جس کو محمد مصطفیٰ بجنوری نے قلمبند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم. فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ۔[1]

ترجمہ: (بے شک اللہ تعالیٰ غافل قلب سے دعا قبول نہیں فرماتے)

ایک ضروری مضمون

یہ جملہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وعلی الہ وسلم نے ایک مضمون کی ضرورت عجیب عنوان سے ارشاد فرمائی ہے جو مجمل طور پر ترجمہ سے اور مفصل طور پر شرح سے ظاہر ہوگی۔ وہ مضمون بظاہر سرسری معلوم ہوتا ہے مگر واقع میں نہایت ضروری ہے اور ہم لوگوں نے اسی طرح اکثر ضروری مضامین کو سرسری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اور سرسری ہونا اس مضمون کا عنوان سے مفہوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی الفاظ میں اس کی ضرورت کو ظاہر کیا ہے مقدمات اور شکل کی صورت میں اس کو بیان نہیں فرمایا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سہل ہونے کی وجہ

اور یہ عادت ہے انبیاء علیہم السلام کی کہ تعلیم میں بہت سہولت فرماتے ہیں ان کی تعلیم میں کہیں پیچیدگی اور الجھن نہیں ہوتی۔ بخلاف دوسرے اہل فنون کے کہ ان کی تعلیم میں پیچیدگی اور الجھن ہوتی ہے بلکہ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ پیچیدگی اور الجھن ہو اور یہ کبھی تو

[1] (مسند احمد ۲: ۱۷۷، الترغیب والترھیب ۲: ۳۱۹)

اظہار کمال کے لیے ہوتا ہے کہ ہمارے ایسے دقیق علوم ہیں اور کبھی یہ پیچیدگی اور الجھن قلت شفقت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کو اس کی پروانہیں ہوتی کہ کسی کو یہ فن آوے یا نہ آوے۔ لہٰذا یہ لوگ ان فنون کے بیان میں سہولت کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ پہلی صورت میں تو عدم سہولت کا اہتمام ہوتا ہے کہ فن کو قصداً ایسا مشکل کر کے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہ آسکے۔ جب ہی تو ان کا کمال ظاہر ہوگا۔

اہل دنیا کا حال

اور دوسری صورت میں عدم اہتمام ہے سہولت کا کہ بے پرواہی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اتفاق سے کبھی سہل بھی ہو جاوے تو ہو جاوے لیکن ان کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ سہولت ہو ان دونوں صورتوں میں یہی فرق ہے۔ ایک میں قصداً مضمون کو مشکل کیا گیا ہے اور دوسری میں سہولت کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ پہلی صورت میں مضمون ہمیشہ مشکل ہوگا اور دوسری صورت میں کہیں مشکل ہوگا اور کہیں نہیں ہوگا۔

لیکن اس بات میں دونوں صورتیں شریک ہیں کہ مضمون سہل نہیں کیا گیا اور نیز اتنا عام فہم تو کبھی نہ ہوگا جتنا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ قصداً اہتمام سہولت کا کیا جاوے غرض دیگر علوم وفنون میں ہمیشہ پیچیدہ تقریر اور گنجلک مضامین ہوتے ہیں جیسے بعض شعراء اپنی نظم میں لغت بہت نئے نئے داخل کرتے ہیں تاکہ قادر الکلام اور فاضل سمجھے جاویں یا بعضے نثر میں بھی نئے نئے اور مشکل اور غریب لغت داخل کرتے ہیں اور اس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں، بعضے عربی داں عربی کی عبارت ایسی لکھتے ہیں کہ بغیر قاموس اور صراح کے سامنے رکھے ہوئے وہ سمجھ ہی میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح بعض فارسی داں ایسی فارسی لکھتے ہیں کہ اس میں ضرورت سے زیادہ عربی لفظ مفرد اور مرکب داخل ہوتے ہیں اور آج کل اردو دانوں میں تو یہ مرض بہت ہی ہے کہ کہنے کو تو ان کی عبارت اردو ہوتی ہے مگر بعض جگہ تو آدھی انگریزی اس میں شامل ہوتی ہے اور یہ نہیں کہ وہ اردو لکھ نہیں سکتے کیونکہ اردو تو مادری زبان ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جتلانا چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی کے ایسے قابل ہیں کہ انگریزی گویا ہماری مادری زبان ہوگئی ہے۔ یہ خبط اخباروں میں زیادہ ہے حالانکہ اخبار

کے موضوع کے یہ بات خلاف ہے کیونکہ اخبار سے تو خبروں کی اشاعت اور عام کرنا مقصود ہے اسی واسطے اخبار اردو کا نکالا جاتا ہے مگر جب اس میں آدھی انگریزی شامل ہے تو خبروں کو عموم کہاں ہوا۔ اس صورت میں تو ان مضامین کو انگریزی دان لوگ ہی سمجھیں گے اور ظاہر ہے کہ انگریزی دان ایک خاص جماعت ہے تو اخبار عام کہاں ہوا۔ یہ کیسی کھلی ہوئی بات ہے مگر اہل اخبار کی اس پر نظر نہیں۔

تصنع بھی عجیب مرض ہے

یہ تو اہل دنیا کا حال ہے۔ بعض اہل علم علوم شرعیہ میں بھی لغات ٹھونستے ہیں جس کا منشاء زیادہ تر تصنع ہے اور یہ تصنع بھی عجیب مرض ہے اس کی جب عادت ہو جاتی ہے تو اس میں کچھ لطف آنے لگتا ہے۔ ایک رئیس صاحب کو مرض تھا کہ ہر بات میں موٹے موٹے لغت بولتے تا کہ لیاقت اور قابلیت خوب ظاہر ہو مگر ایسے لوگ عوام ہی میں بیٹھ کر خوب لیاقت بگھارا کرتے ہیں۔ اہل علم کے سامنے بولیں تو معلوم ہو اول تو اہل علم کے سامنے ایسی ہمت ہی نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی ہمت کرے بھی تو راز کھل جائے اور غلطی پکڑ لی جاوے تو ان رئیس صاحب کو ایک دفعہ کاشتکاروں سے یہ پوچھنا تھا کہ بارش ہوئی ہے یا نہیں تو سیدھی بات تھی' یوں پوچھ لیتے کہ بارش ہوئی یا نہیں یا مینہ برسا یا نہیں مگر ان صاحب نے کس قدر رگت بنائی اس ذرا سی بات کی۔ آپ ان کاشتکاروں سے پوچھتے ہیں کیوں صاحبو! امسال کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں' وہ کاشتکاران کے منہ کو دیکھنے لگے' گنوار ہوتے ہیں بڑے ذہین شہری لوگ تو چکنے چپڑے بہت ہوتے ہیں بعض موقع پر ایسی بات کہہ اٹھتے ہیں کہ شہری کو کبھی بھی نہ سوجھے ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں چلو' جب یہ آدمیوں کی بولی بولیں گے اس وقت آنا۔

غرض عنوان کو مشکل اس واسطے کیا جاتا ہے تا کہ کوئی سمجھے نہیں کوئی ان سے پوچھے کہ پھر بات ہی کیوں کہی جب اس کا سمجھانا ہی مقصود نہیں' ایسی عبارت تو اس کا مصداق ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض شعراء اور اہل زبان کو بھی یہ خبط ہوتا ہے کہ قصداً اپنی عبارت کو مشکل کرتے ہیں' باقی عقلاء کے علوم وفنون کچھ تو مشکل ہوتے بھی ہیں لیکن زیادہ پیچیدگی طرز بیان سے بھی

ہو جاتی ہے۔ دیکھئے فلسفہ و منطق کو بڑا مشکل فن مانا جاتا ہے۔ حالانکہ فن درحقیقت زیادہ مشکل نہیں اس کا بیان البتہ بہت پیچیدہ ہے' غرض عقلاء کے فنون کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہیں کہ بہت سے مبادی اور مقدمات کو پیش نظر کر کے ان کے مطلب تک پہنچنا ہوتا ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں ان میں محنت بہت اور حاصل کم ہے بخلاف علوم شرعیہ کے کہ ان میں اس کا عکس ہے کہ محنت کم ہے اور حاصل بہت ہے۔

علوم محمودہ اور مذمومہ کی مثال

ایک طالب علم نے علوم محمودہ اور مذمومہ کے متعلق خوب فیصلہ کیا اس کی ایک فلسفی سے بحث ہوئی' فلسفی نے کہا دیکھو ہمارے علوم کیسے دقیق ہیں کہ تم جیسوں کی سمجھ میں بھی نہ آویں اور تمہارے کیا علم ہیں کہ نماز فرض ہے وضو ایسے ہوتا ہے اس میں کیا باریکی ہے اس نے کہا کہ تمہارے علوم تو ایسے ہیں جیسے سور کا شکار کہ مشکل تو اس قدر کہ گھوڑا بھی چاہیے اور بہت سے آدمی بھی چاہئیں اور ہتھیار بھی چاہئیں اور اس پر جان کا بھی خطرہ اور حاصل کیا ہوا سور جو سرا نہ کھانے کا نہ کسی مصرف کا۔

اور ہمارے علوم ایسے ہیں جیسے کبوتر کا شکار جو بے بندوق کے بھی مل جاوے۔ غلہ ہی سے مار لو جال ہی سے پکڑ لو اور ہر جگہ کثرت سے ہے۔ کہیں دور جانے اور کسی سامان کی ضرورت نہیں اور ایسا بے خطر کہ حملہ بھی کچھ نہیں کرتا' غرض نہایت سہل اور بے خطر اور پھر کام کا۔ کھانے کے کام میں آتا ہے زبان کا بھی مزہ اور غذا بھی۔ تو یہ شکار اچھا یا وہ شکار اچھا کہ جان ماری اور محنت کی اور خطرہ میں پڑے اور اخیر نتیجہ نکالا جاوے تو حاصل کچھ بھی نہیں' مردار اور نجس العین ہے۔

ایسا ہی تمہارا فلسفہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور آخر نتیجہ کیا کچھ بھی نہیں سوا اس کے کہ اشراقین کی یہ رائے ہے اور مشائین کی یہ رائے ہے' معلوم نہیں کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن سے ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا' اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی اور تمہیں کیا ملا کونسا ثواب' مشائین یا اشراقین کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔

حکماء اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں فرق

بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں اور فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں۔ ایک ذرا سی بات ہے مگر وہ طے ہی نہیں ہوتی خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیئے اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں، دقیق بے شک ہیں مگر اس وقت کا کیا حاصل ہے اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے تمام عمر اسی لوٹ پوٹ میں رہو کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا ٹھیک ہے اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے تب بھی اس کا کچھ حاصل نہیں، صرف ایک بات کا علم ہو گیا اس سے کام کونسا نکلا۔ دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ ان کی وجہ سے اس بحث کو معرکۃ الآراء ٹھہرالیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے یہ ذرا سی بات ہے مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کر دی ہیں، کوئی کہتا ہے مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے پھر سب طرف سے وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الٰہی توبہ دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں اگر تحقیق ہو بھی گیا اور امر واقعی معلوم ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو اور اگر تحقیق نہ ہوا اور امر حق معلوم نہ ہوا تب بھی ثمرہ نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مترتب ہوگا۔

بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی معجون کھاویں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اس کی ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی، لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے اور وہ کھا لیتے ہیں اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مترتب ہے برابر حاصل ہوتی ہے حالانکہ ترکیب پکانے کی کسی کو بھی نہیں

آتی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم ہے کیونکہ اسے پلاؤ کھانے کو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا وہ ہے جس کو دوسرے لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ علم باورچی کو ہے اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے، صاحب علم ثمرہ سے محروم ہیں اب فرمائیے کہ علم اچھا یا ثمرہ۔

علوم حکماء اور علوم شرعیہ کا فرق

یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی ہیں اور انہوں نے ان کو منتہائے نظر قرار دے رکھا ہے اور ثمرہ حاصل ہے شرعیات جاننے والوں کو انبیاء علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھلایا ہے مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھلایا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے، ع چو دم بر داشتم مادہ برآمد

اور یہ میں غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انہوں نے تمام عمر سر مار کر طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں اب دیکھ لیجئے کہ وہ کارآمد ہیں یا نہیں، جب غلط ہیں تو کارآمد کیسی تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی، بناء تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے یعنی شفقت لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا، یہ بڑی نادانی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے بعضے مدرس درس کے وقت گٹھل تقریر کرتے ہیں اور بات خواہ معمولی ہی سی ہو مگر اس کو موٹے موٹے الفاظ میں اور پیچیدہ عنوان سے بیان کرتے ہیں اور طالب علموں کا بھی آج کل یہی مذاق ہو رہا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی مدرس کے بڑے معتقد ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بڑے قابل شخص ہیں اور کتاب خوب پڑھانا جانتے ہیں اور جو محقق لوگ ہیں وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل کر کے بیان کر دیتے ہیں مگر بعض طالب ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم سرسری اور عامیانہ ہے اور یہ تو بازاری

شخص ہیں، خوب یہ قدر ہوئی ان کی لیاقت کی اور ان کو اس شفقت کے بدلہ میں کہ انہوں نے مضمون کو ایسا سہل کر دیا تھا کہ بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ خطابات عطا ہوئے اس احسان کا بدلہ یہی ہے کہ عام اور بازاری بنائے گئے لیکن سب برابر نہیں جو طالب علم سمجھدار ہیں اور جن کو تحقیق مقصود ہے وہ تو جب کتاب کے مضمون کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد استاد کی تقریر کو سنتے ہیں تو بھڑک اٹھتے ہیں اور دل سے تعریف کرتے ہیں کہ کیسے مضمون کو کس خوبی سے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا اور ان کی تقریر کو ہرگز سرسری نہیں سمجھتے۔

دقیق علوم وفنون کا مقصود

غرض یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ جو علوم فنون مشکل ہیں ان میں طالب کو نفع پہنچانا مقصود نہیں صرف اپنا نام کرنا مقصود ہے اور ان میں طالبین کے ساتھ ان کو شفقت نہیں اور جو علوم سہل ہیں اس کے موجد کو نفع پہنچانا مقصود ہے اس لیے محض شفقت کی بنا پر سہولت کو مدنظر رکھا ہے کیونکہ شفیق کو نام سے بحث نہیں ہوتی۔ دیکھئے باپ اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس میں کماحقہ لیاقت پیدا ہو جائے اس کے اخلاق بھی درست ہو جائیں، تہذیب میں بھی کوئی کسر نہ رہے، تعلیم میں بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے۔ حتیٰ کہ باپ اس میں بھی دریغ نہیں کرتا کہ بیٹا ان سب باتوں میں اس سے بھی بڑھ جائے مگر باوجود اس کے نام کرنا اور دکھلانا کبھی نہیں چاہتا۔ حتیٰ کہ اس کو اپنی طرف انتساب بھی مقصود نہیں ہوتا کہ یوں کہا جاوے کہ اس کو اس کے باپ نے اس قابل بنایا ہے بس محض شفقت سے بدون کسی غرض کے یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا اعلیٰ درجہ کا انسان ہو جائے پھر دیکھئے کہیں باپ بھی بیٹے کو الجھن میں ڈالتا ہے، ہرگز نہیں بلکہ مشکل سے مشکل کام کو آسان ذرائع سے سکھلاتا ہے تو کیا بیٹے کو یہ کہنا چاہیے کہ یہ تو معمولی باتیں ہیں اور میرا باپ کسی قابل نہیں جو مجھے مشکل کاموں میں نہیں ڈالتا، انصاف تو یہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ محض باپ کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ سہولت پسند ہے۔

شفقت انبیاء علیہم السلام

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شفقت اُمت پر نہایت درجہ ہوتی ہے کہ باپ کی شفقت بھی ان کے سامنے کوئی چیز نہیں اور اس کی تصدیق قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں: "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا

مُؤْمِنِیْنَ" (یعنی آپ کی حالت یہ ہے کہ شاید آپ اپنی جان کھودیں گے اس رنج میں کہ یہ مومن نہیں ہوتے) اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جان پر کھیل کر امت کے واسطے محنت کی ہے اس عنوان سے بے حد محبت اور شفقت ٹپکتی ہے یہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ نے "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ" بطور مبالغہ کے فرمادیا ہے کہ آپ اپنی جان کھودیں گے کیونکہ حق تعالیٰ کے کلام میں مبالغہ نہیں ہوتا کلام اللہ شاعرانہ کلام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نظم میں نہیں اتارا گیا کیونکہ نظم کے حسن میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں مبالغہ ہو دیکھئے شاعروں کے کلام میں کس قدر مبالغہ ہوتا ہے بلکہ شعرا تناہی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے جتنا اس میں مبالغہ زیادہ ہو جتنے بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے جاویں اتنی ہی تعریف کی جاتی ہے۔ خدوخال اور کمر کی تعریفیں شعراء کے کلام میں دیکھ لیجئے کہ کیسی ہیں الٰہی تو بہ مبالغہ سے گزر کر کذب تک نوبت آ گئی ہے۔ قرآن شریف تو محض نصیحت ہے۔

کلام الٰہی کی نئی بات

اس میں مبالغہ کی کیا ضرورت اور کیا گنجائش ہے قرآن شریف میں سچی سچی باتیں ہیں اور جو قصے ہیں وہ بھی سچے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ سچا قصہ ہمیشہ مبالغہ سے خالی ہوتا ہے دیکھ لیجئے جو قصے بالکل سچے ہیں اور جن میں صرف تاریخی واقعات نقل کیے گئے ہیں ان میں مبالغہ کہیں نہیں ہوگا بلکہ ان کی عبارت شاعرانہ بھی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے پڑھنے والوں کو ان میں کچھ لطف نہیں آتا مگر کلام الٰہی میں یہ نئی بات ہے کہ باوجود سیدھا سیدھا کلام ہونے کے اور باوجود سچے قصے ہونے کے اس میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ نہایت دل کش ہے اس کی عبارت بھی ایسی ہے کہ پڑھنے سے لطف آتا ہے سچے کلام کو دلربا کبھی نہ دیکھا ہوگا مگر قرآن شریف باوجود سچا کلام ہونے کے اعلیٰ درجہ کا دلربا بھی ہے یہ اعجاز ہے قرآن شریف کا۔ حسن بمقابلہ دوسرے کلاموں کے ایسا ہے جیسے ایک شخص تو قدرتی حسین ہے کہ خود ہی دلربا ہے نہ اس کو کسی بناوٹ کی ضرورت ہے نہ اس کا حسن کسی وقت جاسکتا ہے اور ایک وہ حسین ہے جو بناٹھنا بیٹھا ہے مانگ پٹی جمی ہوئی ہے زیور سے آراستہ ہے اس کا ساز وسامان بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اس کا حسن محض بناوٹ ہی بناوٹ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ حسن اس حسن خداداد

کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں ہے، کتنی ہی بناوٹ کی جاوے مگر وہ دلربائی اس میں کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو خداداد حسن میں ہے آخر قدرتی قدرتی ہے اور مصنوعی مصنوعی ہے۔ یہ حسن نہ اس کے برابر دل کش ہے نہ اس کو قیام ہے، ابھی ساز و سامان زیور الگ کردو مانگ پٹی بگاڑ دو تو بس کچھ بھی نہ رہے، بخلاف قدرتی حسن کے کہ وہ ہر وقت یکساں ہے، یہی حالت کلام الٰہی کی ہے کہ اس میں مبالغہ نہیں، جھوٹ نہیں، تصنع اور تکلف نہیں، پھر بھی دلکش ایسا ہے کہ دوسرا کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

کلام اللہ میں مبالغہ نہیں

خلاصہ یہ کہ کلام اللہ میں مبالغہ نہیں ہے پھر جو فرماتے ہیں: "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ" (شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر رنج کرتے کرتے اپنی جان دیدیں گے) تو یہ الفاظ ضرور اپنے حقیقی اور سیدھے سیدھے معنی پر محمول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے واسطے ضرور اتنی کوشش اور مشقت کی ہے جس میں جان بھی کھوئی جاتی تو تعجب نہ ہوتا۔

اب دیکھ لیجئے کہ وہ بات سچ ہوگئی یا نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو اُمت کے ساتھ ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے وہ تو بیلاگ اور بلا کسی طمع کے جس طرح بھی ان سے بن سکے امت کی خیر خواہی کرتے ہیں اور دل و جان سے یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاح ہوجاوے اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت کی کوئی نظیر دنیا میں موجود نہیں۔ اگر کچھ نا تمام نظیر ہے تو باپ کی شفقت ہے بیٹے کے ساتھ کہ باپ بلا کسی طمع اور بلا کسی غرض اور بلا کسی عوض کے بیٹے کی خیر خواہی کرتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ یہ درست کیوں نہیں ہوجاتا اور اسی رنج میں تڑپتا ہے اس کے سوا اور کوئی نظیر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی نہیں ہے، باپ کو بیٹے کی تربیت میں کبھی یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ میرا نام ہو اور دس آدمیوں کے منہ سے تعریف سنوں یہی حال انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ ہمہ تن اُمت کی اصلاح میں کھپ جاتے ہیں اور ان کو اس سے کسی قسم کا بدلہ مقصود نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے واسطے کس قدر مشقتیں اور نااہلوں سے تکلیفیں اٹھائیں لیکن ان کا برا نہیں چاہا ایسے شخص سے یہ کب ہوسکتا ہے کہ تعلیم کو مشکل کردے ہرگز نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو منظور یہ تھا کہ ہم راہ پر آدیں اور کسی الجھن میں نہ پڑیں اس واسطے تعلیم کو نہایت سہل کیا۔

بعض شفیق مصنفین

اسی طرح مصنفین میں بھی جو شفیق ہوتے ہیں وہ اپنی کتاب کو مشکل نہیں کرتے کیونکہ ان کو غرض یہ ہوتی ہے کہ ہماری کتاب سے فائدہ اٹھایا جاوے نہ یہ کہ ہمارا کمال اور ہماری لیاقت ظاہر ہو بعض شفیق مصنفین نے تو کتاب میں اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ دیکھئے کافیہ اور شافیہ میں مصنف نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ پھر دیکھو دونوں کیسی مقبول ہوئیں، مصنف نے تو نام بھی نہیں لکھا تھا لیکن خدا کی قدرت ہے کہ دنیا بھر میں اس کتاب کی اور صاحب کتاب کی کیسی شہرت ہوگئی۔ خوب کہا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر شہرت کی خواہش رکھتے ہو تو گوشہ تنہائی کے جال میں پھنسو اس لیے کہ عنقا کے نام کی گوشہ گیری ہی کی وجہ سے شہرت ہے)

اس کا راز یہ ہے کہ بنائے مقبولیت خلوص ہے۔ جس کام میں جتنا خلوص ہوتا ہے اتنا ہی مقبول ہوتا ہے اور اس میں اتنی ہی برکات ہوتی ہیں اور از خود لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف کشش ہو جاتی ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

کعبہ را ہردم تجلی میفزود ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

(کعبہ کے لیے ہر وقت تجلیات کی زیادتی ہوتی ہے صرف اس لیے کہ اس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خلوص نیت سے رکھی تھی)

کعبہ میں اینٹ اور پتھر ہی تو ہیں مگر رکھے گئے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے جن میں سراسر اخلاص تھا، اسی لیے اس میں انوار و تجلیات و برکات ہیں اور غایت درجہ دلکشی ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا کعبہ (اس سے مراد وہ کعبہ ہے جو ابرہہ بادشاہ نے کعبہ شریف کے مقابل میں بنایا تھا اور اس نے کعبہ شریف کے شہید کرنے کے لیے ہاتھیوں کو فوج کے ساتھ ارادہ کیا تھا اس کا قصہ سورہ الم ترکیف میں مذکور ہے) بھی بنایا گیا تھا جو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اس سے بڑھا ہوا تھا مگر اس میں یہ باتیں پیدا نہ ہوئیں اور جو حشر اس کا ہوا سب کو معلوم ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بناء ابراہیم میں خلوص تھا اور اس بناء میں خلوص تو کیا ہوتا خلوص کا مقابلہ کیا گیا تھا تو اثر میں بھی مقابلہ ہوا۔

اظہار لیاقت سے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچتا

بس یہ راز ہے مقبولیت کا جن تصنیفات میں قابلیت دکھائی جاتی ہے ان میں مقبولیت نہیں ہوتی کیونکہ خلوص نہیں ہوتا جب نام چاہا تو خلوص کہاں اس لیے مخلص شفیق مربی کو اپنے کمال کا یا اپنی شفقت کا اظہار کبھی مدنظر نہیں ہوتا' اس واسطے وہ ہر بات میں سہل عنوان تجویز کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ اس کی عبارت کیسی ہے وہ بعض وقت دیہاتی اور گنوارو بولی بھی اختیار کر لیتا ہے اور جس طرح بھی طالب کو نفع پہنچے وہی طرز اختیار کرتا ہے نہ اسے نام سے بحث ہوتی ہے اور نہ اس سے کہ کوئی مجھے گنوار کہے گا وہ تو سراپا طالب کی نفع رسانی میں منہمک ہوتا ہے بعض وقت عبارت اس کی ظاہراً جامع اور مانع بھی نہیں ہوتی مگر ایسی ہوتی ہے کہ طالب کے ذہن میں مطلب کو اتار دیتی ہے اس سے سب کی بناء وہی شفقت ہی ہے۔ دیکھئے بچے کے ساتھ بسا اوقات بات کرنے میں باپ تو تلا بن جاتا ہے اور جیسے وہ بولتا ہے باپ بھی اس کے ساتھ ویسے ہی بولنے لگتا ہے۔

شفقت کا مقتضا

اس کو مولانا نے بھی ایک شعر میں لکھا ہے جو اس وقت یاد نہیں آتا۔ اس وقت باپ کو اس سے عار نہیں آتی کہ میں کس طرح بول رہا ہوں اور کوئی مجھے تو تلا کہے گا۔ وجہ اس کی کیا ہوتی ہے۔ محض یہی کہ بچے کو حقائق سکھلانا مقصود ہوتا ہے اس لیے باپ اس کا ہم رنگ بن جاتا ہے تاکہ اس کا انس بڑھے اور جو بات اس کے ذہن میں پہنچاتا ہے وہ اچھی طرح پہنچ جائے کیونکہ جب وہ بچہ خود تو تلا بولتا ہے تو اسی طرح کی بولی کو سمجھ بھی اچھی طرح سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ باپ کے اس تو تلا بن جانے کو کوئی بھی برا نہیں کہتا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس کی بناء شفقت پر ہے۔ غرض شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ تعلیم سہل ہو۔ اسی واسطے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا خاصہ ہے کہ وہ سہل ہوتا ہے تاکہ طالب کو سہولت ہو' یہ رحمت تو شکر کے قابل تھی لیکن لوگوں نے اس کو الٹا سمجھا اور افسوس ہے کہ آج کل یہی وجہ ہو گئی اس کلام کی بے قدری کی غرض چونکہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہم کو سہولت

سے حاصل ہو گئیں اس واسطے ان کو نظر انداز کر دینا ہمارے نزدیک کچھ بات نہ ہوئی۔

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بہ قرص ناں دہد

(جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں ہی دیتا ہے ایک ناسمجھ بچہ ایک روٹی کی ٹکیہ کو ایک قیمتی موتی کے بدلہ خرید لیتا ہے)

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے شخص تو مجھ کو صرف اسی لیے ذلیل سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے سستا جو خرید لیا ہے)

حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان کریمی

درحقیقت دیکھو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کتنے ارزاں مل گئے کیونکہ ایک عورت کے حاصل کرنے میں جس قدر کوشش کرنا پڑتی ہے اللہ تعالیٰ کے حاصل ہونے میں اتنی بھی تو کوشش کرنا نہ پڑی مگر افسوس اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس قدر بے قدری ہوئی مگر کیا مقتضائے عقل یہی ہے کہ سہل چیز کی بے قدری کی جائے۔

دیکھئے اگر کسی کو ایک ہزار روپیہ کی تھیلی کہیں اتفاقیہ پڑی ہوئی مل جاوے تو کیا اس وجہ سے کہ وہ بے محنت مل گئی ہے اس کو پھینک دینا چاہیے کونسا عقل مند یہ کہہ سکتا ہے نہیں بلکہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اس چیز کو دیکھا جاوے کہ وہ چیز کس حیثیت کی ہے اگر وہ چیز عظیم الشان اور قابل قدر ہے تو صرف اس وجہ سے کہ سہولت سے حاصل ہو گئی ہے اس کی بے قدری نہیں چاہیے بلکہ اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ ایسی گراں بہا چیز بے مشقت ہاتھ آ گئی ہے اور لیجئے حق تعالیٰ کی تعلیم کی جس قدر بے قدری ہوئی اس کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہم سے اس کو ہٹالیا جاتا مگر رحمت پر رحمت دیکھئے کہ باوجود اس ناشکری اور بے قدری کے تعلیم سے بھی ہم کو محروم نہیں فرماتے فرماتے ہیں۔ "اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُسْرِفِيْن." (یعنی فرماتے ہیں کیا ہم تم سے نصیحت کو روک لیں اس وجہ سے کہ تم لوگ حدود سے نکل جانے والے ہو)

کس قدر شفقت اور رحمت ہے کہ کجا شان خداوندی اور کجا بندہ اور اس کی یہ ناشکری اور بے قدری لیکن وہ خیر خواہی نہیں چھوڑتے' اللہ کی شان تو بڑی ہے۔

علماء ربانی کی شان

علماء ربانی کی شان بھی یہی ہے کہ لوگ ان کو کیسا ہی ستادیں اور کیسی ہی مخالفت کریں اور کیسی ہی ان کے ساتھ گستاخی کریں لیکن وہ کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے' نہ نصیحت سے رکتے ہیں وہ جب چاہیں گے بھلا ہی چاہیں گے۔ان کا تو یہ مشرب ہوتا ہے۔

حافظ وظیفہ تو دعاء گفتن است و بس　　　　در بند آں مباش شنید یا مشنید

(اے حافظ تمہارا کام تو صرف دعاء کرنا ہے اور بس اس فکر میں مت رہو کہ اس نے سنی یا نہیں سنی)

اہل اللہ کے بہت سے قصے ایسے سنے ہوں گے کہ لوگوں نے ان کو مارا پیٹا' تکلیفیں دیں' لیکن ان کے منہ سے سوائے دعاء اور نصیحت کے کچھ نہیں نکلا' یہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے جب مظہر رحمت کا یہ حال ہے تو خود اصل جن کی رحمت کا یہ ظہور ہے کیا شان ہوگی' ظاہر ہے کہ وہاں تو رحمت بدرجہا زیادہ ہوگی' غرض اسی رحمت اور شفقت کا ظہور ہے کہ حق جل شانہ کی تعلیم کا یہ طرز ہے کہ اس کو نہایت آسان اور سہل رکھا ہے' بندوں کو کسی الجھن میں نہیں ڈالا۔

مضامین کے مفید ہونے کی عجیب مثال

چنانچہ اس حدیث میں ایک نہایت ہی ضروری اور بہت ہی گہری تعلیم ہے مگر الفاظ نہایت سرسری ہیں' اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ کس درجہ معمولی عنوان ہے' کوئی سخت لغت ان میں نہیں بلکہ مضمون بھی دیکھنے میں بہت دقیق اور عالی نہیں جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ تو سہل ہیں ہی مضمون بھی بہت ہی معمولی ہے کیونکہ حدیث میں تین چار لفظ ہیں جن کے معنی بھی وہ ہیں جو رات دن زبان پر آتے ہیں کوئی نئے معنے نہیں ہیں مگر وہاں تو نظر مفید ہونے پر ہے' مضمون کے دقیق و عالی ہونے پر نہیں ہے۔مضامین کا عالی ہونا مفید ہونے کے سامنے کوئی چیز نہیں۔

دیکھیے حکیم محمود خان کے نسخے باعتبار مضمون کے عالی نہیں ہوتے اور ان میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کسی شاعر کے کلام نظم یا نثر میں ہوتا ہے لیکن کام کی چیز نسخے ہی ہوتے ہیں' نظم و نثر کام کے نہیں ہوتے کیونکہ نسخوں پر صحت متفرع ہوتی ہے اور صحت کے بعد ہی سارے کام ہو سکتے ہیں' شاعر شعر بھی جب ہی کہہ سکتا ہے جبکہ دماغ صحیح اور طبیعت حاضر ہو اور یہ نسخہ کے استعمال پر موقوف ہے۔

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد

(جب دل ہی غمگین ہو اور ٹھکانہ سے نہ ہو تو شعر کب صحیح اور رنگین نکل سکتا ہے)

تو گو نسخہ میں مضامین عالیہ نہیں ہیں لیکن مضامین عالیہ کی جڑ وہی ہے۔ دیکھئے نسخہ میں کچھ بھی پیچیدگی نہیں ہوتی' الفاظ بھی معمولی اور اجزاء بھی معمولی۔ یہی بنفشہ کاسنی وغیرہ کہ بہت ہی معمولی دوائیں ہیں مگر محمود خان کا یہی کمال سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نسخہ ہی ہے گو دلچسپ عبارت نہ ہو اور شعر گو دلچسپ ہے جس میں مضامین عالی ہیں مگر کارآمد مطلق نہیں۔ محمود خان کے نسخوں سے مایوس مریضوں کو فائدہ پہنچتا تھا اور بڑے بڑے کام نکلتے تھے۔ بخلاف ذوق اور مومن کے کلام کے کہ مضامین تو ان میں ایسے عالی کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں اور لوگ ان پر وجد کرتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کذب محض پر جھومتے ہیں اور نسخہ میں دو ہی تین اجزاء ہیں اور وہ بہت ہی مبتذل اور مستعمل لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذوق کی کسی غزل سے خواہ وہ کیسی ہی بڑھیا غزل ہو فائدہ کسی کو نہیں پہنچتا اور نسخہ سے فائدہ پہنچتا ہے بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ صرف اس کاغذ ہی کو گھول کر پلا دیا تو بوجہ حسن عقیدت کے شفا ہو گئی اور غزل سے کہیں ایسا نہ سنا ہوگا۔

مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوتی

غرض مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوا کرتی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مفید ہونے پر ہے' مضمون کے عالی ہونے اور الجھن میں ڈالنے کی نہیں ہے اور قرآن میں تو ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ باوجود عدم رنگینی کے دلربائی بھی ہے حالانکہ نظم نہیں ہے اگرچہ نظم ہونے میں بھی کوئی ضرر نہ تھا کیونکہ یہ نفع تھا کہ ذرا دلفریبی بھی ہوتی مگر چونکہ اس میں تکلیف تھی اس واسطے پسند نہیں کیا گیا اس میں تعلیم ہے ترک تصنع کی وہاں دلفریبی اور کسی کا دل کھینچنے کی طرف خیال ہی نہیں وہاں تو دل دیتے ہیں دلربائی ان کا پیشہ نہیں بلکہ ان کا شعار دل بخشی ہے اس واسطے دلفریبی کی کیا ضرورت تھی۔ بس کام میں لگا دیا ہے اور زائد از کار باتوں کو چھوڑ دیا ہے۔

غرض شریعت کی تعلیم کا یہی طرز ہے کہ بناوٹ اور الجھن کا وہاں کام ہی نہیں' سیدھے سیدھے الفاظ ہیں اور عام فہم بات ہے ہاں تعلیم ایسی ضروری اور گہری ہے کہ دوسرا ایسی تعلیم

نہیں کرسکتا چنانچہ یہی تعلیم جو اس حدیث میں ہے دیکھ لیجئے اس میں کوئی تکلیف نہیں کوئی عبارت آرائی نہیں، کوئی مشکل لغت نہیں، سیدھے سیدھے لفظ ہیں اول عنوانات سے کام لیا ہے جو دن رات ہم بولتے ہیں اور بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

الفاظ حدیث کے لغوی معنی

فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ لَايَسْتَجِيْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ." [1] (اللہ تعالیٰ بے پروادل کی دعاء قبول نہیں کرتے) ان اللہ کو مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں۔ لایستجیب بھی بہت مستعمل لغت ہے دعاء تو ایسا لفظ ہے کہ اردو خواں تک بھی جانتے ہیں عن حرف ہے معنی از فارسی میں اور سے کے معنی میں اردو میں یہ بھی بہت ظاہر ہے قلب کا لفظ بھی اردو میں مستعمل ہے لاہ کو بھی اطفال مکتب جانتے ہیں کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور لھو سے مشتق ہے، لہو کے معنی غفلت کے ہیں تو لاہ کے معنی غافل ہوئے، پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ دعا کو غافل دل سے نہیں قبول کرتے۔

دیکھئے اس میں کوئی لفظ نیا نہیں کوئی معنی مشکل نہیں، ساری حدیث میں کوئی بات بھی نئی اور ناشناسا نہیں، وہ الفاظ ہیں جو دن رات بولے جاتے ہیں اور وہ معنی ہیں جن کو سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نئی بات ہے۔

شاید اس سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ پھر اس تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہوئی جب سب چیزیں وہی ہیں جو بارہا کی دیکھی بھالی اور جانی پہچانی ہیں تو اس تعلیم سے فائدہ کیا ہوا، مثلاً اگر کوئی کہے کہ اس وقت رات ہے تو یہ ایسی بات ہے جو سب کے ذہنوں میں ہے پھر اس جملہ کے کہنے سے کیا حاصل ہوگا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ گو عنوان اس حدیث کا بہت واضح ہے اور ترجمہ بھی سیدھا سیدھا ہے اجزاء اس تعلیم کے سب معمولی اور جانے پہچانے اور شناسا ہیں مگر ان شناسا اجزاء سے نتیجہ ایسا عجیب نکالا گیا ہے جو کہ شناسا نہ تھا، نتیجہ ایسا گہرا ہے کہ کیا مجال جو کوئی دوسرا وہاں تک پہنچ سکے، ان معمولی اجزاء کو جوڑ کر اس ناشناسا نتیجہ کو شناسا کیا گیا ہے یہ فائدہ ہوا اس کلام سے تو یہ جملہ ایسا نہ ہوا جیسے وہ جملہ تھا اس وقت رات ہے۔

---

[1] (مسند احمد ۲:۱۷۷، الترغیب والترھیب ۲:۳۱۹)

نسخہ کیمیا

اب اس کی مثال ایسی ہوئی جیسے کیمیا کا نسخہ کہ بہت معمولی ادویات سے مرکب ہوتا ہے اس کے اجزاء کچھ ایسے نہیں ہوتے جو امریکہ اور جرمن سے منگانے پڑیں بلکہ وہ نسخہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک جزو معلوم ہے مگر کیمیا بن جانا ترکیب کا نتیجہ ہے وہی اجزاء ہم دن رات استعمال کرتے ہیں مگر وہ ذرا سی ترکیب جس سے کیمیا بن جاوے ہم نہیں جانتے اس لیے کیمیا سے محروم ہیں۔ کیمیا میں ترکیب کو بڑا دخل ہے، بعض وقت ترکیب سے مرکب میں وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے ہر ہر جزو میں نہیں تھی جیسے عرق کافور کہ خشک اجزاء سے بنتا ہے۔ الگ الگ ایک ایک جزو خشک ہوتا ہے مگر سب کو ایک جا کر دینے سے بدون پانی کے پانی ہو جاتا ہے یہ صرف ترکیب کا اثر ہے جس کو یہ ترکیب معلوم نہ ہو وہ خشک اجزاء کو دیکھ کر کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ اجزاء بدون پانی کے دقیق ہو جائیں گے اور جس نے عرق کافور بنایا ہے اس نے کوئی نئی چیز نہیں بنائی، صرف چند اجزاء کو ایک تناسب کے ساتھ ملا دیا ہے جس سے ایک نئی چیز پیدا ہو گئی جو اس ملانے سے پہلے حاصل نہ تھی۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اہل اللہ کی تعلیمیں ہیں کہ عنوان ان کے نہایت سہل ہیں جن کو عامی لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ الفاظ ان کے کچھ غریب نہیں ہوتے اور قصداً مقفّی کیے ہوئے بھی نہیں ہوتے ان کے یہاں شاعری سے کام نہیں لیا جاتا لیکن کمال یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو ترکیب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس ترکیب سے وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے کے ترکیب دینے سے نہیں پیدا ہو سکتی یہ ہے ان کی خصوصیت جن کی بدولت ان کو تمام دنیا سے امتیاز حاصل ہے ان کے معمولی اور عام فہم الفاظ سے وہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کسی کا کان تو کیا کسی کا دماغ اور عقل بھی آشنا نہیں ہوتی اور وہ مضمون ایسا ہوتا ہے کہ بدون ان کے بتلائے کسی کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ ایک ایک جزو کو معمولی دیکھ کر مجموعہ کو معمولی اور سرسری کہہ دینا کیسے صحیح ہے جیسے عرق کافور کہ اجزاء فرداً فرداً تو معمولی ہیں کوئی ان میں سے نئی اور عجب چیز نہیں ہے لیکن ترکیب کا یہ اثر ہے کہ بدون پانی کے پانی بن جاتا ہے یہ ضرور عجیب ہے اس کو اس وجہ سے معمولی کہہ دینا کہ اس کے اجزاء معمولی ہیں صحیح نہیں۔

کمال کی قدر و منزلت

دیکھئے کیمیا گر کے لوگ کس قدر معتقد ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں' قلوب میں اس کی بڑی وقعت ہوتی ہے حالانکہ غور سے دیکھئے تو وہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ شناسا اجزاء سے ناشناسا کی رونمائی کر دیتا ہے کیا مطلب کہ وہ ایسی ہی چند مفرد دوائیں جن کو ہم تم سب جانتے ہیں ملا کر وہ چیز بنا دیتا ہے جو ہم تم نہیں بنا سکتے تو اگر معمولی اجزاء سے مرکب شدہ مجموعہ بھی معمولی سمجھا جا سکتا ہے تو کیمیا کے نسخہ کو بھی معمولی سمجھنا چاہیے اور کیمیا گر کی بھی کچھ وقعت نہ ہونا چاہیے حالانکہ حالت یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کیمیا گر کا نام لگ جانے سے خلقت اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے خواہ واقع میں وہ جھوٹا اور دھوکہ باز ہی ہو اور اگر کوئی واقعی کیمیا گر ہو اور لوگوں کو اس بات کا اطمینان بھی ہو جائے کہ یہ شخص جھوٹا اور مکار نہیں ہے تو اس صورت میں جو اس کی وقعت اور قدر ہوگی وہ تو محتاج بیان نہیں حالانکہ کام اس کا بھی یہی ہے کہ بہت ہی معمولی اور مستعمل اجزاء سے سونا اور چاندی بنا لیتا ہے اس کے نسخہ میں ایسے اجزاء نہیں ہوتے جن کے لیے یہ کہنا پڑے کہ فلاں جگہ سے منگاؤ اور فلاں جگہ سے منگاؤ جیسے ایک طبیب کے نسخہ میں ایک دوا تھی جس کا نام بیروج الصنم ہے۔ نسخہ ایک معمولی مرض کا تھا مگر دوا ایسی لکھ دی کہ لوگ پریشان ہو گئے' عمل دشوار اور مقصود معمولی یعنی ذرا سا مرض تھا چونکہ مریض کی غرض اٹکی ہوئی تھی' جھک مارا اور بیروج الصنم کو تلاش کر کے منگوایا یہ ترکیبیں تو دق کرنے کی تھیں اور یہ کچھ کمال کی بات نہیں کامل طبیب اور کامل کیمیا گر وہ ہے جو ایسا نسخہ بتلا دے جس کے اجزاء گھر ہی میں سے نکل آویں اور نتیجہ حاصل ہونے میں اکسیر ہو ایسا نسخہ ہونا چاہیے جس کی نسبت عوام تک میں تعریف کا یہ لفظ مشہور ہے کہ فلانے حکیم ایسے تھے کہ کوڑوں کا نسخہ لکھتے تھے اور نفع لاکھوں کا تھا۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ نسخہ قیمت میں تو کچھ کوڑیوں کا ہوتا تھا اور منفعت اور اثر میں ایسا کہ دوسرے طبیب کا روپیوں کا نسخہ بھی ایسا کامل نہ ہو یہ اس طبیب کے کمال کی دلیل ہے کہ سرسری اجزاء سے بڑے بڑے کام نکالتا ہے اور جو فن کو جاننے والا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے اور مریض بھی جب دیکھتا ہے کہ ایسے کم قیمت اجزاء سے ایک بڑے مرض کو فائدہ پہنچا تو حیرت میں رہ جاتا ہے اور اس کے علم و فضل کا مقر ہو جاتا ہے اور تعجب سے کہتا ہے کہ کیسے معمولی اجزاء سے اس شخص نے نسخہ مرکب کیا ہے۔

کمال کی بات

غالبًا اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ مریض کو دشواری میں ڈالا جائے بلکہ کمال کی بات یہ ہے کہ تدبیر نہایت سہل ہو اور اس پر نفع اعلیٰ درجہ کا مرتب ہو اور نسخہ کا بڑھیا ہونا یہ نہیں ہے کہ زیادہ قیمتی ہو اور دشوار اور نایاب ادویہ سے مرکب ہو بلکہ نسخہ کا بڑھیا ہونا اسی میں ہے کہ کم قیمت اور سہل الحصول ہو اور وہی طبیب تعریف کے قابل ہے جو ایسا حاذق اور شفیق ہو کہ مریض کو دق نہ کرتا ہو ایسے ہی شخص کا نسخہ قدر کے قابل ہوتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ جب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ایسی ہی ہے کہ نہایت عام فہم اور سہل الحصول اور نتیجہ نہایت قیمتی تو ان کے نسخہ کی قدر کیوں نہیں ہوتی ضرور ہونا چاہیے۔

اب سن لیجئے کہ یہاں اس حدیث میں جس کا بیان میں نے شروع کیا ہے ایسے ہی معمولی اجزاء میں کوئی جزو ان میں سے ناشناسا نہیں اسی وجہ سے میں نے یہ لفظ کہا تھا کہ عنوان سرسری ہے لیکن اجزاء گو کیسے ہی سرسری ہوں مگر مجموعہ میں جو بات ہے وہ سرسری نہیں ہے اور وہ بالکل ناشناسا ہے اس کی طرف ذہن نہیں جاتا تو اس عنوان کے سرسری ہونے اور اجزاء کے معمولی ہونے کا نتیجہ عاقل کے نزدیک یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھے بلکہ عاقل کو چاہیے کہ منفعت پر نظر کرے، عنوان کے سہل اور دشوار ہونے کو نہ دیکھے۔

بے قیمت مفید شے

اس کو میں ایک عقلی دلیل سے بھی ثابت کرتا ہوں دیکھئے قدرتی رفتار یہ ہے کہ ضروری اور مفید چیز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور قیمت میں ارزاں ہوتی ہے مثال اس کی ہوا ہے کہ ہوا ایسی ضروری چیز ہے کہ آدمی ایک منٹ کے لیے بھی اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ پھر دیکھئے کہ ہوا کی مقدار عالم میں کس قدر ہے، کوئی جگہ بھی ہوا سے خالی نہیں، پھر اس قدر ارزاں کہ اس کے کچھ دام ہی نہیں۔ ہوا چنانچہ کہیں بکتی نہیں حالانکہ سب سے زیادہ ہوا ہی بکری کی چیز ہے۔ غالبًا سننے والے کے دل میں یہ خیال گزر رہا ہوگا کہ ہوا بھی کوئی بکری کی چیز ہے۔ صاحبو! آخر ہوا بکری کی چیز کیسے نہیں ہے اس کا تجربہ یوں ہوسکتا ہے کہ کسی کی ہوا پانچ منٹ کے لیے بند کر دیجئے، دیکھئے اس کی کیا حالت ہوگی اس وقت اس کی یہ حالت ہوگی کہ

اگر وہ ہفت اقلیم کا بھی مالک ہو اور اس کے سامنے یہ بات پیش کی جائے کہ اگر تو ہفت اقلیم ہم کو دیدے تو ہوا تجھ کو مل سکتی ہے تو وہ سو خوشامدیں کرے گا اور اس کو منظور کر لے گا۔

ثابت ہوا کہ ہوا اس قدر قیمتی چیز ہے کہ ہفت اقلیم بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں' یہ اور بات ہے کہ حق تعالیٰ کا انعام اور فضل اس قدر بے پایاں ہے کہ ہوا بالکل مفت ملتی ہے اور اس کثیر مقدار میں موجود ہے کہ لوگ اس سے اکتاتے اور بھاگتے ہیں اور اس انعام کو ایسا بہا دیا گیا ہے کہ بکنے کا نام اس کے ساتھ لگانے سے تعجب ہوتا ہے واقعی اگر ہوا کی قیمت ہوتی تو بادشاہوں کے سوا اس کو کون خرید سکتا۔

بیش قیمت بے کار شے

غرض یہ تو حالت اس چیز کی ہوئی جو سب سے زیادہ ضروری...... اور سب سے زیادہ مفید ہے کہ اس کی کچھ بھی قیمت نہیں' اب اس کے مقابلہ میں اس چیز کو دیکھئے جو سب سے کم ضرورت کی ہے وہ موتی اور جواہرات ہیں کہ کسی کام میں بھی نہیں آتے بقائے حیات ان پر موقوف نہیں کوئی کام دنیا کا ان کے بغیر بند نہیں پھر دیکھئے کہ کمیاب کس قدر ہیں کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جن کے پاس یہ موجود ہوں بہت سے آدمی ایسے ہیں جنہوں نے جواہرات کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ پھر قیمت اس قدر گراں کہ کسی چیز کی بھی نہیں۔ سنا گیا ہے کہ بعض جواہرات ایک ایک اقلیم کا مول رکھتے ہیں۔

غرض دیکھ لیجئے کہ ہوا بے قیمت چیز تو کام کی ہے اور موتی اس قدر قیمت کی چیز کام کی نہیں ہے ثابت ہوا کہ زیادہ گرانی اور کم یابی دلیل ہے بے سود ہونے کی اور ارزانی اور سہل الحصول دلیل ہے مفید ہونے کی لیجئے دلیل عقلی سے بھی ثابت ہو گیا کہ کسی چیز کا سہل اور معمولی ہونا دلیل اس کے حقیر ہونے کی نہیں بلکہ اس کا عکس ہے کہ سہل الحصول وہی چیز ہوتی ہے جو واقع میں زیادہ مفید ہوتی ہے اسی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم چونکہ سہل ہوتی ہے اس لیے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ یہ راز ہے شریعت کی تعلیموں کے سہل ہونے کا' خوب سمجھ لو اور کبھی بے قدری نہ کرو' یہ تعلیمیں سب سہل ہیں لیکن اس قدر جامع اور پُر منفعت ہیں کہ کوئی دوسرا ایسی تعلیم نہیں کر سکتا۔

ایک خطرناک روحانی مرض

یہ بیان ہوا لفظ سرسری کے لفظ کے متعلق اب وہ حدیث مکرر سن لیجئے فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ۔"[1] (اللہ تعالیٰ قلب غافل کی دعاء قبول نہیں فرماتے)

اس حدیث میں ایک ایسے مرض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو نہایت دشوار اور خطرناک مرض ہے اور دشواری اس کی اس وجہ سے اور زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ مرض مخفی بہت ہے اس تک کسی کی نظر ہی نہیں پہنچتی جو لوگ اپنے امراض کا علاج چاہتے ہیں ان کا خیال بھی اس کی طرف نہیں جاتا' پھر علاج ہو تو کیسے ہو' اول تو اس زمانہ میں دین کی طرف توجہ ہی نہیں' لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ خود بھی دنیا کے در پے ہیں اور تعلیم بھی دنیا ہی کی رہ گئی ہے اگر ایسا بھی ہوتا کہ دنیا کے کسب میں مبتلا ہوتے مگر تعلیم صرف دنیا کی نہ ہوتی بلکہ کچھ تعلیم دین کی بھی ہوتی تب بھی شکایت نہ تھی کیونکہ اس وقت تعلیم دینی سے یہ تو سمجھ میں آ جاتا کہ ہم ایک خراب چیز اور بری بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے یہ امید ہوتی کہ شاید کبھی متنبہ ہو جائے اور ان بلاؤں سے چھوٹ جائیں اور جب ان بلاؤں کے بلا ہونے کا علم ہی نہ رہا تو رہائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ غرض دین کا نام ہی نہ رہا اور صرف یہ شکایت نہیں ہے کہ دین کی طرف توجہ میں کمی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دین سے قطع تعلق اور مباینت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو کسی چیز سے تعلق ہوتا ہے وہ چیز گو اس کو حاصل نہ ہو لیکن اس چیز کی خواہش اور اس کی طرف کشش اور اس سے مناسبت اور عدم حصول پر حسرت اور حصول کی تمنا تو دل میں ضرور رہتی ہے۔

طالبان دین کا تمسخر

مثلاً تمول ایک ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو مرغوب ہے گو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سے طبیعتوں کو مناسبت اور اس کی طرف کشش اور اس کی خواہش اور اس کے حاصل نہ ہونے پر حسرت اور حاصل ہونے کی تمنا کس قدر قلوب کے اندر موجود ہے ہر شخص کی حالت یہ ہے کہ جب کسی صاحب تمول کو دیکھے گا تو کم سے کم نظر اس کی طرف ضرور اٹھ جائے

---

[1] (مسند احمد ۲:۱۷۷' الترغیب والترهیب ۲:۳۱۹)

گی؛ آپ نے یہ بھی کبھی دیکھا ہے کہ ایسا شخص جس کو تمول حاصل نہ ہو وہ صاحب تمول پر ہنستا ہوا گر بالفرض کوئی ایسا کرتا تب کہا جاسکتا تھا کہ اس کو تمول کی خواہش نہیں بلکہ یہ اس کو برا سمجھتا ہے مگر اس کا وجود ہی کہیں نہیں ہے؛ دنیا کے بارے میں تو کہیں اس کا وجود نہیں مگر دین کے بارے میں علاوہ بے تعلقی کے اس کا بھی وجود ہے کہ لوگ دینداروں پر ہنستے ہیں پھر آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو دین سے مناسبت ہے یا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو دین سے مباینت ہے اگر طالبان دین پر ہنستے نہیں تب بھی کسی درجہ میں یہ کہا جاتا کہ گو دین ان کو حاصل نہیں مگر مناسبت ہے لیکن ہنسنا تو صریح دلیل ہے بجائے مناسبت کے مباینت ہونے کی جو القاب طالبان دین کو دیئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ احدیوں کی پلٹن ہے؛ کوئی کہتا ہے ملانٹے ہیں؛ کوئی کہتا ہے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے ہیں؛ کوئی کہتا ہے یہ دیوانے ہیں؛ خیر ہم تو اس لفظ سے نہیں گھبراتے کیونکہ یہ لقب وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا لیکن طالبان دین کو بعض مسلمانوں کا ان الفاظ سے یاد کرنا اس کی شہادت اور اقرار ہے کہ وہ دین سے علیحدہ ہیں اور ان لوگوں کے متبع ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا: "اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ" (آپ دیوانے ہیں) معلوم بھی ہے یہ کس نے کہا تھا، کفار نے اور اعداء دین نے اور دشمنان خدا نے کہا تھا، ہمیں تو اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں؛ ہمارے لیے تو یہ خوشی کی بات کہ ہم کو وہ لقب دیئے جاتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے ہم تو ان القاب سے خوش ہوتے ہیں پھر لوٹ کر جواب کس بات کا دیں مگر ایک جگہ جواب بھی خوب مل گیا۔ قصبہ کرانہ کا قصہ ہے کہ کسی دنیادار نے کسی دینی طالب علم کو مسجد کا مینڈھا کہا تھا اس نے کہا مسجد کا مینڈھا پھر بھی دنیا کے کتوں سے اچھا ہی ہے یہ ہے پورا جواب۔ جس میں ایک عجیب لطف ہے کہ یہ ان کا اقراری لقب ہے بعض وقت یہ لوگ خود ہی کہا کرتے ہیں اجی ہم تو دنیا کے کتے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے منہ ہی سے یہ خطاب لیا ہے اور اس جماعت کا کوئی آدمی اپنے آپ کو مسجد کا مینڈھا نہیں کہتا تو اگر عدالت خداوندی میں یہ مقدمہ پیش ہوا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ہماری تذلیل کی اور ایسا لفظ کہا جو توہین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یعنی مسجد کا مینڈھا کیونکہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں توہین ہی کے طریق سے کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ توہین کے مجرم ہیں اور اگر وہ دنیادار دعویٰ کرے کہ طالب علم

نے میری توہین کی مجھے دنیا کا کتا کہا تو یہ مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ اس کے تو وہ خود اقراری ہیں یہ جواب ترکی بترکی ہوا مگر ہمیں یہ بھی پسند نہیں بلکہ ہمارا مذاق تو یہ ہے کہ وہ ہزار پھبتیاں کہیں مگر ہم اس کے جواب میں پھبتیاں نہ کہیں گے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ نہیں تھا ان حضرات نے کبھی پھبتیاں نہیں کہیں ان کو حق تعالیٰ کا یہ حکم تھا "فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ" یعنی منہ پھیر لو ان سے یہ حکم نہیں تھا کہ جیسے وہ کہیں ویسے تم بھی کہو' حضرات اہل اللہ میں شائستگی ہوتی ہے وہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتے اور چھچھوروں کے ساتھ چھچھورا بننا نہیں چاہتے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان تو بڑی ہوتی ہے ہمارے استاد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی بچپن میں یہ حالت تھی کہ جب کھیل میں لڑکے ان کو گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ان کو گالیاں نہ دیتے تھے' بس بڑا جواب یہ تھا کہ تم ہی ہو گئے ایسے' کیا مزے کا جواب ہے اور یہ بھی بچپن میں تھا کہ اتنا جواب دید یتے تھے اور بعد میں اتنا بھی نہ تھا' یہ طریقہ رہا اہل اللہ کا۔

بزرگوں کا مذاق

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کو کسی نے برا بھلا کہا تو بجائے اس کے کہ لوٹ کر اس کو جواب دیتے یا برا مانتے یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرے بہت سے عیب تمہیں معلوم نہیں ہوئے ورنہ اور زیادہ برا بھلا کہتے' دیکھئے کیا شان ہے بزرگوں کی۔ ان کا مذاق تو یہ ہے:

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق
ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے

وہ تو پروا بھی نہیں کرتے کسی کے برا بھلا کہنے کی' کیوں وہ عاشق ہیں اور عاشق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو تو برا بھلا سننے میں مزا آتا ہے۔

نہ ساز د عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کو سلامتی کا گوشہ اچھا نہیں لگتا بلکہ اس کو محبوب کے کوچہ کی ملامت اچھی معلوم ہوتی ہے)

عارف شیرازی کہتے ہیں:

من حال دل اے زاہد با خلق نخواہم گفت   کایں نغمہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

(اے زاہد میں اپنا حال دل خلقت سے نہیں کہوں گا اس لیے کہ یہ نغمہ اگر کہوں میں تو چنگ ورباب کے ساتھ بہتر ہے)

اس میں چنگ ورباب سے مراد ملامت ہے نہ کہ ڈھولکی اور ستار کی تن تن۔ پھر وہ ان باتوں کا جواب کیوں دیں۔ ان کو لطف آتا ہے ان باتوں میں غرض ان باتوں کے جواب دینے کی پروا نہیں کرنا چاہیے ہم تو طالب علموں کو یہ فہمایش کرتے ہیں کہ جواب وسوال کے قصہ کو چھوڑ و اپنے اللہ کا نام لو جواب سوال میں کیوں وقت ضائع کیا دیکھو تمہیں کیا تعلیم دی گئی ہے۔

فضول کام

فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم "**ان من حسن اسلام المرء تر که مالا یعنیه**"[1] یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول بات میں آدمی نہ پڑے جاہل آدمی کا جواب دینا فضول ہی ہے کہ کیونکہ اس کا حاصل کیا اگر جواب دے ہی دیا اور اس کو ساکت ہی کر دیا تو کتنی رکعت کا ثواب ملا' اپنا جو اصلی کام تھا خواہ مخواہ اس کا حرج کیا' جاہل کو تو اس کی بات کا جواب بھی نہ دے۔

حضرات صحابہؓ کو تسلی

دیکھو کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کا نام بجائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذمم رکھا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب تو کیا دیتے اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ سے یہ لفظ سنا نہ جاتا اور اس گستاخی کے سننے کی تاب نہ لاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی کرتے اور فرماتے:

الم تروا کیف صرف اللّٰه عنی شتم قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد صلی اللّٰه علیه وعلی آله وسلم.

(یعنی دیکھو حق تعالیٰ نے قریش کے برا بھلا کہنے کو اور سب وشتم کو مجھ سے کیسا ہٹایا ہے اور مجھے اس سے کیسا بچایا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تھامتے تھے صحابہ کو اور بعض نے ایسے موقع پر جواب دینا شروع کیا تو یہ آیت اتری:

---

[1] (سنن الترمذی :۲۳۱۸ حلیۃ الاولیاء ۱۰:۱۷۱)

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوْا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ.

(یعنی کہہ دیجئے میرے بندوں سے کہ وہ بات کہا کریں جو اچھی ہے) مطلب یہ ہے کہ بری بات کے جواب میں بری بات نہ کہیں' شیطان چاہتا ہے کہ ان میں لڑائی کرادے' سبحان اللہ کیسی تعلیم ہے اور اس سے بڑھ کر لیجئے فرماتے ہیں:

وَلَا تَسُبُّوْا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ.

(یعنی مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا مت کہو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس کے جواب میں حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے' اللہ اکبر کس قدر بچایا ہے' بیہودہ مشغلوں سے ان سب تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ اپنے کام میں لگو' فضول جھگڑوں میں نہ پڑو' بری بات کے جواب میں بری بات مت کہو' یہ بھی فضول حرکت ہے یہ تعلیم تو ان کے اقوال کے جواب میں تھی۔

کلمات ترحم

اب ان کے افعال کے مقابلہ میں سنئے کیا جواب دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف دعوت اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو ان نامعقولوں نے کیا کیا کہ لڑکوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکوائے' جسم مبارک زخمی ہوگیا یہ حالت گزری کہ کئی وقت کھانے کو نہیں ملا' سوائے اس کے کہ حضرت بلال کے پاس کچھ تھوڑی بہت باسی سوکھی روٹی تھی یا کچھ کھجور وغیرہ ہوں گی اس کو کھا کر پانی پی لیتے مگر ان کے ان افعال کے جواب میں زبان مبارک سے کچھ نہیں فرمایا بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں پر موکل ہے آیا اور عرض کیا کہ مجھ کو خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے اگر آپ حکم دیں تو ان کو پہاڑوں کے بیچ میں پیس دوں' جواب دیا کہ مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو کیا ہے' شاید ان کی نسل میں سے کوئی ایمان لے آوے۔

باوجود اس قدر تصرفات اختیار میں ہونے کے کہ ملک الجبال حاضر ہے حکم کا منتظر ہے ذرا اشارہ ہو تو سب کو خاک میں ملا دے لیکن ان کی تکلیف کو گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کے ایسے افعال کا جواب تھا جن کے سننے سے بھی غیظ پیدا ہوتا ہے اور جوش اٹھتا ہے یہ ہیں اخلاق سبحان اللہ' واقعی انبیاء علیہم السلام دشمنوں کے بھی خیر خواہ ہوتے ہیں' ملا دو پیازہ نے ایک آل

نامہ لکھا ہے اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ ''الرسول خیر خواہ دشمنان'' واقعی گر کی بات کہی ہے حقیقت میں رسول کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کا بھی برا نہیں چاہتے۔ دیکھ لیجئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق اور رحیم وکریم ہیں کہ ایسے دشمنوں کو بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہ کی بلکہ ان کے ساتھ خیر خواہی کی دنیا میں بھی اور دین میں بھی، دنیا میں تو یہ کہ ملک الجبال کو ان کے ہلاک کرنے سے منع کر دیا اور دین کی خیر خواہی دیکھئے کہ انہی کے واسطے ان کے افعال کے مقابلہ میں کیا دعا فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَایَعْلَمُوْنَ۔[1] (یعنی اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر دیجئے یہ لوگ جانتے نہیں)

کس قدر ترحم کے کلمات ہیں بس وہ حالت ہے جیسے ایک شفیق باپ اپنے ناسمجھ بچے کی گستاخی پر کہتا ہے کہ یہ نادان ہے بھلے برے کو جانتا نہیں ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کو ہلاک کیوں کیا جاوے یہ ناواقف ہیں جو گویا دوسرے لفظوں میں یوں فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ نافرمانی کرتے ہیں جان بوجھ کر نہیں کرتے آپ کو یا مجھ کو انہوں نے پہچانا نہیں ورنہ ایسا کیوں کرتے، دیکھئے دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ان کی تکلیف تو کیا گوارا فرماتے ان کو یہ دعا دیتے ہیں کہ اے اللہ ان کو جنت میں بھیج دیجئے، ہدایت کی دعاء کرنے کا یہی مطلب ہے کہ یہ دوزخ سے بچ جائیں اور جنت میں پہنچ جائیں، اس ترحم کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اندھے تھے ان کو یہ نہیں سوجھتا تھا کہ ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب کام پیش نظر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آتا ہے کہ یہ کیا غلطی کر رہے ہیں کہ انجام کو نہیں سوچتے اور اپنے ہاتھوں دوزخ میں گرتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بہت چھوٹا بچہ سنکھیا کی ڈلی کو اٹھا کر منہ میں رکھنا چاہتا ہو اور باپ اس کے ہاتھ سے اس کو چھینتا ہو تو وہ بچہ مچلتا ہے اور ڈلی ہاتھ سے نہیں دیتا، جب باپ زیادہ اصرار کرتا ہے تو وہ باپ کو لپٹ جاتا ہے اور مارتا ہے اور کاٹتا ہے، اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوگا کہ باپ کو غصہ آ جائے اور اس کے مارنے اور کاٹنے کے جواب میں یہ بھی مارنے اور کاٹنے لگے بلکہ آپ دیکھیں گے کہ وہ ہنستا ہی رہے گا، نہ اس کو مارے پیٹے گا اور نہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کھا جائے۔

---

[1] (الدر المنثور ۲:۲۹۳)

بعینہ یہی حالت ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دشمنوں کے ساتھ کہ تکلیفیں اٹھائیں، بھوکے رہے، پائے مبارک زخمی ہو گئے مگر ذرا بھی پیشانی پر بل نہیں پڑا نہ ان کا ہلاک ہو جانا چاہا نہ یہ چاہا کہ وہ اپنے حال پر اس گمراہی میں رہیں بلکہ یہی دعاء فرمائی کہ اے اللہ ان کو ہدایت کر دیجئے یہ لوگ ناواقف ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ

یہ ہے طریقہ انبیاء علیہم السلام کا کہ مخالفین کے ساتھ ان کی برائی کا جواب برائی کے ساتھ نہیں دیتے، ان کے متبعین کو بھی یہی طرز رکھنا چاہیے اگر کوئی برا بھلا کہتا ہے کہے وہ اپنا منہ خراب کرتا ہے، کوئی احدی کہے یا ملا نٹا کہے یا دیوانہ کہے اس سے کچھ تعرض مت کرو اس نے تو اپنا وقت خراب کیا تم اپنا وقت کیوں خراب کرتے ہو، بعض وقت بعض علماء کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی بدگوئیوں پر صبر کرنے سے ان کی دلیری بڑھتی ہے لہٰذا کچھ جواب دیا جائے، میں کہتا ہوں ان کو اس کی بھی پروا نہیں کرنا چاہیے ان کی دلیری بڑھے گی تو اپنے واسطے برائی کو بڑھائیں گے، ان کا کیا لیں گے خیر یہ تو اپنی جماعت کو مشورہ تھا۔

اصل گفتگو یہ تھی کہ آج کل دین کی طرف سے ایسی لاپروائی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے الٹا ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں یہ کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہے بھی تو صرف ظاہر کی اصلاح کا نام دین رکھ لیا ہے، نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں، وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی، بس اس کا نام دین ہے، ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں تو اس خفاء کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ یہ امراض کس قدر قابل توجہ ہوئے۔

تمام امراض کی جڑ

پس اس حدیث میں ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جزو ہیں، ظاہری اور باطنی۔ اب تو حالت یہ ہے کہ باطن کے

نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے' باطن کی جگہ بطن کو لے لیا ہے۔ پس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو' حلال سے ہو یا حرام سے' دھوکہ سے ہو یا اشراف نفس کے ساتھ ہو' بلا طیب خاطر ہو یا جبر سے ہو جس طرح بھی مل جائے لقمہ حاصل کر لیا جائے' ہاں بیشک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے اور بس اور اس میں بھی دو فریق ہیں ایک تعلیم یافتہ اور ایک عوام۔ عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین' الٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں' خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا۔

ضرورت اصلاح باطن

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے ان پر زیادہ افسوس ہے کہ وہ اپنے قصور کے مقر بھی نہیں۔ ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطنی سے ہم محروم ہیں اور یہ تعلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آ جائے گا۔ انہوں نے باطنی جزو کو ذہن سے اڑا ہی دیا' بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اس پر ناز کر بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزاء کو' گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال لیے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا دوسرے اجزاء (نعوذ باللہ) فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جن کی عادت ہوگئی ہے جیسے نام مسلمانوں کا سا رکھ لینا صورت مسلمانوں کی سی بنا لینا' بہت کیا تو نماز بھی پڑھ لی بس انہی اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے۔

اجزائے دین

صاحبو! دین کے اجزاء تو یہ ہیں عقائد اعمال معاشرت معاملات اخلاق ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سن کر بھی لوگ چونکتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو

دین سے کیا تعلق۔ معاشرت بھی کوئی دین کے سکھلانے کی چیزیں ہیں یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے خود آدمی سیکھ جاتا ہے اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگادی ہیں۔ علیٰ ہذا معاملات میں بھی ایسی ہی باتیں کہی جاتی ہیں۔

اجزائے دین اور ہماری کوتاہی

غرض بعض اجزاء کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا' بڑی دوڑ اعمال دیانات تک رہ گئی ہے اور وہ اعمال بھی سب نہیں ان میں سے بھی وہی لے لیے ہیں جن کی ایک رسم چلی آتی ہے اور جس کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے چنانچہ بڑی دینداری یہ ہے کہ نماز پڑھ لی' ڈاڑھی رکھ لی' شرعی پائجامہ پہن لیا' گوشت کھالیا' صورت شکل وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی' یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی خلاصہ یعنی گویا جوہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا صرف گنتی کے چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کہ چند شعبوں کو درست کرلیا۔ غرض اس انتخاب میں بھی جو رہا وہ ظاہر رہ گیا' اس کے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا بس اس ناتمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اس بیان سے ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھئے ظاہر پرست ہیں مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں کہ باطن کا درست ہونا کافی ہے ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے۔ لہٰذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا کہ یہ مسلمان ہیں۔ وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے' یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہوجائے گا اس سے ہمارے من سمجھوتہ کرنے کے لیے گھڑ لی ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔

صرف اصلاح ظاہر کافی نہیں

اس لیے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اس پر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تا کہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کرلیں باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لیے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کردے گو بالفرض باطن بھی درست ہو اور ان بددینوں کا تو باطن بھی درست نہیں بلکہ انہوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے' ظاہر کو بگاڑا ہی ہے باطن بھی بگڑا ہوا ہے اور یہ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا ایک ہی فرض ادا ہوتا اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے' ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لیے بگاڑا ہے کیونکہ باطن کے بگاڑنے والی ایک چیز عجب بھی ہے اس سے بچنے کے لیے ہم نے ظاہر کو بگاڑا ہے اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہو گیا۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا کہ انہوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے میں بطور جواب الزامی کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے واللہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عجب سے بچنے کے لیے کر رکھی ہے تا کہ میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتایئے آپ اس کو کیا کہیں گے یہی کہیں گے کہ جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے' فرمایئے اس کی وجہ کیا ہے جب ایک شخص اپنے منہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں' خیر خواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں اور اس کو باغی کیوں سمجھتے ہیں۔

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے' باطن کا جب ظاہر افعال اس کے مخالفانہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ باطن اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جاوے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہے، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ باطن درست ہو اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو، خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدون اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آ گئی، اصل بیان یہ تھا کہ آج کل بہت سے دیندار ایسے ہیں جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ لیا ہے۔ پھر اعمال سے مراد صرف اعمال ظاہری لے لیے ہیں وہ بھی سب نہیں بلکہ معدودے چند جیسے ڈاڑھی بڑھالی، نماز پڑھ لی، وضع قطع درست کر لی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے، اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ ظاہر کا بنانا کچھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں اس واسطے ان کی غلطی کو بیچ میں دفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہی لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھے ہوئے ہیں اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے لہٰذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے۔ بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس مرض کی خود مریض ہی کو خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو نظر تو آتا نہیں اور بدگمانی کی کسی کو اجازت نہیں تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔

لہٰذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے تو جیہ اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو جائز بنالیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو قلب میں اس تاویل سے ہرگز بشاشت نہیں ہوتی بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے پھر جب خود ہی کو گناہ ہونے کا علم

ہے تو اللہ تعالیٰ کو تو کیسے علم نہ ہوگا تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا' خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے' ظاہر بینوں کی نظر میں سرخرو ہو گئے تو کیا۔

کہ گہے اللہ دروغے میزنی	ازبرائے مسکہ دوغے میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام	درغلط اندازی تاہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست	بخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار بااوراست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

تاویل کا مرض

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آ گئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے مگر باطن کو بگاڑ کر خدا کو دھوکہ کیسے دو گے جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچتی ہے دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کر کے سرخرو ہو گئے تو کیا ہوا تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑ جاتا ہے' اصل گناہ تو مرض تھا ہی یہ تاویل کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہو سکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبہ ضرور ہو جائے گا اور جب تاویل درمیان میں آ گئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑ گیا' اب تنبہ ہو تو کیونکر ہو اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کر سکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے کوئی برائی اس کی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا' تنبیہ اور تنبہ سب اڑ گئے' اب اصلاح کی کیا امید ہو' دیکھئے کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں' بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے' وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے' اس لیے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں' علم ہے' عمل ہے' نماز ہے' روزہ ہے' جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی سہی فیصلہ غلبہ سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے'

برائی کم تو بھلائی ہی کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھالیا کہ ہم اچھے ہیں یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔ اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

ضرورت اصلاح

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور ان عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہیں تو کیا اس دل کے سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی' ہرگز نہیں بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تو اسی طرح اس فیصلہ سے بھی پردہ پڑ گیا تاویل بھی ایک مرض تھا' یہ بھی ایک مرض ہے وہ ایک قسم کا پردہ تھا یہ دوسری قسم کا پردہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ نہ تسلیم کیا تھا اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا' خیال کر لیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے۔ بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آ گئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے کیونکہ اتنے موانع موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو اور جب خبر ہی نہ ہو تو علاج کیسا' اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تو ہمت ہار دی ہے کہ کون علاج کرے' اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے اللہ تعالیٰ بڑے کریم ہیں' ہم گنہگار سہی اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں' پھر کیوں مصیبت میں پڑے کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو' اس کے نخرے اٹھاؤ' ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہو' اچھی خاصی مصیبت ہے جب اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت اٹھانے کی وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب

کام بنا دیں گے' یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں اور کوئی کام خلاف شریعت کرنا نہیں چاہتے ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے' حج کی بھی ضرورت ہے' روزے کی بھی ضرورت ہے' ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

امراض قلب

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔

اب یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ وہ باطنی امراض کیا کیا ہیں' دوسرے یہ کہ خدا کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیے یہی دو امر خلاصہ ہیں۔ آج کے بیان کے ان دونوں کا جوڑ ابھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا لیکن آگے چل کر معلوم ہو جاوے گا یہاں اجمالاً اتنا سمجھ لیجئے کہ ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور دوسرا اس کی فرع یعنی نتیجہ اور اثر ہے وہ اصل امر ثانی ہے یعنی یہ کہ ہم کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہیے اور امر اول یعنی تحقیق امراض اس کی فرع ہے اگر یہ اصل سمجھ میں آ گئی تو سب امراض کی حقیقت اور ان کا علاج معلوم ہو جاوے گا۔ اس اصل کا بیان سنئے یعنی یہ بات کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیے' ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کی زیادہ شرح کی ضرورت نہیں۔

تعلق مع اللہ قائم کرنے کی ضرورت

ایک مختصر سی بات یہ ہے کہ تمام تعلقات کی بناء ہوتی ہے احسان پر جتنا کسی کی طرف سے کسی پر احسان زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کو تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے احسانات ہم پر جس قدر ہیں محتاج بیان نہیں ہم کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب خدا ہی کے دینے سے ہے' کوئی وقت بھی ایسا نہیں جو خدا تعالیٰ کے احسان سے خالی ہوا' اتنے احسانات ہمارے اوپر کسی کے بھی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں' جتنے خدا تعالیٰ کے احسانات ہیں تو بناء بر قاعدہ مذکورہ ہم کو

کسی سے بھی اتنا تعلق نہ ہونا چاہیے جتنا خدا تعالیٰ سے ہونا چاہیے اور اس کی بھی شرح ہو جانی چاہیے کہ تعلق کس چیز کا نام ہے، تعلق کے معنی ہیں لگاؤ اور لگاؤ سے مراد ہے دل کا لگاؤ مگر دل کا لگاؤ یہ نہیں ہے کہ دل کسی کے ساتھ دیکھنے میں چپک جائے بلکہ دل کے لگاؤ کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل اس کی طرف متوجہ رہے اور دل میں اس درجہ اس کی یاد رہے جس کو عرف میں دل میں بس جانا کہتے ہیں۔

اب آپ غور کر لیجئے کہ ہم کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق حاصل ہے یا نہیں ہر شخص غور کر لے کہ رات دن میں کتنا وقت اس کے لیے ملتا ہے اگر کوئی خیال کر کے دیکھے گا تو یہ بات صحیح پائے گا کہ سب چیزوں کی یاد اور دھیان سے کم زمانہ خدا تعالیٰ کی یاد کا ہوتا ہے جن جن چیزوں کا ہمارے دل میں خیال اور دھیان رہتا ہے سب سے کم زمانہ خدا کی یاد کے لیے ملتا ہے۔ چنانچہ مال کا دھیان بھی ہم کو بہت کچھ رہتا ہے جان کا دھیان بھی اکثر رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی کا نوکر ہے تو اس کو آقا کا دھیان بھی اکثر اوقات رہتا ہے، بچوں کا دھیان بھی زیادہ رہتا ہے مگر نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ کا دھیان نہیں رہتا، رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دل میں یہ ادھیڑ بن رہتی ہے کہ مال یوں کمائیں گے، یوں بڑھائیں گے، بچوں کے لئے فلاں فلاں چیز لائیں گے، نوکری میں کام اس طرح کریں گے، آقا کو یوں کارگزاری دکھائیں گے وہ خوش ہوگا، یوں ہماری عزت ہوگی، غرض کسی وقت دل اس سے خالی نہیں رہتا، میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا بیہودہ شغل ہے میاں نوکری کے کام سے تو روپے ملیں گے لیکن یہ بتلاؤ کہ اس خیال سے کیا ملتا ہے اس سے کتنے روپے ملتے ہیں، کچھ بھی نہیں مگر بایں ہمہ ان خیالات سے کوئی خالی نہیں۔

دل کو فارغ رکھنے کی ضرورت

یہ اس بات کا جواب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہر وقت یاد خدا میں رہیں تو دنیا کا کام کیسے ہو آخر کھانا پینا، رہنا سہنا یہ کام بھی تو کرتے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر بس یاد خدا میں لگ جائیں۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کے کاموں کو منع نہیں کیا جاتا جو کام دنیا کی معیشت کے لیے ضروری ہے جتنا وقت اس میں صرف ہو اس کا مضائقہ نہیں مگر اس کے علاوہ اس کام کے خیال اور ادھیڑ بن میں کیوں وقت صرف کیا جاتا ہے دل کو فارغ کیوں نہیں رکھا جاتا اور اس

وقت کو خدا کے دھیان اور خدا کی یاد میں کیوں صرف نہیں کیا جاتا' دنیا کے کاموں کی جو ضرورت بیان کی جاتی ہے تو ان میں کام کی ضرورت ہے نہ کہ خیال کی' سو کام کو منع نہیں کیا جاتا بلکہ خیال کو منع کیا جاتا ہے' دنیا کا کام تو کام کرنے سے ہوتا ہے۔

خیال محض فضول چیز ہے

خیال سے تھوڑا ہی ہوتا ہے تو خیال محض فضول چیز ٹھہری' بس اس فضول چیز سے منع کیا جاتا ہے خیال تو محض بیکار ہے اس سے تو نفع کچھ بھی نہیں' ہاں کچھ نقصان ضرور ہے' خیال کی حالت شیخ چلی کی کہانی کی سی ہے کہ وہ ایک شخص کا شیرہ کا گھڑا سر پر لے کر چلے' دو پیسے مزدوری کے ٹھہرے' راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خریدیں گے پھر ان کو مرغی کے نیچے رکھیں گے' ایک میں مرغی ایک میں مرغا بچہ نکلوالیں گے' ان بچوں کو بیچ کر بکریاں خریدیں گے' پھر ان کے بچے ہوں گے' انہیں بیچ کر بیل' پھر گھوڑے پھر ہاتھی خریدیں گے اوران سب تجارتوں کے بعد ہم مالدار ہوجائیں گے' پھر وزیرزادی سے نکاح کریں گے اس سے لڑکا ہوگا وہ سیانا ہوکر ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں گے ہشت یہ جو کہا تو ان کا سر ہل گیا اور مٹکا گر گیا' شیرہ سب بہہ گیا' مالک ساتھ تھا وہ بہت خفا ہوا کہ میاں یہ کیا کیا میرا نقصان ہوگیا' کہنے لگا جا اپنا کام کر تیرا تو روپیہ دھیلی کا نقصان ہوا ہوگا' یہاں سارا بنا بنایا کنبہ غارت ہوگیا۔

حضرت خیال یہ چیز ہے کہ اس سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا ہاں یہ نقصان ضرور ہوا کہ ایک شخص کا گھڑا پھوٹ گیا اور شیرہ بہہ گیا۔ صاحبو! اسی طرح جس ادھیڑ بن اور خیال میں آپ رہتے ہیں اس سے دنیا کا بھی تو کوئی نفع نہیں کیونکہ دنیا کا نفع تو کام سے ہوتا ہے خیال سے کیا ہوتا ہے ہاں اتنا نقصان ضرور پہنچتا ہے کہ وہ وقت ضائع گیا اور یادِ خدا سے محرومی رہی۔

خیال پر ایک معقولی کی حکایت

خیال پر ایک معقولی کا قصہ اور یاد آیا جنہوں نے خیال سے انڈے کے سوا انڈے ذرا دیر میں بنادیئے اور ہاتھ نہ آیا خاک بھی۔

ایک شخص کے دو لڑکے تھے ایک گھر سے نکل کر سکول پڑھنے چلا گیا اور مدتوں پڑھتا رہا' جب اس فن میں خوب کمال حاصل کرلیا تو گھر لوٹ کر آیا' باپ اور دونوں بھائی کھانا کھانے

بیٹھے‘ ایک پیالہ میں دو انڈے سامنے لاکر رکھے گئے‘ آپ کو معقول کا جوش تھا‘ کہنے لگے دیکھو یہ پیالہ میں دو انڈے رکھے ہیں‘ اس کو ہم معقول کے زور سے ابھی سو کیے دیتے ہیں۔

باپ نے کہا کرو‘ آپ بولے دیکھو ایک یہ انڈا ہے اور ایک یہ دو ہوئے اور ایک ان کا مجموعہ تین ہوئے‘ پھر تین یہ اور ایک تینوں کا مجموعہ چار ہوگئے‘ پھر چار یہ اور ایک چاروں کا مجموعہ پانچ ہوئے۔

اسی طرح انہوں نے سو تک تعداد بڑھا کر دکھادی اور اپنے نزدیک بڑا کمال کیا‘ اس میں دیر بھی لگی کیونکہ اچھا خاصا عمل کرنا پڑا اور سمجھانا پڑا مگر اس تقریر کا جواب ایسا ہوا کہ اس میں ذرا دیر بھی نہ لگی جو بالکل اس کا مصداق تھا کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی‘ باپ نے کیا کیا کہ وہ دونوں انڈے اٹھا کر ایک اپنے منہ میں رکھ لیا اور ایک دوسرے بیٹے کے حوالے کیا اور کہا مولوی صاحب یہ دو انڈے تو ہم لیے لیتے ہیں اور ۹۸ جو بچے وہ آپ کھا لیجئے۔

معقولی صاحب منہ دیکھتے رہ گئے۔ گو یہ کہہ سکتے تھے کہ سو انڈے جو بن گئے تھے ان میں سے ۱۹۸ انہی دو کے ساتھ تھے کیونکہ وہ انتزاعی تھے اور ان کا منشا انتزاع یہی دو تھے‘ جب یہ تمہارے پیٹ میں اتر گئے تو وہ سب بھی تمہارے ہی پیٹ میں اتر گئے مگر اس جواب سے معقولی کو انڈا نہ ملتا۔

خیال کی حقیقت

تو خیال کی یہ حقیقت ہے کام تو خیال سے کوئی بھی نہیں بنتا تو محض خیال ایک فضول چیز ہوئی اس سے منع کیا جاتا ہے کام جو کچھ بنتا ہے وہ تو کام کرنے سے بنتا ہے اس سے منع نہیں کیا جاتا جو کام دنیا کا آپ کو کرنا ہے کرو مگر اس کی ادھیڑ بن میں ہر وقت کیوں رہتے ہو بلکہ کام کرنے کا جب وقت آیا اور اس کام کو طریقہ کے موافق کیا اور قلب کو فارغ کرلیا‘ بتاؤ اس میں کیا تنگی ہوئی اور کونسا کام معیشت کا بند ہوا‘ یہ جو حالت ہے کہ رات دن عورت کا خیال‘ بچوں کا خیال‘ نوکری کا خیال‘ دوستوں کا خیال‘ کسی وقت ان سے فرصت نہیں ہوتی‘ یہ حالت کیوں ہے حتیٰ کہ نماز بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہوتی۔

ذرا یہ تو سوچو کہ سارے کام نماز کے اندر تو ہونے ہی کے نہیں جو کچھ ہوگا نماز کے بعد

ہوگا' پھر دل ان کی ادھیڑ بن میں کیوں رہتا ہے' پھر اگر آپ سے یوں کہا جاتا ہے کہ خیالات سے دل کو خالی رکھا کرو تو کیا بیجا کہا جاتا ہے یہ جو نماز میں اول سے آخر تک دل میں خیالات بھرے رہے ان سے کونسا کام بنا پھر دل کو کیوں خراب کیا لیکن کیا کیا جائے کہ ہم لوگوں نے اس کی ایسی عادت ڈال لی ہے جیسے تمباکو کھانے والوں کی تمباکو کی عادت ہو جاتی ہے کہ بدون تمباکو کے چین ہی نہیں آتا' منہ خالی خالی ادھار ادھار سا معلوم ہوتا ہے وہی حالت ہماری ہے کہ جب تک دل میں یہ خیالات نہ ہوں بے چینی رہتی ہے اور دل خالی خالی سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی ہوتا کہ دو ایک چیزوں کا خیال دل میں رہا کرتا تب بھی کچھ تسلی رہتی لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا بھر کے بکھیڑے اور خیالات موجود اور غیر موجود فرضی اختراعی ہر وقت دل میں بھرے رہتے ہیں' کیا خراب زندگی ہے سارا دن اور ساری رات انہیں فضولیات کے ساتھ مشغولی رہتی ہے جو کام کی بات ہے اس کا گزر بھی دل میں نہیں ہوتا وہ کام کی بات کیا ہے؟ اللہ کی یاد اللہ کا خیال یہ کسی وقت آتا ہی نہیں اور جو کبھی آتا ہے تو چشم زدن کے واسطے اور ذرا دیر کے بعد پھر وہی بقول مولانا:

گہہ اسپہاؤ باغ و راغ گہہ خیال میغ دماغ و لیغ و لاغ

(اگر یہ کہا جائے کہ بلا خیال کے دنیا کا کام ہوتا ہی نہیں اور کام انسان کے بہت سے ہیں تو خیال سے بھی کوئی وقت خالی ہونا مشکل ہے) چنانچہ کہا ہے:

ہر خیال صلح شان و جنگ شاں ہر خیال نام شان و ننگ شاں

خیال کی مثال ایسی ہے جیسے دریا اور دنیا کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی جس طرح کشتی دریا پر دوڑتی ہے اسی طرح تمام کام دنیا کے خیال پر چلتے ہیں' دریا نہ ہو تو کشتی نہیں چل سکتی' اسی طرح خیال نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہوسکتا تو خیال ضروری ٹھہرا' پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی دل کو خیالات سے خالی کرے۔

قلب کو خیالات سے پاک رکھنے کی ضرورت

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خیال ہوتا ہے مقرون بالفعل یعنی وہ خیال جو کسی کام کے کرنے سے ذرا دیر پہلے دل میں پیدا ہوتا ہے کام کے لیے یہ خیال تو ضروری ہے اور یہ

خیال مانع مقصود سے نہیں اس سے منع نہیں کیا جاتا مگر یہ خیال کام کے قریب ہوا کرتا ہے اور واقعی بدون اس کے کام نہیں ہوسکتا کیونکہ کام فعل اعضاء کا ہے اور اعضاء تابع ہیں قلب کے جب تک قلب میں ارادہ نہ ہوا اعضاء فعل نہیں کر سکتے اور قلب میں ارادہ جب پیدا ہوتا ہے جبکہ اول اس فعل کا خیال پیدا ہوتا ہے تو خیال کا قلب میں پیدا ہونا ہر فعل سے پہلے ضروری ہوا۔ پس یہ تو مسلم ہے کہ ہر کام سے پہلے خیال کی ضرورت ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قلب میں ہروقت خیال کے رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ خیال کی ضرورت فعل کے لیے ہے اور فعل ہروقت نہیں ہوتا' کوئی وقت ایسا بھی تو نکلتا ہے جو فعل سے خالی ہو سو اس وقت قلب بھی خیال سے خالی ہونا چاہیے یہ جو ہماری عادت ہے کہ ہروقت دل میں خیالات بھرے رہتے ہیں قطع نظر اس سے کہ کوئی کام کرنا ہو یا نہ ہو گزری ہوئی باتوں کے تصور فرضی خیالات آئندہ کی لمبی چوڑی بے ضرورت باتیں دل میں بھری رہتی ہیں یہ ضرور روکنے کے قابل ہیں اور یہ ضرور دل سے بالکل بھلا دینے کی چیز ہے جس کے ہم لوگ عادی ہو رہے ہیں اور ہم کو اس سے ایسا انس ہوا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا' کسی وقت خالی بیٹھے ہوں تو وحشت ہوتی ہے اور فوراً دل کو اس کے ساتھ مشغول کر لیتے ہیں۔

امر حیرت

حیرت کی بات ہے کہ وہ چیز جو یاد رکھنے کی تھی جس سے کسی وقت دل کو خالی نہیں ہونا چاہیے (وہ کیا ہے؟ یادِ حق) اس کو تو ہم لوگ یوں بھول گئے ہیں کہ اس کے لیے وقت ہی نہیں ملتا بلکہ ذہنوں سے اس کی ضرورت ہی جاتی رہی اور وہ چیز جو بھلا دینے اور مٹا دینے کی تھی اور صرف ضرورت کے لیے اس کی اجازت ہوسکتی تھی اس کو ہم لوگوں نے ایسا یاد کیا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا۔

صاحبو! ذرا غور سے کام لیجئے یہ مانا کہ خیال کسی وقت ضروری چیز ہے لیکن ہروقت اسی میں مشغول رہنا یہ کیسے روا ہے اس کی مثال تو ایسی ہوئی جیسے پاخانہ میں جانا اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ بھی ضروری چیز ہے لیکن کوئی یوں کرے کہ ایک دفعہ کی جگہ دو دفعہ پاخانہ میں جائے'

ایک دفعہ تو رفع ضرورت کے لیے اور ایک دفعہ وہاں کا مزہ لینے کے لیے کہ وہاں بیٹھ کر یہ دیکھے کہ ایسی لینڈی ہے ایسا قدمچہ ہے ایسی موری ہے ایسے گجر گجر کیڑے اس میں چل رہے ہیں' فرمائیے یہ کیسا ہے آپ ایسے شخص کو منع کریں گے یا نہیں اور دوبارہ پاخانہ میں جانے سے اسے روکیں گے یا نہیں؟ اور اگر آپ منع کریں تو کیا وہ اس کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ میاں تم پاخانہ میں جانے سے منع کرتے ہو پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے تو آپ یہی کہیں گے کہ ارے کمبخت! پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے مگر اس کو ہر وقت سونگھنا کیا ضرورت ہے پاخانہ میں جانا جس ضرورت کے لیے ہے وہ تو ایک دفعہ میں پوری ہو چکی' اب دوبارہ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ رفع ضرورت مقصود نہیں' کچھ پاخانہ سے طبیعت مانوس ہی ہے اور وہ اچھا لگتا ہے۔

صاحبو! ایسے ہی یہ بھی حماقت ہے کہ آدمی دل کو ہر وقت خیالات میں مشغول رکھے' یہ مانا کہ خیال ضروری چیز ہے لیکن اس کو اسی حد تک تو ضروری کہہ سکتے ہیں جس حد تک اس کو رفع ضرورت میں دخل ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری ہوا اور وہی مرتبہ ہے جس کو میں نے خیال مقرون بالفعل کہا ہے اس سے زیادہ اس میں مصروف رہنا ایسا ہی ہے جیسے بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ پاخانہ میں جانا اور اس سے مزہ لینا اگر حس ہو تو ان خیالات سے ایسے ہی نفرت ہو جائے جیسے لطیف الطبع آدمی کو پاخانہ کا خیال آ جاوے تو اس کو قے آنے لگتی ہے۔

دل کی اصل غذا

صاحبو! اصل غذا قلب کی ذکر اللہ ہے جو چیز اس سے مانع ہو اس کو قلب سلیم ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے پاخانہ کو کہ اس کے تصور سے بھی نفرت ہوتی ہے اور قے آتی ہے۔ خصوصاً معاصی کے خیالات وہ تو بالکل ہی گندی چیز ہیں وہ تو سچ مچ پاخانہ کے برابر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گھن کی چیز ہیں ان گندے خیالات کا تو ذکر ہی نہیں یہ تو ان خیالات کا ذکر ہو رہا ہے جو کہ معصیت نہ ہوں مگر غیر ضروری ہیں۔ جب یہ بھی ہیں تو خیالات معصیت تو مضر زہر ہیں' غرض ضروری خیالات کو منع نہیں کیا جاتا' ہاں غیر ضروری سے ضرور روکا جاتا ہے کیونکہ یہ مانع ہیں ذکر اللہ سے دیکھئے کسی کو طلب معاش کے لیے کچہری جانا ہوتا ہے یہ ضروری کام

ہے، پھر وہاں کچہری کے کاموں میں اور ان کے خیالات میں مصروفیت رہتی ہے یہ بھی ضروری ہے اور ان دونوں سے منع نہیں کیا جاتا لیکن کچہری میں چھ ہی گھنٹے تو رہنا ہوتا ہے ان چھ گھنٹوں میں مصروفیت سہی باقی ۱۸ گھنٹے کیوں خراب کیے ان میں مصروفیت کیوں رہتی ہے ان میں دل کو فارغ کیوں نہیں رکھتے ان گھنٹوں میں قلب کو خیالات سے پر رکھنے کی کیا وجہ ہے، بتلایئے یہ زائد از کار اور فضول ہے یا نہیں بس اسی پر ہمارا اعتراض ہے کہ اس فاضل وقت میں قلب کے اندر خیالات کیوں بھرے رہتے ہیں پھر اکثر خیالات بھی کسی امر مباح کے نہیں بلکہ ناجائز اور حرام چیزوں کے کہیں اجنبی عورت کو سوچ رہے ہیں کہیں حرام خوری کی تجویزیں کر رہے ہیں، کہیں رشوت کے ذرائع سوچ رہے ہیں، یہ ۱۸ گھنٹے بھی اسی مشغلہ میں گزر جاتے ہیں، ۶ گھنٹے جو کچہری میں رہنے کے ہیں اس کی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ضروری ہے خیر یہ ضروری سہی مگر ۱۸ گھنٹے جو ان فضول مشغلوں میں گزار دیئے جس سے ۲۴ گھنٹے پورے ہو گئے یہ کون سے ضروری کام میں صرف ہوئے، کسی میں بھی نہیں پھر خدا کی یاد کے واسطے کونسا وقت رہا کوئی سا بھی نہیں، کچھ وقت ضروری مشغلوں میں گیا اور کچھ غیر ضروری بلکہ مضر اور معصیت میں میزان پوری ہو گئی، دن رات کے ۲۴ گھنٹے ختم ہو گئے پھر ایک دن ختم ہوا، دوسرا ختم ہوا، تیسرا ختم ہوا اسی طرح سلسلہ جاری رہا اور ساری عمر ختم ہو گئی، شاید ذکر اللہ کا وقت مرنے کے بعد آئے گا۔

اصلاح باطن کی ضرورت

تو صاحبو! سمجھ لیجئے کہ مرنے کے بعد ذکر اللہ کا وقت نہیں آئے گا اس وقت تو حسرت اور افسوس کرنے کا وقت آئے گا مگر اس وقت کی حسرت اور افسوس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا، اگر یہ بھی ہوتا کہ خیر وقت ضائع کیا گیا، کچھ اس کا وبال آئندہ کے لیے نہ رہتا تو چنداں ملامت نہ تھی مگر یہاں تو معاصی کے خیالات میں وقت صرف ہوا ہے جس کا وبال آئندہ کے لیے باقی ہے جس سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہے۔ ذکر اللہ سے محرومی رہی اور وبال اور عذاب سر رہا، نہایت افسوس کی حالت ہے یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو شریعت کا نام لیتے ہیں اور گناہ سے پرہیز رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم شریعت کے متبع رہیں کہ ان کی نظر بھی صرف ظاہر ہی تک پہنچتی

ہے حالانکہ حق تعالیٰ باطن کو بھی دیکھتے ہیں اگر کسی نے ظاہری صورت درست کر ہی لی تو کیا ہوا؟ اصل درستی تو باطن کی ہے صرف ظاہر کی درستی کی حالت تو یہ ہے:

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید ۔۔۔ وز درونت ننگ می دارد یزید

(ظاہر کی درستی کی مثال تو ایسی ہے جیسے کافر کی قبر کہ باہر سے اچھے اچھے لباس سے آراستہ ہے اور اندر اس کے اللہ تعالیٰ کا قہر اور غصہ نازل ہو رہا ہے' صرف ظاہر کو اچھا رکھ کر بایزید پر بھی طعنہ زنی کرتا ہے حالانکہ باطن تیرا ایسا ہے کہ اس کو دیکھ کر یزید تک کو شرم آئے)

یہ وہ حالت ہے کہ دیکھنے والے تو سمجھتے ہیں بڑے دیندار ہیں' متشرع ہیں' پرہیزگار ہیں' اللہ والے ہیں اور حقیقت میں نہ دیندار ہیں نہ متشرع معاصی سے دل بھرا ہوا ہے اس میں اللہ کی یاد کہاں حیف ہے کہ صورت ایسی اور سیرت ایسی کہلاتے ہیں' اللہ والے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا وہاں گزر ہی نہیں اللہ کی یاد کسی وقت بھی دل میں نہیں' دوسری ہزاروں چیزیں دل میں بھری ہوئی ہیں۔ یہ تحقیق تو امر ثانی یعنی تعلق مع اللہ کی جو کہ اصل ہے جس کا حاصل ہوا اللہ کی یاد اب رہا دوسرا امر یعنی امراض باطنہ کی تحقیق سو سمجھنا چاہیے کہ گو امراض بے شمار ہیں لیکن ان سب کی اصل مشاہدہ و تجربہ سے صرف ایک ہے یعنی غفلت عن اللہ جو کہ اس تعلق مذکور کی ضد ہے اور اسی سے جو سمجھ میں آ گیا ہوگا' ان دونوں امروں یعنی اصل چیز ہے تعلق مع اللہ جب یہ نہ ہوگا تو اس کی ضد یعنی غفلت ہوگی اور وہ اصل ہے جمیع امراض باطنہ کی پس تعلق مع اللہ کے احکام و آثار معلوم ہونے سے تمام امراض کی تحقیق ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خود غفلت اور امراض میں بھی علاقہ اصل و فرع کا ہے یعنی ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور ایک فرع اصل کیا ہے؟ غفلت اور فرع کیا ہے باقی امراض یعنی غفلت ہی منشا ہے جملہ امراض کا تو اور امراض سے پہلے اس کے علاج کی طرف توجہ ضروری ٹھہری اور معلوم ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے اور غفلت کی ضد ہے یاد تو یاد کو اختیار کرنا چاہیے اور یاد سے مراد کسی لفظ کو زبان سے رٹنا نہیں ہے کیونکہ صرف لفظ زبان پر لانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھو لڈو میٹھی چیز ہے لیکن لڈو لڈو زبان سے رٹنے سے کبھی منہ میٹھا نہیں ہوگا' خواہ ساری عمر اسی میں گزر جائے اسی کی نسبت کہا ہے:

میم وواؤ میم ونون تشریف نیست　　　　لفظ مومن جز پے تعریف نیست

مومن کا لفظ زبان سے کہہ لینے سے آدمی مومن نہیں ہو جاتا جیسا کہ لڈو کا لفظ زبان سے کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہو جاتا' منہ میٹھا جب ہی ہو گا جب بجائے لفظ اور اسم کے لڈو کا مسمی منہ میں آئے گا۔ معلوم ہوا کہ خالی الفاظ کافی نہیں اسی واسطے کہا ہے کہ میم و واؤ و میم و نون کہنے سے مومن نہیں ہوتا اور فرماتے ہیں:

مست ولا یعقل نہ از جام ہو　　　　اے زہو قانع شدہ بر نام ہو

یعنی تو خدا کا نام صرف زبان سے لیتا ہے اور اس پر قناعت کیے ہوئے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تو ابھی جام محبت سے سرشار نہیں ہوا اور نہ مست اور مدہوش ہو جاتا تو نے صرف لفظ کو رٹا ہے اس لیے جو حالت محبت والے کی ہوا کرتی ہے وہ نہیں پیدا ہوئی وہ نشہ اس لیے سوار نہ ہوا کہ تو نے صرف نام سیکھا ہے اور کام نہیں کیا اور اس سے علاقہ نہیں پیدا کیا تجھ کو محبت والا اور عاشق اور اللہ والا کیسے کہا جائے اگر صرف الفاظ کافی ہوا کریں تو الفاظ کے درجہ میں تو شیخ چلی نے بھی شادی کر لی تھی اور بچے بھی ہو گئے اور وہ ایک منٹ میں غارت بھی ہو گئے اور نرے خیال کی دوسری مثال یہ سنو۔

نرا خیال کافی نہیں

ایک طالب علم سے ان کے دوست نے پوچھا آج کل کیا شغل ہے؟ کہنے لگے یہاں کی شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہیں' ان دوست نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ کہنے لگے آدھا سامان تو ہو گیا' آدھا نہیں ہوا' پوچھا کیسے؟ کہنے لگے کہ ہم تو راضی ہیں وہ راضی نہیں۔ مطلب یہ کہ نکاح کے دو جزو ہیں' ایجاب اور قبول ہم ایجاب کرنے کو تیار ہیں اس کے قبول کی دیر ہے۔

کیا اس خیال باندھ لینے سے شہزادی مل گئی' نرے قال اور نرے خیال کی بس ایسی ہی مثال ہے' حاصل یہ ہے کہ نرا خیال کافی نہیں ہے ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خیال بھی بے کار چیز نہیں اس سے یہ فائدہ ہے کہ اس کی مزاولت سے استحکام ہو جاتا ہے چنانچہ اول ہر کام کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے پھر کام شروع ہوتا ہے پھر اس شروع کے بعد تکمیل ہوتی ہے پھر اس

تکمیل پر نتیجہ اور غایت کا ترتب ہو جاتا ہے جیسے نکاح کہ اول دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں' پیغام دیا جاتا ہے' طرفین سے رضا مندی ہو جاتی ہے پھر ایجاب وقبول ہو جاتا ہے' بس نکاح کا وجود ہو گیا' پھر خدا نے چاہا تو توالد وتناسل ہوتا ہے یا کاشتکاری ہے کہ اول خیال پیدا ہوتا ہے پھر زمین تلاش کی جاتی ہے پھر معاملہ طے کر لیا جاتا ہے اور کام شروع کر دیا جاتا ہے پھر اس کی تکمیل پر پیداوار ہو جاتی ہے۔

خیال خود مقصود بالذات نہیں

تو خیال بھی ایک درجہ میں مفید چیز ضرور ہے مگر اس کے مفید ہونے میں یہی شرط ہے کہ مقرون بالعمل ہو جاوے یعنی خیال وہی مفید ہے جس کے بعد کام بھی شروع کر دیا جاوے۔ بلفظ دیگر خیال مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ ذریعہ ہے مقصود کا اور ذریعہ اس وقت کار آمد ہوتا ہے جبکہ مقصود کے حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ مثلاً سیڑھی کے ذریعہ ہے چھت پر چڑھنے کا تو سیڑھی کا بنانا درست ہے اور ضروری ہے لیکن اسی شرط سے کہ چھت پر چڑھنے کے کام میں لائی جائے نہ یہ کہ سیڑھی بنا کر احتیاط سے گھر میں رکھ لی جائے اور اس کو مقفل کر دیا جائے اور کبھی اس کو استعمال نہ کیا جائے یا بہت سی سیڑھیاں بے ضرورت بنا بنا کر گھر میں رکھ لی جاویں۔

علی ہذا خیال بھی گو کار آمد چیز ہے مگر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعے ہے کام کا تو اسی درجہ تک اس کو اختیار کرنا چاہیے جس درجہ تک کام کے وجود میں اس کو دخل ہے اور اس کا معیار یہ ہے کہ وہ مقرون بالعمل ہو' دیکھئے کاشتکاری کا خیال پیدا ہوتا ہے یہ مفید ہے لیکن اسی وقت جبکہ اس کے بعد کام شروع کر دیا جائے' زمیندار سے کاغذ پٹہ لکھوایا جائے' بیج بہم پہنچایا جائے' بیل خریدے جائیں' پانی دینے کا انتظام کیا جائے' تخم ریزی کی جائے' پھر جب کھیتی پیدا ہو جائے تو اس کی حفاظت کا سامان کیا جائے' اب امید ثمرہ کی ہوگی تو یہ خیال مفید ہوا مگر اسی وجہ سے کہ مقرون بالعمل ہو گیا اور اگر صرف خیال ہوتا یعنی اس کے بعد عمل نہ شروع ہوتا تو بیکار تھا' گو تمام عمر اسی میں گزر جاتی۔ غرض خیال کار آمد اسی وقت ہے کہ بعد اس کے عمل بھی ہو۔

یاد اور خیال میں فرق

اور یہ بھی یاد رہے کہ عمل جب ہوسکتا ہے جب علم ہو اور علم حاصل ہوسکتا ہے سیکھنے سے اور کسی کا اتباع کرنے سے تو حاصل یہ ہوا کہ خیال اس وقت مفید ہے کہ اس کے ساتھ عمل اور اتباع کسی محقق کا ہو ہر بنیاں کی یہی حالت ہے۔ پس اسی طرح اللہ کا خیال بھی ہے کہ وہ جب مفید ہے کہ کام بھی شروع کر دیا جائے اور یہ نہ ہو تو نرے خیال سے مقصود حاصل نہیں ہوتا وہ مقصود کیا ہے تعلق مع اللہ جو صرف یاد سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یاد اور خیال میں فرق ہے، خیال تو وہ ہے جو شیخ چلی نے باندھا تھا اور یاد وہ ہے جو دن رات آپ کے محاورات میں موجود ہے۔ آپ کے دوست کا خط آتا ہے کہ میاں تم نے تو ہم کو بھلا دیا کبھی ملتے نہیں، خط نہیں بھیجتے، کبھی ہم کو بلاتے نہیں، کیا آپ اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھلایا نہیں ہر وقت تمہارا خیال دل میں رہتا ہے، اس جواب کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا، بات کیا ہے؟ وہی کہ خیال کو یاد نہیں کہتے، خیال اور یاد میں فرق ہے، مجھے اسی کی شرح کرنے کی اور فرق بتلانے کی ضرورت نہیں اس مثال سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ دونوں میں فرق ہے۔

ثابت ہوا کہ خدا کے اس خیال میں جس کو تصور کہتے ہیں اور اس میں جس کو یاد کہتے ہیں فرق ہے اور حکم کیا گیا ہے یاد کا۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا۔" (یاد کرو اللہ کو بہت زیادہ) تو مجرد خیال سے کام نہ چلے گا بلکہ یاد کرنے کی ضرورت ہے اور چونکہ یاد میں دوام کی ضرورت ہے اس لیے یاد کرنے کی جگہ یاد رکھنے کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا تو معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ کو یاد رکھو اور بہت یاد رکھو یعنی کسی وقت مت بھولو اور جس طرح دوست کے یاد رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر کام میں اس کو یاد رکھو جس کی علامت یہ ہے کہ کوئی کام ان کے خلاف مرضی نہ کرو اسی طرح یاد حق کے معنے سمجھو اسی کو خیال مقرون بالعمل کہا جاتا ہے۔

غفلت کا علاج

دیکھو! اذکروا اللہ کے بعد وسبحوہ بھی ہے، کیا معنی کہ صرف ذکر ہی پر کفایت نہ کرو، تسبیح بھی کرو، ظاہر ہے کہ تسبیح از جنس عمل ہے تو یہ معنی صاف طور سے نکل آئے کہ خیال

مقرون بالعمل ہونا چاہیےتو خدا کا خیال وہی معتبر ہوا جس کے ساتھ عمل بھی ہو۔ جب یہ حالت ہےتو یہ بات کیسے مان لیں کہ خدا تعالیٰ کی یاد یا خیال ہمارے دل میں ہے جبکہ اس کے ساتھ عمل نہیں ایسی یاد تو غفلت ہی میں داخل ہے اور یہی غفلت اصل ہےتمام معاصی کی جس کو میں نے اوپر بھی عرض کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اسی غفلت کو ذکر فرمایا ہے کیونکہ مقصود علاج ہےاور اصل اور فرع میں سے علاج اصل ہی کا کرنا کافی ہوتا ہے جب اصل زائل ہوجاتی ہےتو جو مرض اس کی فرع ہیں وہ خود زائل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ[1]

(یعنی حق تعالیٰ وہ دعا قبول نہیں فرماتے جو غافل دل سے نکلی ہو) اس میں مذمت ہوئی' غفلت کی جس کا میں نے اب تک بیان کیا ہے اس لیے اس کے مزید بیان کی تو حاجت رہی نہیں اب صرف یہ سمجھنا رہ گیا کہ غفلت کے چند درجے ہیں' بڑا درجہ تو یہ ہے کہ عین حالت طاعت میں بھی غفلت ہوجیسی ہماری حالت ہے کہ وہ اوقات میں تو غفلت ہے ہی عین طاعت کے وقت بھی غفلت ہی رہتی ہے سارا وقت غفلت ہی میں گزرتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ ہم کس کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ رکوع سجدہ کیسے کیا کیا پڑھا اور کیا زبان سے دعا کی چونکہ عادت پڑگئی ہے زبان سے الفاظ ادا ہوجانے کی اس وجہ سے قرأت اور تسبیح پوری ہوجاتی ہے ورنہ اول کوتو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم کہاں ہیں ذرا سوچنے کی بات ہے کہ حاکم کا ادب تو یہ ہوتا ہے کہ حاکم اگر سامنے بھی نہ ہوتب بھی ادب کیا جائے چنانچہ حاکم کے مکان میں گھستے ہیں تو اس کی ہیبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں' قدم آگے کو نہیں بڑھتا حالانکہ حاکم اس وقت اس مکان میں نہیں ہے مگر یہ حالت ہوتی ہے کہ اس خالی مکان میں بھی اگر بیٹھتے ہیں تو چپکے چپکے بیٹھے رہتے ہیں' غل مچانے کی بلکہ بولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

یہ تو حاکم کی غیبت میں حالت ہوتی ہے اور جب حاکم سامنے ہوتا ہے تو اس وقت تو کچھ نہ پوچھو کیا حالت ہوتی ہے ہوش وحواس درست نہیں رہتے' بات منہ سے نہیں نکلتی اگر

---

[1] (مسند احمد ۲:۱۷۷' الترغیب والترھیب ۲:۳۱۹)

حاکم ان سے بات کرنا چاہے تو جواب کے لیے زبان کام نہیں دیتی' جب ایک ذرا سے حاکم کا ادب اور ہیبت یہ ہے تو خدائے احکم الحاکمین کا کیا ادب ہونا چاہیے اور کیا ہیبت ہونی چاہیے' حاکم سے تو غیبت بھی ہو جاتی ہے' خدا تعالیٰ سے تو غیبت بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقتضا تو ضروری یہ ہونا چاہیے کہ ہر وقت آدمی ڈرتا کانپتا رہے' معصیت تو بہت دور ہے بولنا چالنا بھی بند ہو جانا چاہیے لیکن اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے کام سب بند ہو جاتے ہیں اس واسطے اس درجہ کی حضوری کا احساس کم کر دیا گیا ہے اور ایسا پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ باوجود یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور ان سے کسی وقت غیبت نہیں ہو سکتی لیکن اس کے مقتضاء کے درجہ کا اثر نہیں ہوتا اور وہ ادب اور ہیبت ہم پر طاری نہیں ہوتی' خیر اگر ہر وقت اور اس درجہ تک بھی طاری نہ ہوتا ہم کسی وقت اور کسی درجہ میں تو اس کا احساس ہونا چاہیے۔ اگر ہیبت حضوری ہر وقت طاری نہیں ہوتی تو غفلت دوری بھی تو ہر وقت طاری نہیں ہونی چاہیے' کوئی وقت تو ایسا ہونا چاہیے جس وقت غفلت محض نہ ہو اور حضوری کے آثار پیدا ہوں' ایسا وقت وہی تجویز کر لو جس وقت ارادہ کر کے حضوری میں کھڑے ہوتے ہو یعنی جس وقت طاعت میں مشغول ہوتے ہو اس وقت تو حضوری میں گزارو' اس میں تو آثار حضوری کے پیدا کر لو' نماز پڑھنے' کھڑے ہوئے ہو تو آموختہ سا تو نہ پڑھو اس وقت تو اتنا خیال کر لو کہ ہم کس سے بات کر رہے ہیں' اگر کسی معمولی آدمی سے بھی بات کرتے ہو تو اس کی طرف منہ کر کے بات کرتے ہو اور اپنے الفاظ کو سمجھ کر زبان سے نکالتے ہو اور اس کے جواب کی طرف کان لگائے رہتے ہو اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھ کر جواب دیتے ہو اور اگر اس مخاطب سے تم کو خاص محبت ہوتی ہے تو اس سے بات کرنے میں اور اس کا جواب سننے میں مزہ آتا ہے اور چاہتے ہو کہ بات کو جلدی نہ ختم کرے جب ایک اپنے ہم جنس کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو سوچ لو خدائے احکم الحاکمین اور سلطان المحبوبین کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے اور ان سے کس طرح بات کرنی چاہیے' کیا اس کا یہی طریقہ ہونا چاہیے کہ جب سامنے پہنچے منہ پھیر کر تو کھڑے ہو گئے اور آموختہ سا یاد کر کے لے گئے وہ سب ایک سانس میں پڑھ کر ختم کر دیا۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ ہم نے کیا سنایا' آموختہ بھی صحیح پڑھا گیا یا نہیں پھر یہ انتظار ہے کہ کہیں جلدی ختم ہو اور بھاگیں میں پھر کہتا ہوں کہ کیا خدا سے بات کرنے کا یہی طریقہ ہونا چاہیے' ذرا انصاف کیجئے اور ذرا خدا سے ڈریئے' خدا سے غفلت کرنا یہی خدا کی طرف پشت

کرنا ہے نماز اس طرح پڑھنا کہ دل کہیں ہے زبان سے الفاظ نکل رہے یہی خدا کی طرف پشت کرنا ہے کبھی تو دل میں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

غفلت کے درجات

غرض یہ غفلت کا بڑا درجہ ہے کہ طاعت کی حالت میں بھی غفلت ہو جس کو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ حضوری کا وقت ہے حقیقت میں تو خدا تعالیٰ سے ہر وقت ہی حضوری ہے مگر خیر اور وقتوں کو چھوڑ کر اطاعت کے وقت تو غفلت نہ ہو۔

دوسرا درجہ غفلت کا یہ ہے کہ طاعت [illegible] تو کچھ یاد ہو جاتی ہے مگر اور وقت میں نہیں ہوتی اس میں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو ذاکرین کہلاتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح زبان کا ایک شغل ہے ایسے ہی قلب کا بھی ایک شغل ہے یعنی زبان کا شغل ذکر لسانی ہے اور قلب کا شغل ذکر قلبی اور توجہ الی اللہ اور خدا کی [illegible] خدا کا خیال۔ سو اکثر ذاکرین زبان کو مشغول ذکر رکھتے ہیں لیکن دل کو مشغول نہیں رکھتے قلب کی غفلت میں یہ ذاکرین بھی مبتلا ہیں اس لیے ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جیسے ذکر لسانی ضروری چیز ہے ایسے ہی ذکر قلبی بھی ضروری چیز ہے یعنی ہر وقت قلب کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھنا چاہیے۔ ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال کر لینا جائز ہے لیکن بلاضرورت غیر کا خیال نہ لادیں یہ مشغلہ تو نہ رکھیں کہ ہر وقت دل غیر اللہ ہی کے خیال میں لگا رہتا ہے اس سے دل کو فارغ رکھنا چاہیے' ضرورت کے وقت اگر خیال کسی طرف ہٹ جاوے خیر مگر اس [illegible] کے رفع ہونے کے بعد تو فوراً پھر اسی طرف آ جائیں' اس ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال کی اجازت دے دینے سے میں نے ساری دنیا کو سنبھال لیا اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے ضروریات کا علم نہیں ہے۔ صاحبو! مجھے بھی آپ کی طرح ضروریات کا علم ہے چنانچہ دیکھئے اس کی کس قدر رعایت کر دی گئی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اصل چیز ذکر اللہ کو سمجھو غیر کا خیال اگر آوے تو بضرورت اور میں کہتا ہوں کہ اگر یہ عادت ہو جائے گی کہ غیر ضرورت کے وقت میں یعنی دنیا کے کاموں سے فراغت کے وقت میں خدا تعالیٰ کی یاد رکھو گے تو اس کا اثر ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ہو گا کہ اس ضرورت کے وقت میں بھی یعنی دنیا کے کاموں میں مصروفیت کے وقت بھی خدا تعالیٰ کی یاد

رہے گی اور یہ بات پیدا ہو جائے گی کہ ہر وقت اللہ ہی کی یاد دل میں بسی رہے گی غیر اگر دل میں آوے گا بھی تو اچٹتا اچٹتا جب ایک مکان میں کرایہ دار کو بسا دیا تو اب غیر آدمی اس مکان میں آتا ہے تو بطور مہمان کے آتا ہے مگر اب اس کا الٹا ہو رہا ہے کہ مکان پر تو غیر کا قبضہ ہو گیا ہے کرایہ دار اگر آنا چاہتا ہے تو اندر اپنا دخل نہیں کر سکتا' بطور دیکھنے والوں اور تماشائیوں کے آتا ہے کہ ایک نظر ڈالی اور لوٹ گیا اس لیے ضرورت ہے کہ غیر کے قبضہ سے مکان کو نکالو اور اس میں اللہ کو بسالو تا کہ دوسرا آوے تو ادب سے مہمان داخل آوے۔

اور میری اس تقریر سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ غیر سے تعلق رکھنے کو مطلقاً منع نہیں کیا جاتا تعلق کی اجازت دی جاتی ہے مگر اتنا ہی تعلق جتنا مہمان سے ہوتا ہے یا جتنا تعلق ایک اجنبی سے ہوتا ہے۔ دیکھو ہمارے نوکر بھی گھر میں آتے ہیں مگر ادب سے آتے ہیں' مکان پر قبضہ کرنے نہیں آتے اور نہ ہم پر حکومت کرنے آتے ہیں' پس غیر اللہ کو دل میں لاؤ مگر اس طرح لاؤ میں یہ نہیں کہتا کہ غیر اللہ کو بالکل دل میں نہ لاؤ ضرورت سے لاؤ مگر اجنبیانہ اور عارضی طور پر اصل رہنے والا دل کے مکان کا اللہ تعالیٰ کو بنالو یہ فرق خوب یاد رکھنے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ میں اور غیر میں اصلی اور عارضی کا فرق رکھو' اب دیکھئے میں نہ دنیا چھوڑاتا ہوں نہ کسی کام کو بند کراتا ہوں' کام سب کرو مگر اصلی کام اپنا خدا کی یاد سمجھو۔ دوسرا کام کیا اور اپنے اصلی کام میں لگ گئے اب ذرا غور کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے دل کی کیا حالت ہے اللہ کی یاد میں اور غیر کی یاد میں جو فرق ہونا چاہیے آیا اس میں یہی فرق ہے یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد بطور اصلی رہنے والے کے ہے اور غیر کی یاد بطور اجنبی آنے والے کے اگر یہ فرق نہیں ہے تو عنقریب ہی سر پکڑ کر روتا ایک وقت وہ آئے گا جس وقت حسرت ہوگی کہ ایک جلسہ کو بھی خدا کی یاد سے خالی کیوں چھوڑا تھا اس وقت اس کی تلافی کچھ بھی نہ ہو سکے گی اگر میں دنیا کو اور غیر کے خیال کو چھوڑاتا تب تو آپ کے پاس عذر تھا اور اب کیا عذر ہے میں تو کسی ضروری کام کو منع ہی نہیں کرتا بس یہ کہتا ہوں کہ اصلی اور عارضی کا فرق رکھو' اللہ کی یاد کو غالب رکھو اور غیر کی یاد کو مغلوب وہی مثال نوکروں والی یاد کرو' گھر کے کاموں کے لیے نوکروں کا گھر میں آنا ضروری ہے مگر ان کا گھر پر قابض ہو جانا ضروری نہیں' نوکر نوکر

کی طرح آ دیں، گھر کے مالک بننے کو اور تم پر حکومت کرنے کو تو نہ آ دیں، یہ موٹی بات ہے اس مثال کو خوب یاد کرلو، مالک اور قابض دل کا اللہ تعالیٰ کو بناؤ اور غیر اللہ کو صرف نوکروں کی طرح آنے دو اور یہ بات اختیاری ہے واللہ ثم واللہ اختیاری ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم سے ایسا نہیں ہوسکتا، ہوسکتا ہے اور بہت آسانی سے ہوسکتا ہے ہم لوگ توجہ نہیں کرتے اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے ورنہ بہت آسانی سے اس کا حاصل کرنا ممکن ہے کر کے دیکھو اس کے بعد کہنا یہ کیا مشکل ہے کہ یاد سب کی رکھو مگر خدا کی یاد کو غالب کرلو اگر اس کو بھی مشکل سمجھو تو ایک ڈنڈا سیڑھی کا اس سے نیچے اور ہے وہاں ہی تک چڑھ جاؤ اس سے بھی بام تک پہنچ جاؤ گے، وہ یہ کہ خدا کی یاد دل میں بسانے میں شاید یہ عذر ہو کہ خدا کو دیکھا نہیں ہے نہ بعینہ نہ بنظیرہ اور ایسی ہے بے دیکھی چیز کی یاد بار بار آنا یا دل میں جمانا مشکل ہے اور ایسی چیز کی یاد میں ابتداء مزا بھی نہیں آتا تو دل کیسے اس کا خوگر ہو۔

دل سے مانع خیالات نکالنے کا عمدہ علاج

سو میں اس عذر کا بھی جواب دیتا ہوں اور ایک مزے دار چیز کا جس کی نظیر کہ تم نے دیکھا بھی ہے پتہ بتاتا ہوں اس کی ہی یاد کیا کرو وہ کیا ہے تمہارا گھر جنت جہاں سے تم دنیا میں آئے ہو اس کو یاد کرو اس کی یاد تو مزے دار ہے اور اس کی نعمتوں کے نظائر دیکھے ہوئے بھی ہیں۔ ان کا خیال جم بھی جائے گا تم اس کو ایک دفعہ بقصد و اہتمام دل میں لاؤ گے تو دل اس کے مزے کی وجہ سے دس دفعہ اعادہ کا تقاضا کرے گا، لیجئے اس میں تو بہت سہولت ہوگئی اگر خدا کی یاد دیسے نہیں بستی ہے تو یوں چلو ابتداء اس سے کرو انتہا خدا کی یاد پھر ہو جائے گی۔

اس پر بھی شاید یوں کہا جائے کہ جنت بھی بہت دور ہے کیونکہ وہ آخرت ہے اور اس کا دور ہونا ظاہر ہے ذہن وہاں تک پہنچنے میں لنگڑاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو دھوکہ ہوا کہ جنت ایک مکان کا نام ہے دور نہیں البتہ اس کا ملنا کہ متعلق زمان کے ہے، ضرور دور ہے پس زمان آخرت بیشک دور ہوا خدا جانے کتنی صدیاں ابھی باقی ہیں مگر مکان آخرت دور نہیں، وہ مکان آسمان پر ہے اور یہ ثابت ہے کہ جنت موجود بالفعل ہے: "وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" کے عموم میں وہ بھی

داخل ہیں تو اب اس کے سوچنے میں تو کچھ دشواری نہیں' یوں سوچا کرو کہ ہمارے سر کے اوپر آسمان میں جنت ایک جگہ ہے جو دنیا سے کہیں اچھی ہے' دنیا اس کے سامنے کوئی چیز نہیں' اس میں حوریں ہیں' محلات ہیں' اشجار ہیں' انہار ہیں' یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا تصور آیا پھر دل اس کو چھوڑنے ہی کا نہیں اور بار بار یاد کرے گا اور اس میں زیادہ سوچنا بھی نہیں پڑے گا کیونکہ سر کے اوپر موجود ہے بعید زمانی کا سوچنا البتہ مشکل ہوتا ہے سو وہ آخرت کا زمانہ گرچہ وہ بھی بہت بعید نہیں ہے کیونکہ جو چیز آنے والی ہے وہ ضرور آ جاوے گی۔ اس کا بعد قابل لحاظ نہیں ہوتا مگر خیر وہ بعید سہی تم ایسی چیز کو سوچو جو اس وقت بھی موجود ہے۔ صاحبو! دیکھئے کتنی آسانی ہوگئی جب خالی بیٹھو بجائے اس کے کہ اور فضول خیالات کے ساتھ دل کو مشغول رکھو یہ سوچا کرو کہ ہمارے اوپر ایک مکان ہے جس کا نام جنت ہے اس میں انگور ہیں' حوریں ہیں' نہریں ہیں' طرح طرح کی نعمتیں ہیں' اس خیال سے شوق پیدا ہوگا پھر یہ سوچو کہ ان چیزوں کے ملنے کا مدار اعمال پر ہے' اعمال ہوں گے تو یہ چیزیں ملیں گی اور نہیں تو حسرت ہی حسرت ہوگی اس سے ہمت پیدا ہوگی اور قلب اور اعضاء مستعد ہو جائیں گے' اعمال کے لیے جب اعمال ہوں گے تو خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے جنت کیوں نہ ملے گی دیکھو کیسا سہل راستہ ہو گیا کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جنت کا تصور کیا جائے پھر دل یہ نہ کہے کہ اس باغ کو اپنا بناؤ اور اپنا بنانا موقوف ہے اعمال پر پھر اعمال کی برکت سے خدا کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا۔ جب خدا سے تعلق پیدا ہو گیا اسی کا نام یاد خدا ہے' لیجئے جنت کی یاد کیا ہوئی تمام بھلائیوں کی جڑ ہوگئی اور دل سے مانع خیالات نکالنے کا عمدہ علاج ہو گیا۔

دل سے خیالات مٹانے کی عمدہ تدبیر

اس طرح سے کہ جب دل میں دنیا کی کوئی چیز آوے تو فوراً یہ سوچو کہ ہماری بی بی وہاں منتظر ہے کہ دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے سو مجھ کو ایسے کام کرنے چاہئیں جس سے یقیناً ملاقات ہو جائے یہ خیال ایسا ہے کہ دوسرے سب خیالوں کو فوراً دبا لے گا کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں جس کو بی بی کا شوق نہ ہو اور وہ بی بی بھی کیسی جس کی صفت حدیث میں یہ آئی ہے کہ اگر اس کے دامن کا ایک کنارہ دنیا میں لٹکا دیں تو اس کی روشنی کے سامنے چاند' سورج

مانند ہو جائیں، یہ تو ان کے کپڑے کی صفت ہے اور ان کے جسم کی یہ کیفیت آئی ہے کہ متعدد حلوں اور گوشت پوست اور ہڈی کے اندر سے گودا نظر آئے گا اس کی نظیر کہیں بھی دنیا میں ہے یا ہو سکتی ہے ایسی بی بی کا خیال ایسی چیز نہیں ہے کہ سرد سے سرد آدمی کو بھی ایک دفعہ گرم نہ کردے اور سست سے سست کو بھی اعمال کے لیے مستعد نہ بنادے اس کے سامنے کوئی خیال دل میں نہیں رہ سکتا۔

لیجئے یہ آسان تدبیر ہے خیالات کے دل سے مٹانے کی اور لوگ ذکر اللہ کی تعلیم کرتے ہیں اور میں ذکر الزوجہ کی تعلیم کرتا ہوں مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ اس کے بعد آگے بھی چلو، زوجہ ہی تک نہ رہ جاؤ اور میرے اس کے کہنے کی کہ آگے کو چلو چنداں ضرورت بھی نہیں کیونکہ یہ زوجہ اپنی طرف کھینچے گی اور اس کی طرف کھینچنے کا راستہ صرف اعمال ہیں، اعمال کے بغیر ہاتھ آ نہیں سکتی تو جس کو اس کا شوق پیدا ہوگا اس کو اعمال کا شوق پہلے پیدا ہوگا، تو میں نے درحقیقت ذکر الزوجہ کی نہیں تعلیم کی بلکہ اس کی آڑ میں تمام اعمال کی اور تعلق مع اللہ کی تعلیم کی ہے۔

امر تحریص

اور یہ تعلیم میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ حق تعالیٰ یہی تعلیم دے رہے ہیں حور قصور اور نعیم جنت کا ذکر کر کے فرماتے ہیں: "وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ."
(یعنی یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اس میں حرصا حرصی کریں، حرصا حرصی کرنے والے)

دیکھئے اس میں امر تحریص فرمادیا ہے، حوروں کی حرصا حرصی کا لیجئے ذکر زوجہ کی تعلیم کا قرآن سے ثبوت ہوگیا، پھر ان کے تصور کے ساتھ حق تعالیٰ کا تصور بھی پیدا ہوگا کہ ان نعمتوں کے دینے والے وہی ہیں پھر حق تعالیٰ کے اس تصور اور اعمال کی برکت سے یہ ہوگا کہ ان کا تصور مضمحل اور حق تعالیٰ کا تصور مستحکم ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ وہی رہ جائے گا یہی مقصود ہے تو ذکر الزوجہ کی تعلیم ذکر اللہ حاصل کرنے کے لیے ہوئی، سائنس کی روح سے فلاسفی اس کی یہ ہے کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی اور اعمال سے قرب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا اور اس پر حق تعالیٰ فضل فرماتے ہیں وہ فضل یہ ہوگا کہ وہ خود توفیق دیں گے

اور آپ کے دل میں اپنی یاد پیدا کر دیں گے۔ خوب کہا ہے:

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا وُ پست

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے تو پانی کو ڈھونڈتے ہی ہیں، پانی بھی پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے بلکہ واقع یہ ہوا ہے کہ پیاسوں کی تلاش کے لیے پانی پہلے آیا ہے۔ چنانچہ آپ کی پیاس کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا ہے)

حق سبحانہ تعالیٰ کا غایت کرم

ادھر سے فضل پہلے ہوتا ہے تب کچھ ادھر سے ہوتا ہے۔

خود بخود آں شہ ابرار ببرمی آید

نہ بزور نہ بزاری نہ بزرمی آید

یہ جو کچھ اپنے عمل آپ دیکھتے ہیں پہلے ادھر سے ارادہ دل میں پیدا کیا جاتا ہے اور توفیق ہوتی ہے پھر آپ کے ہاتھ سے ان کا ظہور ہو جاتا ہے اس ظہور سے آپ کا نام ان میں لگ جاتا ہے اور آپ مستحق ثمرات کے ہو جاتے ہیں اس کی حقیقت سوائے اس کے نہیں کہ ان کو خود ہی کرم فرمانا اور کچھ دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہ غایت کرم ہے کہ آپ کی سعی کی نفی کر کے احسان بھی رکھنا نہیں چاہتے اور جو کچھ دیتے ہیں آپ کے کسب کا نام لگا کر دیتے ہیں پس عمل کے اسی درجہ کے اعتبار سے یہ حکم کیا گیا ہے کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی پھر حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا اور وہ اپنا مقرب بنالیں گے' یہ فلاسفی ہوئی ذکر آخرت کے نفع کی اور اس کی ضرورت تھی جس کی میں نے ہندی کی چندی کر دی۔

جو اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

مطلب یہ ہے کہ ہر وقت کا فضول دھندا ادھر ادھر کا چھوڑ و صرف ضرورت کے وقت کام میں اور کام کی ضرورت سے اس کے خیال میں لگ جایا کرو پھر جب وہ کام ہو جائے تو اس دھندے کو الگ کرو' آخر مومن کو حق تعالیٰ کے ساتھ عشق کا دعویٰ ہے اور عشق کی خاصیت سب کو معلوم ہے کہ عاشق کا غیر کی طرف التفات کرنا محبوب کو کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔

آج کل کی عاشقی

ایک قصہ اختتام مثنوی میں ہے کہ ایک عورت جارہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا' اس نے مڑکر دیکھا پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آتا ہے اس نے کہا کہ میں تیرے اوپر عاشق ہوگیا ہوں' اس نے کہا بیوقوف میرے اوپر کیا عاشق ہوتا ہے پیچھے میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے' عاشق ہونا ہے تو اس پر عاشق ہو اس شخص نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ وہ اس کی بہن کہاں آرہی ہے آج کل عاشقی ایسی ہی ہے یہ عاشق نہیں فاسق ہیں۔

وفاداری مدار از بلبلاں چشم ۔۔۔۔ کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

(بلبلوں کی آنکھ سے وفاداری کی امید مت رکھ کہ ہر گھڑی ایک پھول کو چھوڑ کر دوسرے پھول کو چاہنے لگتی ہیں)

جوں ہی اس نے مڑکر دیکھا کہ عورت نے اس کے سر پر ایک دھول رسید کی اور کہا:

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ۔۔۔۔ در بیان دعویٰ خود صادقی

پس چرابر غیر افگندی نظر ۔۔۔۔ این بود دعوائے عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا اے بیوقوف اگر تو عاشق تھا اور اپنے اس دعوے عشق میں سچا تھا تو پھر غیر پر کس لیے نظر ڈالی' اے بے خبر کیا تیرا دعویٰ عشق یہی تھا؟)

جب ایک عورت کو غیر کی طرف التفات کرنے سے اتنی غیرت آتی ہے تو خدائے تعالیٰ کو کتنی غیرت آوے گی دل تو حق تعالیٰ کا محل ہے اس میں وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ غیروں کو بسا ہوا دیکھے۔

صاحبو! دل میں کسی کو بساؤ نہیں اگر اجنبی کی طرح آجاوے تو مضائقہ نہیں' اجنبی کسی مکان میں ہر وقت نہیں آیا کرتا ضرورت کے وقت آتا ہے اور اجازت لے کر آتا ہے اس کا قبضہ مکان پر نہیں ہوتا' بس یہی برتاؤ کرو ذکر اللہ اور غیر ذکر اللہ کے ساتھ' بتایئے اس میں کیا دقت ہے میں مکرر کہتا ہوں کہ آخر اس تعلیم میں کون سی دشواری ہے ہاں ایک وجہ بیشک ہے دشوار ہونے کی وہ یہ کہ ہمارا خاصہ ہے کہ ہم پردہ کا کام آسان ہوتا ہے جس کی غیروں کو بھی خبر رہے' دکھلانا اور سنانا ہمارے کام میں گویا خمیر رہتا ہے' ذکر اللہ بھی اگر آسان ہوتا ہے تو اسی

صورت سے کہ الا اللہ الا اللہ پکار کر کہہ رہے ہیں زور زور سے ضربیں لگا رہے ہیں' سارے محلے کو خبر ہو رہی ہے' غرض ذکر بالجہر میں دشواری نہیں ہوتی ' ذکر خفی میں دشواری ہوتی ہے۔ وجہ کیا ہے کہ جہر کو دوسرے سنتے ہیں اور خفی کو کوئی سنتا نہیں اسی طرح وضع قطع صورت شکل صلحاء کی سی بنالی ہے' نیچا کرتا ہے پائجامہ اونچا کرلیا ہے' یہ سب آسان ہے کسی میں دشواری نہیں' دشواری ہے تو اندر کی اصلاح میں ہے کیونکہ اندر کی کسی کو خبر نہیں کہ گوہ بھرا ہے یا کیا کیونکہ اندر کو دوسرا شخص دیکھتا نہیں اندر کچھ ہی رکھیں مثلاً عورتیں جمع رکھیں یا رشوت اور سود بھرا رکھیں تو کسی کو کیا خبر ان سے اگر دل پاک کریں تو اس میں مشقت تو بہت اور محنت کی خبر کسی کو ہوگی نہیں تو نفس کہتا ہے کہ سسرے اتنی محنت بھی کی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں تو ناحق گھٹ کر مرے' بس یہ عمل اس وجہ سے دشوار ہو جاتا ہے اور اگر یہ بھی کسی طرح سے دکھا کر کیا جاسکتا ہے تو اس میں بھی ذرا دشواری نہ رہتی' یہ ہماری اسی خاصیت کا اثر ہے کہ ہم کو وہی کام آسان ہوتا ہے جس کی لوگوں کو خبر ہو اور جس کی لوگوں کو خبر نہ ہو وہ دشوار ہوتا ہے۔

پابندی اعمال میں حکمت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارا جو عمل بھی ہے وہ سب مخلوق کے دکھانے کو ہے' جتنا ظاہر ہم نے بنا رکھا ہے اور جو کچھ ضربیں لگاتے ہیں اور جو کچھ وضع قطع درست کر رکھی ہے وہ سب لوگوں کے دکھلانے کے لیے ہے اور یہ بہت خطرناک بات ہے' باطن کے عمل تو کرتے نہیں اس واسطے ان سے محروم رہے اور ظاہر کے کچھ عمل کرتے ہیں مگر وہ اس واسطے ضائع کہ ان میں للہیت نہیں وہ دوسروں کے لیے ہیں لہٰذا اعمال سے مطلقاً خالی رہے اور مزید برآں دکھلاوے کا گناہ سر پر رہا یہ حالت تو بعض وجوہ سے اس سے بھی زیادہ بری ہوئی کہ ظاہر کے اعمال بھی نہ کرتے اس وقت میں یہی ہوتا کہ اعمال سے محروم رہتے' گناہ تو سر نہ ہوتا اب تو محرومی بھی ہے اور گناہ بھی سر رہا گو ریا کے ساتھ بھی اعمال کی پابندی میں یہ مصلحت ضرور ہے کہ اس سے اعمال کی عادت ہو جاتی ہے پھر عادت کے بعد ریا رخصت ہو جاتی ہے اور اس لیے محققین اعمال ریائیہ کے ترک کی بھی اجازت نہیں دیتے لیکن تاہم ریاء کے مذموم ہونے کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا جس کی اس مقام پر شکایت کی جارہی ہے اور اگر کوئی خدا کا بندہ اعمال ظاہری میں ریاء سے پاک ہے اور اللہ ہی کے واسطے کر رہا ہے تو اس سے یہ سوال

پھر بہت سہل ہے کہ اگر اعمال ظاہری کو اللہ کے واسطے کیا ہے تو اعمال باطنی میں کون چیز اس سے مانع ہے بلکہ اللہ کے واسطے کا تو وہاں مفہوم بطریق احسن ثابت ہے کہ اس میں مخلوق کی نمائش کا احتمال ہی نہیں پھر وہ تم کو کیوں دشوار ہوتے ہیں جب اعمال باطنی دشوار ہوتے ہیں اور اعمال ظاہری دشوار نہیں ہوتے تو اس سے تو صاف شبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے واسطے کا دعویٰ غلط ہے بس جو کچھ ہے مخلوق کے دکھلانے کے لیے ہے۔

نفس کا ایک دھوکہ

یہاں نفس ایک اور دھوکہ دیتا ہے اور ریاء میں ایک مصلحت بیان کرتا ہے وہ یہ کہ یوں تو اعمال میں بہت مشقت ہے اس کے سہل کرنے کے لیے ضرورت ہے بشاشت کی اور کسی کے سامنے ظاہر ہو جانے سے بشاشت ہو جاتی ہے اور عمل صادر ہو جاتا ہے اور اس سے دل نہیں اکتاتا اور اس لیے اس پر مداومت بھی ہو جاتی ہے۔

اس دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ یہ مصلحت اس میں بیشک ہے مگر اس کی جڑ تو دیکھو کس قدر ناپاک ہے یوں مصلحت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں چوری میں بہت سی مصلحتیں ہیں، کتنے آدمیوں کی روزی اس کی بدولت چلتی ہے لوہار تالے کیوں بناوے اگر چور نہ ہوں چوکیدار کس بات کی تنخواہ پائے اگر چور نہ ہوں پس اگر مصلحت مطلق پر نظر کی جاوے تو کوئی کام بھی محل منع نہیں ہوسکتا، مصلحت سے اول نظر اصل مبنی اور منشاء پر کرنا چاہیے سو یہاں منشاء عمل کا اس قدر برا ہے کہ اس کو شرک خفی فرمایا گیا ہے اور وارد ہوا ہے کہ جب یہ ذکر و طاعت جو مخلوق کے دکھانے کے لیے کیا جاتا ہے قیامت کے دن پیش ہوگا تو کہہ دیا جاوے گا انہی سے انعام لو جن کے دکھلانے اور خوش کرنے کے لیے کیا تھا۔

ریاء کا انجام بد

دوسری حدیث میں اور مفصل آیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے اول ایک شہید کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ تم نے ہماری نعمتوں کا حق ادا کیا؟ عرض کرے گا کہ میں نے جان و مال سب آپ کے نام پر فدا کیا، یہاں تک کہ جہاد کیا اور مارا گیا۔

جواب ملے گا کہ تو نے جان ہمارے واسطے نہیں دی، قتل و قتال جو کچھ کیا تھا وہ صرف اس واسطے کیا تھا کہ لوگ کہیں بڑا بہادر ہے، لوگوں کو سنانے اور شہرت کے لیے یہ کام کیا تھا،

فقد قیل (پس تحقیق کہا گیا) یہ شہرت ہوگئی اور جو مقصود تھا یعنی نام وہ دنیا میں حاصل ہو چکا' اب ہم سے کیا چاہتے ہو' حدیث میں ہے "**فیومر به فلیسحب علی وجهه فیلقی فی النار**"[1] پس حکم ہوگا کہ لیجاؤ اس کو دوزخ میں ڈال دو یہ شہادت کی جزا ملی۔

ایک مولانا بھی پیشی میں تشریف لائیں گے' پوچھا جائے گا کہ آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے میں نے ساری عمر آپ کی راہ میں صرف کی' پڑھا اور پڑھایا' دنیا کے لذات چھوڑ کر یہی کام کیا' جواب ملے گا یہ کام ہمارے واسطے نہیں کیا' اس واسطے کیا تھا کہ کہا جاوے کہ فلانا بڑا قاری یعنی عالم ہے بڑا مولوی ہے۔ سو یہ غرض حاصل ہو چکی دنیا میں شہرت ہوگئی' اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ "**فیومر به الخ**" (پس حکم ہوگا کہ اس کو لے جاؤ اور دوزخ میں ڈال دو)

ایک سخی صاحب تشریف لائیں گے ان سے پوچھا جائے گا آپ نے ہمارے واسطے کیا کیا' کہیں گے میں نے اپنا تمام مال آپ کی راہ میں خرچ کیا' جواب ملے گا جھوٹا ہے' ہمارے واسطے نہیں خرچ کیا بلکہ اس واسطے خرچ کیا کہ کہا جائے گا کہ فلانا بڑا سخی ہے **فقد قیل** یہ کہا جا چکا شہرت ہو چکی تمہاری غرض حاصل ہو چکی اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ "**فیومر به الخ**" (پس حکم ہوگا کہ اس کو لے جاؤ اور دوزخ میں ڈال دو)

یہ کیسے کیسے اعمال صالحہ ہیں مگر جزا کیا ملی جہنم' یہ گت ہے دکھلاوے کی اسی واسطے کہا گیا ہے:

کلید در دوزخ است آں نماز — کہ در چشم مردم گزاری دراز

(جو نماز کہ لوگوں کے دکھلانے کو لمبی اور طویل کر کے پڑھی جائے وہ دوزخ کی کنجی ہے)

نماز افضل الاعمال ہے اور اس پر جو کچھ اجر و ثواب معود ہیں سب جانتے ہیں مگر وہ بھی کلید دوزخ بن جاتی ہے جبکہ اس میں قصد غیر اللہ کے خوش کرنے کا ہو۔

پرسکون زندگی

اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ ہر فعل میں اس کے منشاء اور مبنی پر نظر کرنا چاہیے تو ذکر کے اظہار میں گو یہ مصلحت ہو کہ اس سے دل کو ابھار ہوتا ہے اور بلا اس کے ذکر افسردگی کے ساتھ اور مردہ دل سے ہوتا ہے لیکن جب اصل منشاء اس کا ریاء ہوا اور غیر اللہ کو مقصود بنانا تو اس عارضی مصلحت پر حکم نہیں ہوسکتا' اصل ہی کا حکم رہے گا اور بجائے ثواب کے ریاء کا

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۲: ۱۸۲' حلیة الاولیاء ۳: ۹۱)

گناہ ہوگا۔ اسی طرح اپنے تمام افعال میں غور کرتے رہا کیجئے کیونکہ نفس کے بہت سے کید ایسے ہیں کہ وہ ایک عمل کو اچھی صورت میں دکھلاتا ہے اور حقیقت اس کی نہایت بری ہوتی ہے یہ اس دھوکہ کا جواب ہوگیا اور ریاء کا مذموم ہونا بحالہ رہا' غرض اپنے اس خاصہ کو تبدیل کیجئے کہ آپ پر وہ کام آسان ہوتا ہے جس کی دوسرے کو خبر ہو اور جس کی دوسرے کو خبر نہ ہو وہ دشوار ہوتا ہے اور چونکہ ظاہر کی خبر دوسرے کو ہوتی ہے اس کی درستی آسان ہوتی ہے اور دل سے غیر اللہ کو خالی کرنا کسی کو معلوم نہیں ہوتا اس لیے وہ مشکل ہوتا ہے جب اس خاصہ میں کچھ تبدیلی کرلو گے اور یہ عادت چھوٹ جائے گی تو اس وقت اس تعلیم پر عمل کرنے میں کہ کام کے وقت اس میں مصروف ہوگئے اور اس کو ختم کر کے پھر قلب کو فارغ کرلینا کچھ بھی دشواری نہ رہے گی بلکہ اس وقت قدر معلوم ہوگی کہ اس میں کس قدر راحت ہے کہ کام کے وقت کام کیا' پھر دل کو فارغ کرلیا اور سکون اور چین اور اطمینان اور فراغ کے ساتھ بیٹھے رہے اور اپنے اصل شغل یعنی ذکر اللہ میں لگے رہے اس میں یہ بھی فائدہ ہوگا کہ بہت سے اشغال جو کہ پریشانی کی اصل ہے بچے رہے' صرف ایک شغل رہ گیا اور ایک شغل میں لگنا طبعًا اطمینان کا باعث ہے' دوسرے ذکر اللہ خود اطمینان پیدا کرنے والی چیز ہے۔ " اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. " (خبردار دلوں کو اطمینان صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے) اب فرمائیے اطمینان کی زندگی اچھی ہوتی ہے یا پریشانی کی۔

ذاکرین کے ایک مغالطہ کا جواب

یہاں ایک مغالطہ کا بیان کردینا بھی ضروری ہے جس میں عوام و خواص سب ہی مبتلا ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ جب غیر اللہ کی طرف التفات سے عمل خراب ہوجاتا ہے اور یہ داخل ریاء ہے اور بظاہر اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ذکر خفی کرنا دشوار ہو اور ذکر بالجہر دشوار نہ ہو تو یہ بات تو سب ذاکرین کو پیش آتی ہے کہ ذکر بالجہر میں لطف زیادہ آتا ہے اور دل نہیں اکتاتا اور ذکر خفی سے دل جلد اکتا جاتا ہے اور اس میں ایسا لطف نہیں آتا جیسا ذکر بالجہر میں آتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دکھلاوے کا خیال موجود ہے اگر ایسا ہے تو اس کا تو سب پر برا اثر ہوگا کیونکہ ذاکرین تو اس کو ریاء سمجھ کر تنگی میں پڑ جائیں گے اور گو وہ ذکر کرتے رہیں گے مگر دل خوش نہیں ہوگا اور بشاشت نہیں پیدا ہوگی اور ریاء جیسے گناہ کا ڈر سر پر سوار رہے گا جس سے ہمت ان کی ٹوٹ جائے گی۔

یہ اثر تو سالکین پر ہوگا اور عوام پر یہ اثر ہوگا کہ ان کو بہانہ مل جاوے گی شرارت کا اور عمل کے چھوڑ دینے کا یوں کہیں گے کہ ہمارا عمل ریاء سے خالی ہو نہیں سکتا اور ریاء کے ساتھ عمل بیکار ہے اور مقبول نہیں تو عمل سے فائدہ کیا' پھر کیوں مشقت میں پڑے چلو سہل چھوٹے آرام کرو کہاں کا جھگڑا۔

بشاشت کی دو قسمیں

سو سمجھ لیجئے کہ یہ مغالطہ ہے اور ایسے شبہات غلط فہمی سے پیدا ہوتے ہیں اس کو میں کھول کر بیان کرتا ہوں ذاکرین کے بہت کام کی بات ہے اور علمی قواعد پر منطبق ہے۔ سمجھ لیجئے کہ بشاشت ایک طبعی ہے ایک عقلی تو اظہار عمل سے طبعی بشاشت کا ہونا کہ غیر اختیاری ہے ریاء نہیں بلکہ عقلی بشاشت کہ اختیاری ہے ریاء ہے اب سمجھو کہ ذکر جہر میں ایک خاصیت ذاتی ہے کہ اس میں بہ نسبت ذکر خفی کے زیادہ لذت ہے جیسے قلاقند میں گڑ سے زیادہ لذت ہے اور اس کا طبعی احساس ہونا کچھ مضر نہیں ہاں اس سے عقلی بشاشت اس لیے کہ دوسروں کو ہمارے عمل کی خبر ہو رہی ہے اور وہ ہم کو بزرگ سمجھیں گے یہ مضر ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ریاء بیشک گناہ ہے مگر گناہ ہمیشہ فعل اختیاری سے ہوتا ہے ورنہ اس کے قائل ہوں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے جو اختیاری نہیں یعنی اس سے بچنا اختیار اور قدرت سے خارج ہے تو تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی جس کی نفی آیت میں صراحت موجود ہے۔ "لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) غرض یہ مسئلہ عقائد کا ہے کہ تکلیف مالا یطاق شریعت میں نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاء سے بچنا خارج عن الوسع نہیں ہے۔

وسوسہ ریاء

تو یہ خیال تو غلط ہوا کہ کوئی عمل بدون ریاء کے نہیں ہو سکتا باقی جو خیال ذاکرین کو پیش آتا ہے اور ان کو پریشان کرتا ہے وہ حقیقت میں ریاء نہیں بلکہ ریاء کا وسوسہ ہے اور گناہ ریاء ہے نہ کہ ریاء کا وسوسہ یعنی قصداً ریاء کرنا گناہ ہے نہ کہ ریاء کا بلا قصد آ جانا۔ جب قصد حق تعالیٰ کی رضا کا ہے اور خیال ریاء کا آ گیا تو کچھ پروا نہیں کرنا چاہیے اور مطلق پریشان نہ ہونا چاہیے اس سے کسی قسم کا نقصان عمل میں نہیں آتا بلکہ اس کشاکشی میں اجر بڑھتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ اس قسم

کے خیالات اور وسوسے دل میں ڈال کر آدمی کو عمل سے روک دے مگر جب آدمی نہیں رکتا اور اس کشاکشی میں بھی کام کیے جاتا ہے تو اس کو ایک ثواب تو عمل کا ہوتا ہے اور ایک اس مجاہدے کا تو ذاکر کو اور خوش ہونا چاہیے کہ اتنی ہی دیر عمل کرنے میں ثواب دہرا ہو گیا' شیطان کوئی کسر انسان کے نقصان پہنچانے میں نہیں کرتا ہے لیکن اس سے بھی غلطی ہوتی ہے بسا اوقات وہ ایک کام کرتا ہے نقصان پہنچانے کے لیے اور ہو جاتا ہے اس سے نفع۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

(اگر اللہ چاہے تو دشمن بھی بھلائی کا سبب ہو جاتا ہے)

مسلمان کے لیے ہر حالت خیر ہے

اس لیے سالک کو کسی حال میں بددل نہیں ہونا چاہیے بس خدائے تعالیٰ پر نظر رکھنا چاہیے اس کو شیطان سے بھی نفع ہی پہنچتا ہے۔ دیکھئے شیطان کے اس نقصان پہنچانے کے قصد سے یوں نفع پہنچا کہ اجر بڑھ گیا' مسلمان کے لیے تو ہر حالت خیر ہی ہے جیسے کسی پرانے ہندو نے کہا تھا کہ مسلمان بھی عجیب آدمی ہیں گھٹ جائیں تو فقیر' مطلب یہ ہے کہ جب ان کے پاس کچھ نہیں رہتا تو فقیر بن جاتے ہیں اس میں بھی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر خاموشی اختیار کر لی تو چپ شاہ ہو گئے اور جو واہی تباہی بکنا شروع کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ یہ رموز ہیں حضرت کے سوا دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ غرض گھٹ جائیں تو فقیر بڑھ جائیں تو امیر اور مر جائیں تو پیر یعنی لگے قبر پر چڑھاوے چڑھنے غرض ہر حال میں اونچے ہی۔

مسلمان کی یہ واقعی حالت ہے اگر فہم ہو تو اس کو کسی چیز سے نقصان نہیں پہنچتا اور مقصود سے اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا یہ فہم کی غلطی ہوتی ہے کہ شیطان سے ڈر کر اس کے پیچھے ہو لیتا ہے اور خسارہ میں پڑ جاتا ہے۔

وسوسہ ریاء نہیں

چنانچہ ذاکر کو بھی جب شیطان ذکر سے روکتا ہے تو محض وسوسہ سے اس کو پریشان کرتا ہے اور اس کو اتنی قدرت نہیں کہ کسی کو پکڑ کر عمل سے روک دے پس وہ اگر ذاکر نادان ہے تو اس کو اس طرح نقصان پہنچ جاتا ہے کہ شیطان نے اس وسوسہ سے اس کو ڈرایا اور وہ دفع

وسوسہ کے لیے اس کے مقابلہ کو کھڑا ہو گیا اور وسوسہ سے ڈر کر اس کے پیچھے ہو لیا' پھر جتنی دیر اس کے پیچھے چلتا رہا اتنی دیر ذکر سے رہ گیا اس طرح شیطان کا کام بن گیا اور اس کی غرض حاصل ہو گئی کہ ذاکر کو اتنی دیر کے لیے ذکر سے روک دیا تو اے ذاکرین ہوشیار رہو اور خوب سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا مکر ہے اور گہرا مکر ہے کہ تم کو وسوسہ سے ڈرا کر اپنا کام بنا لیتا ہے اس سے ہرگز مت ڈرو اور یاد رکھو کہ ذکر کرنے میں اگر ریاء کا وسوسہ آئے تو اس کی کچھ پروا مت کرو یہ وسوسہ ریاء کا ہے ریاء نہیں ہے اسی طرح اس کا محل قعر قلب نہیں حوالی قلب ہے اور قلب میں جو متوہم ہوتا ہے تو وہ اس کا عکس ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آئینہ کے اوپر کوئی مکھی بیٹھی ہو تو ایک مکھی آئینہ کے اندر بھی نظر آئے گی مگر وہ مکھی آئینہ کے اندر نہیں ہے بلکہ خلاف واقع ایک چیز نظر آتی ہے اس کو دیکھ کر وہ شخص جو آئینہ کی خاصیت کو نہیں جانتا یہ سمجھتا ہے کہ آئینہ کے اندر مکھی ہے۔ چنانچہ بچوں کے سامنے جب آئینہ لاتے ہیں تو وہ اس کے اندر اپنا عکس دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر ہمارا بھائی بیٹھا ہے اور خوش ہوتے ہیں اور اس کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو آئینہ کی اس خاصیت کی خبر نہیں کہ اس کے اندر باہر کی چیز کا عکس نظر آیا کرتا ہے جس کا وجود واقع میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اور سمجھدار آدمی جو اس آئینہ کی خاصیت کو جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔

تو اے سالکین! تم بچے مت بنو' سمجھ لو کہ اس ریاء کا کچھ وجود نہیں ہے' شیطان باہر سے عکس ڈال کر تم کو ڈراتا ہے اور چاہتا ہے کہ تم کچھ دیر کو اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس سے لڑنے میں اور دفع کرنے میں مشغول ہو جاؤ اور اتنی دیر ذکر سے رہ جاؤ' یہ ایسا ہے جیسے ایک بچہ کے سامنے کوئی ڈراؤنی صورت آئینہ میں دکھائی جائے کہ وہ اس کو دفع کرنے میں اور اس سے لڑنے میں مصروف ہو جاتا ہے کبھی آئینہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے کبھی آئینہ کے پیچھے ہاتھ لے جاتا ہے مگر ہاتھ اس کے کچھ بھی نہیں آتا۔

اضاعت وقت سے بچنے کا طریقہ

اس اضاعت وقت سے بچنے کا طریقہ اگر ہے تو یہی ہے کہ کسی طرح اس کو سمجھا دیا جائے کہ یہ صورت جو آئینہ میں نظر آ رہی ہے اس کا کچھ وجود نہیں اور یہ تجھ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی اگر یہ بات اس کے ذہن میں آ گئی تو اب وہ ہر طرح مطمئن ہو جائے گا۔

اسی طرح یہ ریاء کی ڈراؤنی صورت جو تم کو نظر آتی ہے سمجھ لو کہ اس کا کوئی وجود نہیں اور اس سے ذرا مت ڈرو یہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ ایک خارجی چیز کا عکس ہے جو تمہارے دل میں نظر آیا ہے بس اطمینان سے بیٹھے رہو اور اپنا کام کیے جاؤ لیکن میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اس وقت باوجودیکہ اتنی کچھ شرح کر دی گئی اور اس کی حقیقت بتلا دی گئی مگر جس وقت سالک کو یہ مغالطہ پیش آتا ہے اس وقت اس سے نہ ڈرنا اور مطمئن و مستقل رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

شیخ کامل کی ضرورت

نیز بعض اوقات اس میں کچھ ریاء کا بھی حصہ ہوتا ہے سو اس امتیاز کے لیے بھی اور اگر وہ وسوسہ ہے تو اس میں تسلی کرنے کے لیے بھی دوسرے کی دستگیری کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت کوئی دستگیر موجود ہو تو بڑا کام نکلتا ہے کیونکہ خود اپنی حالت کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھ چکا ہے اور بہت سے گرم و سرد چکھ چکا ہے جو پریشانی تم کو پیش آنی ہے وہ بارہا پیش آ چکی ہے اس کو بھی کسی صاحب بصیرت نے سنبھالا تھا' بار بار تجربہ ہونے سے اس کو پوری بصیرت حاصل ہو گئی ہے تو وہ ہر حالت کو پہچانتا ہے کہ اس میں کتنا حق اور کتنا باطل شامل ہے اور کتنی واقعیت اور کتنا دھوکہ ہے اور اپنے آپ اپنی حالت کو اگر کوئی شخص کسی وقت پہچان بھی لے لیکن اپنی تشخیص پر اطمینان نہیں ہو سکتا پوری پہچان اسی کو ہے جو بارہا تجربہ کر چکا ہے پھر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہوتی ہے اس کا بتایا ہوا علاج سہل اور کامل ہوتا ہے۔ پس مغالطہ کے وقت اپنی تجویز پر اطمینان نہ کرو اپنے مربی اور دستگیر سے مشورہ کرو اور سہل اور بے خطر طریقہ تو یہی ہے تاہم اس وقت کا بیان بھی بیکار نہیں کیونکہ کام کی بات کان میں پڑی رہے تو اچھا ہے اس واسطے اس مغالطہ کو حل

کردیا گیا اور طریقہ علاج کا بتلا دیا گیا اور اس کی پہچان بھی بتلا دی کہ دھوکہ کس صورت میں ہے اور واقعی گناہ کس صورت میں ہوتا ہے اس کا حاصل بعنوان دیگر یہ ہے کہ غور کر کے دیکھو کہ اصل بناء کار کیا ہے اگر عمل شروع اس واسطے کیا گیا ہے کہ مخلوق دیکھے اور ہماری طرف نظریں اٹھیں تو یہ بیشک ریاء ہے اس سے ڈرو اور خدائے تعالیٰ کی غیرت کا خیال کرو دنیا میں کوئی بھی اپنے حق میں غیر کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا تو خدائے تعالیٰ عبادت میں کسی کو شریک کرنا کیسے پسند کریں گے اور اگر اصل بناء کار مخلوق کو دکھانا نہیں ہے بلکہ رضا حق مطلوب ہے اور اس پر بے اختیار مخلوق کا خیال طاری ہو گیا تو اس کو کچھ نہ سمجھو یہ ریاء نہیں ہے یہ ریاء کا وسوسہ اور خیال ہے اس کی کچھ پروا مت کرو اور اپنا کام کیے جاؤ' یہ بحث درمیان میں آ گئی تھی لیکن بہت کارآمد ہے اور یاد رکھنے کی باتیں ہیں اصل شکایت یہ تھی کہ صرف وہی عمل کیوں کیے جاتے ہیں جن پر مخلوق کی نظر پڑتی ہے۔ وہ عمل کیوں نہیں کئے جاتے جن پر مخلوق کی نظر نہیں پڑتی بلکہ صرف خالق کی نظر پڑتی ہے یہ بات کیوں ہے کہ ظاہر کو بنایا جاتا ہے صلحاء کی سی صورت وضع قطع بنائی جاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ظاہر کی درستی بری بات ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات کیوں ہے کہ باطن کو نہیں سنوارا جاتا۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ مخلوق کے دکھلانے کا خیال ہے یہی تو ریاء ہے ظاہر کو بناتے ہو اور دل کو محفوظ نہیں رکھتے (میں خود بھی اسی میں داخل ہوں کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں دوسروں ہی پر اعتراض کر رہا ہوں بلکہ ایک واقعی حالت بیان کی جاتی ہے جو سب میں مشترک ہے پس ہم کو اصلاح کی ضرورت ہے) آخر اس کی کوئی وجہ ہے اس میں غور کرو اور ظاہر کی اصلاح بھی کرو اور باطن کی اصلاح بھی کرو اس طرح سے کہ دل کو اللہ تعالیٰ سے لگاؤ فضول دھندوں میں بے ضرورت نہ لگاؤ' کام کے وقت کام میں لگو اور خالی وقت میں اللہ تعالیٰ کا دھیان لاؤ' جنت کا دھیان لاؤ' یہ تو آسان ہے موت تو یقینی چیز ہے' روزانہ اس کے منظر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں اس کا تصور آنے میں کیا دقت ہے' نیز جنت ایسی مزیدار چیز ہے کہ اس کے تصور سے بھی مزہ آئے گا اس کا تصور بہت آسانی سے آ سکتا ہے خالی وقت میں اسی کو سوچا کرو کہ جنت میں یوں میوے ہیں' یوں پانی ہے' یوں مکان ہیں' یوں حوریں ہیں اور گو

ایک طریق مقصود کا دوزخ کا مراقبہ بھی ہے مگر خیر آپ کو اس سے وحشت ہوتی ہے تو دوزخ کا ذکر نہ سہی، جنت ہی کو سوچو دوزخی کیوں بنو، گو احتمال ہی کے درجہ میں ہو جنتی بنو، گو امید ہی کے درجہ میں ہو یہ بھی مقصود کے لیے مفید و کافی ہو جاوے گا۔

دوزخ پر ایک قصہ یاد آیا ایک امام تھے روڑکی میں، وہ جمعہ کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھا کرتے تھے، گرمی کا موسم دھوپ میں لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی، ایک دن کسی نے نماز کے اقتصار کے لیے کہا تو کہنے لگے اب تم قیامت کے دن جہنم میں کس طرح رہو گے، جب تم سے اتنی سی گرمی کی سہار نہیں ہوتی۔ یہ حضرت لوگوں کو ابھی سے عادت ڈالتے تھے جہنم کی گرمی کی سہار کی گویا ان کے نزدیک سب جہنمی تھے جن کا جہنم میں جانا یقینی تھا اس واسطے ابھی سے گرمی کے برداشت کرنے کی عادت ڈالتے تھے مگر وہ خود بھی دھوپ میں کھڑے ہوتے تو ہم جانتے کیسے سہار ہوتی ہے۔ شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں بھی امام کی ضرورت ہوگی ہر گروہ کا ایک امام ہوگا۔ "يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" فرعون کے بارے میں وارد ہے کہ وہ اپنے گروہ کا امام ہوگا اور سب سے آگے جہنم میں جائے گا۔ اگر یہ مقتدی جہنمی ہوں گے تو یہ امام صاحب وہاں بھی آگے ہوں اور سب کی امامت کریں گے اور آگے آگے دوزخ میں جائیں گے۔ یہ حکایت بطور لطیفہ کے دوزخ کے لفظ پر یاد آ گئی تھی، ذکر یہ تھا کہ جنت کو سوچو دوزخ کو نہ سہی، دوزخ کو ہم کیوں سوچیں، جب ہمارا کام جنت ہی کے نام سے بن جاوے تو دوزخ کا نام کیوں لیں، گو افعال تو ہمارے جہنم ہی کے ہیں جنت کی امید لگانا خیال خام معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جاوے، طبیعتیں ضعیف بہت ہیں دوزخ کے ذکر سے احتمال ہے کہ شاید بددلی پیدا ہو جائے۔

لہٰذا جنت ہی کے ذکر کو بتلایا جاتا ہے اور وہ بھی کافی اس طرح ہوگا کہ جب جنت کے مراقبہ سے اس کا شوق پیدا ہو گیا تو گناہ آپ ہی چھوٹ جائیں گے اور یہی مقصود ہوتا دوزخ کے ذکر سے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کر لے اور اعمال صالحہ کی ہمت کرے۔ جب یہ مقصود جنت کے ذکر سے حاصل ہے تو جہنم کے ذکر پر کیوں زور دیا جائے بلکہ آج کل کی طبیعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تجربہ ہے کہ شوق دلانے والے مضامین سے زیادہ نفع ہوتا ہے بہ نسبت خوف دلانے والے مضامین کے اسی واسطے میں ترہیب کے مضامین زیادہ نہیں بیان کرتا ہوں ترغیب کے مضامین زیادہ بیان کرتا ہوں۔

خلاصہ بیان

غرض خلاصہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سے تعلق زیادہ کرنے کی کوشش کرو دنیا کے ذکر فکر میں بھی رہو مگر اس کو عارضی کام سمجھو اپنا اصلی کام ذکر اللہ کو سمجھو اور اگر تعلق مع اللہ براہ راست پیدا نہیں ہوتا تو اسی طرح سہی کہ جنت کی یاد کیجئے اس کا شوق دل میں بھر جائے گا تو فضول چیزوں سے دل خالی ہو جائے گا۔ جب دل فضولیات سے خالی ہو جائے گا تو اس میں استعداد ہو جائے گی خدا کی یاد بھرنے کی پس شوق جنت بھرنے سے فضولیات سے خلو ہوگا اور اس خلو سے خدا کی یاد بھرے گی جس طرح ایک بوتل میں ہوا ہے اس کو پانی سے بھر دیں تو ہوا سے خالی ہو جائے گی اور پانی سے خالی کر دیں تو ہوا سے بھر جائے گی اسی طرح یہاں ایک ملاء سے دوسرا خلاء اور اس خلاء سے دوسرا ملاء حاصل ہوگا۔ کیسی واضح مثال ہے اس سے بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ جنت کے ذکر سے کیا فائدہ ہے پس ذکر جنت مقصود اصل نہیں بلکہ اس واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ اس سے ذکر اللہ کے حاصل ہونے اور غیر اللہ سے انقطاع ہونے میں سہولت ہو جنت کے ذکر سے حور کے ذکر سے انہار کے ذکر سے دل کو بھرو اس کے بعد وہ دولت جو اصلی مقصود ہے یعنی ذکر خدا بواسطے خلوعن الموانع کے وہ بھی دل میں بھر جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ دیکھ لینا لیجئے میں نے جواہرات کو کوڑیوں کو مول کر دیا اب بھی کوئی ہمت نہ کرے تو اس کی قسمت۔

قلب کا اصل مرض

الحاصل اصل مرض قلب کا ذکر اللہ سے غفلت ہے جس پر ہم لوگوں کی نظر نہیں اسی کی مذمت فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس حدیث میں: "اِنَّ اللّٰهَ لَايَسْتَجِيْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ۔"[1] (اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتے) اور عجیب عنوان سے مذمت فرمائی ہے کہ اس کی برائی کی حد بیان فرما دی کہ ایسی بری چیز ہے غفلت جس سے آدمی کی دعاء بھی قبول نہیں ہوتی حالانکہ دعاء عند اللہ سب سے احب ہے جس کا مقتضا تھا قبول ہونا مگر یہ غفلت ایسی چیز ہے کہ اس میں بھی مانع ہو جاتی ہے اس کے ہوتے ہوئے دعا قبول نہیں

---

[1] (مسند احمد ۲: ۱۷۷، الترغیب والترهیب ۲: ۴۱۹)

ہو سکتی۔ یہ کس قدر برائی ہے چھوٹے سے لفظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بڑی بات بیان فرمادی جو بڑے لفظ میں بھی بیان نہیں ہو سکتی تھی یہ ایسا ہے جیسے کوئی سنکھیا کی برائی ان لفظوں سے بیان کرے کہ سنکھیا آنتوں کو کاٹ دیتا ہے، کہنے کو تو یہ ذرا سے لفظ ہیں ان میں یہ بھی نہیں کہا گیا کہ سنکھیا قاتل ہے اور اس سے انسان مرجاتا ہے صرف ایک ذرا سا اثر اس کا بیان کیا گیا ہے کہ آنتوں میں زخم ڈال دیتا ہے مگر یہ اثر ایسا ہے کہ اس کا انجام قتل ہی ہے۔ گو آنتیں بدن میں عضو رئیس نہیں ہیں اور اس اعتبار سے اس کی یہ برائی کہ آنتوں کو کاٹ دیتا ہے کچھ زیادہ برائی میں داخل نہ ہونا چاہیے تھا بجائے اس کے یہ لفظ زیادہ مؤثر ہوتا کہ سنکھیا اعضائے رئیسہ کو خراب کر دیتا ہے لیکن درحقیقت وہی لفظ زیادہ بلیغ ہے کہ آنتوں کو کاٹ دیتا ہے اس وجہ سے کہ اعضائے رئیسہ کی بقا آنتوں کی بقاء پر موقوف ہے تو ان کو کاٹنے والی چیز اعضائے رئیسہ کو بطریق اولی خراب کر دے گی اسی طرح غفلت کا یہ نقصان بیان کرنا کہ اس سے دعا قبول نہیں ہوتی معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا نقصان ہے جیسا عنقریب اس عنوان کی تفصیل میں آتا ہے۔

دعا کا مفہوم

سو اول دیکھنا چاہیے کہ دعاء کیا چیز ہے قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں ممکن ہیں ایک معنی ہیں مانگنا اس معنی میں دعاء کا لفظ جابجا آیا ہے اور عام و خاص سب جانتے ہیں کہ دعاء کے معنی مانگنا اور سوال کرنا ہیں اور دوسرے معنی ہیں عبادت۔ چنانچہ ''يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (عبادت کرتے ہیں اللہ کے غیر کی) کے ساتھ کرتے ہیں اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ.

(حکم دیا ہے تمہارے رب نے کہ مجھ کو پکاروں میں تمہارے پکارنے کو قبول کروں گا جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہو کر جائیں گے)

اس آیت میں دعاء کا امر فرمایا اور اس پر ایک وعدہ فرمایا پھر عبادت کے ترک پر ایک

وعید بیان فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اگر دعا عبادت دونوں ایک معنی میں نہ ہوں تو کلام غیر مربوط ہوتا ہے پس یہ قرینہ ہوا اس بات کا کہ دعاء اور عبادت سے ایک مراد ہے خواہ ادعونی کے معنی اعبدونی ہوں خواہ عبادتی بمعنی دعائی ہو اور گو اس میں دونوں احتمال ہیں کہ دعاء بمعنی عبادت ہو یا عبادت بمعنی دعاء ہو مجھ کو حق حاصل ہے ایک معنی لے لینے کا خصوصاً جب دوسری اکثر جگہوں میں وہی معنی متعین ہیں۔ "یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں) میں یقیناً اور تعیناً دعاء عبادت ہی کے معنی میں ہے تو اس احتمال سے تائید ہوتی ہے اس بات کی کہ ادعونی بمعنی اعبدونی راجح ہے اس بنا پر اس حدیث "اِنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ۔"[1] (اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں کرتے) میں بھی دعاء بمعنی عبادت ہوگی۔

دعا عبادت کا مغز ہے

اور اس مضمون کی مزید تائید بلکہ قریب قریب فیصلہ اس حدیث سے ہوتا ہے: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ"[2] اس میں دعاء کی ایک خاص فضیلت بیان فرمائی گئی ہے کہ دعاء مغز ہے عبادت کا یہ حدیث صریح ہے اس میں کہ دعاء افضل افرادِ عبادت ہے تو اگر دعاء عبادت نہ ہو تو اس حدیث کے کوئی معنی نہ ہوں گے تو ہر دعاء پر عبادت کا صادق آنا ضرور ہے تو حدیث زیرِ بیان میں بھی دعاء پر عبادت صادق آوے گی تو اس صورت میں "لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ۔" (غافل دل سے دعا قبول نہیں کرتے) کے یہ معنی ہوں گے "لایقبل العبادۃ عن قلب لاہ" (غافل دل سے عبادت قبول نہیں کرتے) یعنی حق تعالیٰ عبادت کو خواہ مطلق درجہ میں یا فردِ خاص کے درجہ میں قلبِ غافل سے قبول نہیں فرماتے۔

بہرحال ان الفاظ میں دلالت ہے اس بات پر کہ عبادت قلبِ غافل سے قبول نہیں ہوتی اب دیکھئے کہ یہ کتنی بڑی مذمت ہوئی غفلت کی کہ غفلت کی وجہ سے انسان کی عبادت مطلقہ یا خاصہ قبول نہیں ہوتی حالانکہ انسان پیدا کیا گیا ہے عبادت ہی کے واسطے اصلی غایت

---

[1] (مسند احمد ۲: ۱۷۷، الترغیب والترهیب ۲: ۴۱۹)
[2] (سنن الترمذی: ۳۳۷۱، کنز العمال: ۳۱۱۴)

خلق انسان سے عبادت ہی ہے جب وہی قبول نہیں تو انسان محض بیکار ہوا۔ گویا انسان انسان ہی نہ رہا اس سے زیادہ کیا برائی ہو سکتی ہے۔

غفلت کی مذمت

دیکھ لیا آپ نے کہ غفلت کس قدر بری چیز ہے اور اس چھوٹے سے اور معمولی عنوان "اِنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ."[1] (بے شک اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں کرتے) میں کتنا بڑا مضمون ادا ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان پیدا ہوا ہے عبادت کے لیے اور غفلت مانع ہے اس کی صحت سے تو غفلت وہ چیز ہوئی جس سے انسان انسانیت سے نکل جاتا ہے۔

اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس وقت کی تمام تر تقریر مذمت غفلت کا حاصل یہ ہے کہ کسی وقت بھی غفلت نہیں چاہیے حالانکہ ابھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ غفلت قبول عبادت کے لیے مانع ہے یعنی قبول عبادت کے لیے عدم غفلت شرط ہے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جس وقت عبادت کی جائے اس وقت غفلت نہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ہر وقت عبادت نہیں کی جاتی تو ہر وقت غفلت کا نہ ہونا بھی ضروری نہ ہوا تو یہ حکم کہاں صحیح ہوا کہ کسی وقت غفلت نہیں چاہیے عدم غفلت کا شرط ہونا قبول عبادت کے لیے ایسا ہوا جیسا وضو کا ہونا شرط ہے صحت نماز کے لیے اور سب جانتے ہیں کہ وضو کا ہونا نماز کے وقت ضروری ہے دوسرے وقت ضروری نہیں یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہر وقت باوضو رہنا ضروری ہے اسی طرح یوں کہنا لازم ہوگا کہ غفلت کا نہ ہونا عبادت کے وقت تو ضروری ہے کیونکہ یہ عبادت کے قبول کا موقوف علیہ ہے اور دوسرے وقت ضروری نہیں جیسے وضو کا ہر وقت رہنا ضروری نہیں جواباً عرض کرتا ہوں کہ حقیقت میں اس عنوان کا مقتضا تو یہی ہے یعنی جب یہ کہا گیا کہ عبادت قبول ہونا موقوف ہے غفلت کے نہ ہونے پر تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ عبادت ہی کے وقت اس کی ضرورت ہے دوسرے وقت ضرورت نہیں۔

---

[1] (مسند احمد ۲: ۱۷۷، الترغیب والترهیب ۲: ۳۱۹)

دل کوخیالات سے خالی کرنا آسان کام نہیں

لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کے وقت یاداور ذکر جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ دوسرے وقت بھی غفلت نہ ہو' یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ آدمی کا دل تمام اوقات میں تو خیالات سے بھرا ہو اور جب نماز پڑھنے کھڑا ہوتو ان خیالات سے ایک دم دل کو خالی کرلے دل کو خیالات سے خالی کرنا آسان کام نہیں اس کے لیے بڑی مشق کی ضرورت ہے اور کچھ دیر پہلے سے تہیہ کرنا چاہیے اس پر بھی اگر کچھ کامیابی ہوجائے تو بڑی بات ہے تو اس کو وضو پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ قیاس مع الفارق ہے وہ فارق یہ ہے کہ وضو کے لیے دیر سے تہیہ کرنے کی ضرورت نہیں جس وقت نماز کا ارادہ ہوا دو منٹ پہلے ارادہ کر کے وضو کرلیا' بخلاف ذکر اور یاد قلبی کے کہ اس میں یہ نہیں ہوسکتا کہ جب عبادت کا وقت آیا اس کو حاصل کرلیا' ذکر قلبی صرف اس بات میں تو وضو کے مشابہ ہے کہ موقوف علیہ ہے قبول عبادت کے لیے لیکن اس بات میں مشابہ نہیں کہ جیسے وضو سہل کام ہے کہ عین وقت پر حاصل ہوجاتا ہے ایسے ہی یہ بھی سہل ہو اور عین وقت پر حاصل کرلیا جائے تو وضو پر اس کو قیاس کر کے یہ حکم اس پر جاری نہیں کرسکتے کہ جیسے وضو صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور دوسرے وقت ضروری نہیں ایسے ہی فراغ قلب اور ذکر صرف عبادت کے وقت ضروری ہو اور دوسرے وقت تو ضروری نہ ہو یہ ذکر قلبی ایسی چیز ہے کہ جب دیگر اوقات میں بھی اس کی کوشش کی جائے تب ممکن ہے کہ کچھ عبادت کے وقت میں بھی حاصل ہوجائے۔

اس تقریر سے دونوں کا فرق سمجھ میں آ گیا ہوگا اور راز اس کا یہ ہے کہ وضو امر حسی ہے اور جوارح کا کام ہے جب چاہا کرلیا اس پر پورا اختیار ہے۔ علیٰ ہذا وضو کا ٹوٹنا بھی اختیاری ہے گو اس درجہ کا اختیار نہیں جس درجہ کا وضو کا کرلینا ہے مگر ہے تو اختیاری ہی چونکہ وضو وجوداً وعدماً اختیاری ہے اس واسطے کہہ سکتے ہیں کہ تمام وقت میں باوضو رہنا ضروری نہیں کیونکہ وضو کی ضرورت عبادت کے لیے ہے اور اس پر اس درجہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں کرسکتے ہیں تو عبادت کے سوا دوسرے وقت میں اس کی کیا ضرورت ہے اور ذکر امر قلبی ہے اور یہ تجربہ ہے کہ امر قلبی پر اتنا اختیار نہیں ہوتا جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر قلبی اختیار

سے خارج ہے کیونکہ اگر اختیار سے خارج کہا جائے تو اس کا امر کرنا تکلیف مالا یطاق کو مستلزم ہوگا۔ قلب پر بھی اختیار ہے اور اسی بناء پر امور قلبیہ کی تکلیف دی گئی ہے لیکن وہ اختیار کا لاضطرار ہے اس پر اتنا قابو نہیں ہوتا جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے تو فعل جوارح میں اور فعل قلبی میں فرق ہونا چاہیے اس واسطے کہا جاتا ہے کہ وضو ہر وقت کرنا ضروری نہیں صرف عبادت کے وقت کر لینا کافی ہے اور ذکر جو مقابل ہے غفلت کا اس کا ہر وقت کرنا ضروری ہے اس بھروسہ میں نہیں رہنا چاہیے کہ عبادت کے وقت کرلیں گے اب یہ ایسا ہو گیا جیسے اس شخص کی حالت ہے جس کا وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں ہوتا' بعضے ایسے وہمی ہوتے ہیں کہ وضو میں ان کو بہت بہت دیر لگتی ہے ایسے آدمی کو کہا جائے گا کہ اس کو نماز سے دو گھنٹے پہلے تیار ہونا ضروری ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی حکم شرعی ہے کہ نماز سے دو گھنٹے پہلے وضو کرنا چاہیے حکم شرعی تو یہی ہے کہ نماز بلا وضو نہیں ہو سکتی' تکبیر تحریمہ سے پہلے وضو ہونا ضروری ہے باقی اس شخص کو جو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ دو گھنٹے پہلے سے تیاری کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے وضو وقت پر یعنی تکبیر تحریمہ سے پہلے موجود کر لینا مثل غیر اختیاری کے ہے گو واقع میں اختیاری ہے ایسے ہی اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ ذکر اور عدم غفلت صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور غیر اوقات میں ضروری نہیں لیکن ہماری حالت اسی شخص کی سی ہے جو وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں کر سکتا کیونکہ ہم عبادت کے وقت ایک دم دل کو فارغ نہیں کر سکتے اس واسطے ضرورت ہے کہ پہلے سے تیاری کریں اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ اس بھروسے نہ رہو کہ عبادت کے وقت دل کو فارغ کر لیں گے اور غفلت کو دور کر دیں گے بلکہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں بھی دل کو فارغ رکھو اور غفلت سے بچاؤ جب ایسا کرو گے تب کہیں عبادت کے وقت ذکر اور یاد ہو سکے گی اور غفلت نہ ہوگی یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے سے تیار نہ ہو اور عین وقت عبادت پر تیار ہو جاؤ اور سب خیالات کو دل سے مٹا دو ان وہمیوں کے وضو کی مثال سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں غفلت ترک کرنے اور ذکر حاصل کرنے کے لیے کیوں کہا جاتا ہے اس میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ وہمی کے وضو کی قبلیت کے لیے تو ایک حد ہے مثلاً دو گھنٹے کہ کیسا ہی وہمی ہو اتنے وقت میں وضو کر ہی لے گا لیکن ذکر کی قبلیت کے لیے کوئی حد نہیں کہ مثلاً یوں کہا جائے کہ نماز سے گھنٹہ بھر پہلے یا دو گھنٹے پہلے غفلت کو چھوڑ کر ذکر میں لگو تاکہ نماز میں ذکر

اور فراغ قلب حاصل ہو اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا اور بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر وقت قلب کو غیر اللہ سے اور فضول باتوں سے خالی رکھو جب ہر وقت اس کی کوشش کرتے رہو گے تب نماز کے وقت اس میں کامیابی ہوگی۔

ہر وقت ذکر اللہ کی ضرورت

نتیجہ یہی نکلا کہ ہر وقت ضرورت ہوئی ذکر کی اور توجہ الی اللہ کی کوئی وقت ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں ذکر نہ ہو اور غفلت ہو آپ کہیں گے اچھے پھنسے کسی وقت بھی فرصت نہیں ذکر کی ضرورت تو تھی عبادت کے وقت مگر سارا وقت اسی میں آ گیا یہ خیال آپ کا صحیح ہے ذکر اللہ کی حقیقت ہے تعلق مع اللہ اور تعلق مع اللہ واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ اس سے کسی وقت فراغ نہیں ہو سکتا۔

بحرے است بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
اینجا جز آنکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(بحر عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں اس جگہ سوائے اپنی جان سونپنے کے کوئی دوسرا چارہ نہیں)

یہ تو جنم روگ ہے اس سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا اور نہ پیچھا چھوٹنا چاہیے ہم جو اس سے گھبراتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ (نعوذ باللہ) کوئی گھبرانے کی چیز ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو حس نہیں ہے، ہماری حس الٹی ہوگئی ہے کہ جو چیز گھبرانے کی ہے اس سے تو گھبراتے نہیں اور جو چیز گھبرانے کی نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں سے بڑھ کر راحت کی چیز اور لذیذ ہے اور ہر چیز کی جان اور روح ہے اس سے گھبراتے ہیں۔ صاحبو! یہ تعلق مع اللہ تو واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے خالی نہ ہونا چاہیے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نہ باشی شاید کہ نگاہ کند آگاہ نہ باشی

(پلک جھپکنے کے برابر بھی شہنشاہ سے غافل مت ہو ممکن ہے کہ اس کی نگاہ لطف تجھ پر پڑتی ہو اور تجھ کو خبر نہ ہو)

جن لوگوں کو یہ حس پیدا ہوگئی ان کے حالات پڑھئے کہ بات کرنے سے بھی وہ گھبراتے تھے اور ملنے جلنے سے بھی وہ گھبراتے تھے، دیکھنے والا ان کو وحشی سمجھتا لیکن وہ ایسے

وحشی تھے کہ تمام دنیا کے عاقل ان کے سامنے سر جھکاتے تھے' یہ وحشت ان کی اس واسطے تھی کہ ان کی حس صحیح ہو گئی تھی' گھبرانے کی چیز سے گھبراتے تھے اور انس کی چیز سے انس کرتے تھے' انس کی چیز کیا ہے اللہ اور ذکر اللہ سے انس رکھتے تھے اور گھبرانے کی چیز کیا ہے ماسوی اللہ اور ماسوی اللہ کا ذکر اس سے ان کو وحشت اور نفرت ہوتی تھی سو حضرت یہ جنم روگ بے شک آپ کے پیچھے لگ گیا مگر اس سے گھبرائیے نہیں بلکہ حس کو صحیح کر لیجئے پھر معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس قدر راحت کی چیز ہے پھر اس وقت اگر کوئی آپ سے اس کو چھڑائے گا تو آپ جان دینا پسند کریں گے مگر اس کو چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔

وضو اور ذکر باہم مشابہت

غرض ذکر اللہ سے گھبرائیے نہیں بلکہ اس کو حاصل کیجئے ہر وقت نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ عبادت کے وقت حاصل ہو لیکن جب عبادت کے وقت اس کا قصد کرو گے تب معلوم ہو گا کہ اس کا عبادت کے وقت حاصل ہونا بھی بلا اس سے مشکل ہے کہ دوسرے اوقات میں بھی اس کا شغل رکھا جائے۔

اور اس کو وضو پر قیاس نہ کرنے کی ایک اور وجہ سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ وضو میں وضو کے مزاحم غالب نہیں ہوتے یعنی یہ نہیں ہوتا کہ جب ہم وضو کرنے بیٹھیں تو کوئی ہم کو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے بلکہ جب تک خود ہم ہی قطع وضو کا قصد نہ کریں وہ قطع نہیں ہو سکتا بخلاف ذکر کے کہ اس میں بدون ہمارے قصد کے بھی مزاحم غالب ہونے لگتے ہیں جن میں ہمارے قصد کو کچھ دخل نہیں ہوتا ہم تو چاہتے ہیں کہ ذکر قطع نہ ہو مگر قطع ہو جاتا ہے پھر شروع کرتے ہیں پھر قطع ہو جاتا ہے' وضو میں ایسا کہاں ہوتا ہے کہ وضو کرنا شروع کریں اور بیچ میں رہ جائے پھر شروع کریں' پھر بیچ میں رہ جائے' غرض موقوف علیہ ہونے میں تو وضو اور ذکر باہم مشابہ ہیں کہ بلا وضو نماز نہیں ہو سکتی اور بلا ذکر عبادت قبول نہیں ہوتی لیکن ان دو وجہ میں باہم تخالف ہے کہ وضو اختیاری کامل ہے اور ذکر گو غیر اختیاری اور وضو کرنے میں مزاحم نہیں پیش آتے اور ذکر میں مزاحم پیش آتے ہیں اس واسطے یہ اجازت نہیں دی جاوے گی کہ جیسے وضو کا عبادت کے متصل ہو جانا کافی ہے ایسے ہی ذکر کا عبادت کے متصل موجود ہو جانا کافی ہو بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ذکر کی ضرورت ہر وقت ہے تاکہ غفلت کی عادت چھوٹے اور عبادت کے وقت ذکر حاصل ہو۔

ضرورت مشق ذکر

غرض ذاکر بننے کے لیے مشق کی ضرورت ہے ورنہ بدون مشق کے صرف یہی نہ ہوگا کہ دوسرے وقتوں میں غفلت ہو بلکہ یہ ہوگا کہ عبادت میں بھی غفلت ہوگی اور ذکر حاصل نہ ہوگا چنانچہ ہم لوگوں کی یقینی حالت یہ ہے کہ اول تو ذکر کی طرف توجہ نہیں اور اگر توجہ ہوتی ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ہم تیار ہوئے ذکر کے لیے اور دل کو متوجہ کیا مگر ذکر دل سے نکل گیا پھر متوجہ کیا پھر نکل گیا' ذکر کیا کرتے ہیں ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں' فرمائیے جب یہ حالت ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم کو عبادت کے وقت ذکر حاصل کر لینے اور غفلت کو دور کر دینے کی کامل قدرت ہے اور ہم کو ذکر کی مشق کی ضرورت نہیں ہے یہ مانا کہ ذکر جو بلا اختیار دل سے نکل جاتا ہے یہ عبادت میں مخل نہیں ورنہ آپ کہیں گے کہ غیر اختیاری چیز کی تکلیف دی جاتی ہے جس کو تکلیف مالا یطاق کہا گیا ہے جو شریعت میں وارد نہیں ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ذکر کا دل سے نکل جانا اس وقت تو بلا اختیار ہے لیکن یہ شروع تو ہوتا ہے اختیار ہی سے یعنی ہم لوگوں نے عادت ڈال لی ہے دل کو ہر وقت فضول خیالات سے پر رکھنے کی یہ عادت ایسی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے کہ اب اس کے چھوڑنے پر قریب قریب قدرت نہیں معلوم ہوتی تو یہ ذکر کا نکل جانا اس وقت بلا اختیار معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا شروع تو اختیار ہی سے ہوتا ہے پھر غالب آ کر غیر اختیاری ہو جاتا ہے پس اس اختیار سے ابتداء کرنے پر نکیر کی جاتی ہے کہ اس عادت کو بدلئے اور بدلنا اختیار سے ممکن ہے جیسا کہ یہ عادت ڈالنا اختیار سے ہوا ہے اس کا ازالہ بھی اختیار سے ہوسکتا ہے اس واسطے اس کی تکلیف دی جاتی ہے۔

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ تکلیف مالا یطاق نہیں ہے یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے قصد سے اور پروا نہ کرنے سے ہوا اور ایک بات قابل غور ہے کہ وضو میں اول تو مزاحم پیش نہیں آتا اور اگر کوئی مزاحمت کرے مثلاً ہاتھ پکڑ لیے اور وضو نہ کرنے دے تو ہم کو اس مزاحم کا موجود ہونا فوراً معلوم ہو جائے گا کیونکہ وہ محسوس چیز ہے ہم اس کو فوراً دفع کریں گے اور یہاں ذکر میں مزاحم بار بار پیش آتا ہے اور ہم کو فوراً معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ محسوس چیز نہیں ہے تھوڑی دیر تک جب وہ اپنا اثر کر لیتا ہے تب ہم کو معلوم ہوتا ہے پھر ہم اس کو دفع کرتے

ہیں پھر وہ اسی طرح اثر کرتا ہے کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی پھر ہم کو خبر ہونے کے بعد اس کو دفع کرتے ہیں' غرض اس مزاحم کا اثر ہم پر ہو ہی جاتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے غفلت ہو جاتی ہے اور وضو میں یہ بات نہ تھی جیسے ہی مزاحم پیش آیا ہم نے دفع کر دیا اور وضو کر لیا تو وضو اور ذکر میں یہ بھی فرق ہو گیا کہ وضو میں بوجہ اطلاع ہو جانے کے مزاحم غالب نہیں آتے اور ذکر میں بوجہ اطلاع نہ ہونے کے غالب آ جاتے ہیں۔

غرض ایک وہ فرق تھا کہ وضو فعل جوارح سے ہے اور ذکر فعل قلب فعل جوارح پر زیادہ اختیار ہوتا ہے بہ نسبت فعل قلب کے تو وضو پر تو پورا اختیار ہے اور ذکر پر اتنا اختیار نہیں تو ذکر پر اختیار حاصل کرنے کے لیے اہتمام اور پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہے بہ نسبت وضو کے اور ایک یہ فرق ہوا کہ وضو میں مزاحم غالب نہیں آتے اور ذکر میں غالب آتے ہیں یہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ ذکر کے لیے زیادہ اہتمام اور پہلے سے تیاری کی جائے جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کے حکم میں بھی فرق ہو گا اب جواب ہو گیا اس بات کا کہ جب ذکر عبادت کی قبولیت کا موقوف علیہ ہے تو عبادت ہی کے وقت اس کا وجود کافی ہے ہر وقت اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ یہ مانا کہ ذکر شرط فی العبادۃ ہے لیکن اس کی ضرورت ہر وقت ہے کیونکہ اس کا عبادت میں حاصل ہونا خود موقوف ہے دوام پر۔ ۱

ضرورت ہر وقت ذکر کی

دوسری ایک بات اور ہے اور وہ اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ کہ مانا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت ہے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا عبادت کے لیے بھی کوئی وقت ہے تم نے عبادت کے معنی نماز پڑھنے ہی کے کیوں لے لیے' عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی بندہ ہونا تو کیا اس کے لیے بھی کوئی وقت مقرر ہو سکتا ہے اگر اس کے لیے کوئی وقت ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ دوسرے وقت انسان عبد نہیں ہے اس وقت کیا ہو گا عبد تو ہے نہیں الہ ہو گا کیونکہ عبد کا مقابل تو الہ ہی ہے جب عبد نہیں تو پھر الہ ہو گا۔

صاحب اگر آپ عبادت سے کسی وقت نکلنا چاہتے ہیں تو الہ ہونے کا حوصلہ کیجئے کیا آپ اس کے لیے بھی تیار ہیں جیسے ایک گنوار کا قصہ ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو میاں جی کے

پاس لے گیا اور کہنے لگا' میاں جی اسے قرآن پڑھا دو اور زیادہ نہ پڑھائیو کہیں لوٹ پوٹ پگمبر (پیغمبر) ہو جاوے۔ ایک اور قصہ ہے کہ ایک کم ذات آدمی کسی جگہ جا کر پٹھان بن گیا' اس کے بعد کوئی پٹھان پہنچا اس نے اپنے کو سید بتایا پھر کوئی سید پہنچا اس نے اپنے کو خدا کا بیٹا بتایا' کسی نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہنے لگا جب ایک کم ذات پٹھان بن گیا اور پٹھان سید تو سید سوائے اس کے کہ خدا کا بیٹا بن جاوے اور کیا کرے۔

تو حضرت جب آپ بندہ بننے سے نکلے تو پھر خدا ہی کا درجہ ہے اگر انسان بندہ بننے کے لیے نہیں ہے تو کیا خدا بننے کے لیے ہے پس عبادت سے کسی وقت مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

انسان بندہ بننے کیلئے ہے

اس خدا بننے پر ایک واقعہ یاد آیا میں نے استاد رحمۃ اللہ علیہ سے مؤکل تابع کرنے کا عمل پوچھا تو فرمایا کیا کرو گے' میں نے عرض کیا جی چاہتا ہے کہ مؤکل تابع ہو جائیں جس کام کو جی چاہا ان کے ذریعے سے فوراً ہو گیا' فرمایا عمل تو اس قسم کے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ انسان بندہ بننے کے لیے ہے یا خدا بننے کے لیے میاں خود تابع بن جاؤ خدا کے بس یہی دولت ہے حکومت کر کے کیا کرو گے۔

عبودیت عجیب چیز ہے

واقعی عبودیت عجب چیز ہے دوسروں کو تابع بنانا بھی فضول ہے اور اگر کسی درجہ میں اس کی ضرورت بھی ہے تو اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ آدمی خدا کا بندہ بن جائے' غالباً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کے وقت میں محدث محمد غوث بڑے عامل تھے' گوالیار میں انہوں نے ایک بار شیخ کی اشتیاق زیارت میں مؤکلوں کو حکم دیا کہ حضرت شیخ کو یہاں اٹھا لاؤ' مؤکل شیخ کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت نماز میں ہیں ان کی ہمت نہ پڑی کہ کچھ تصرف کر سکیں' باادب ایک طرف کھڑے ہو گئے' سچ ہے۔

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور تقویٰ اختیار کیا تو اس سے جن اور انسان اور ہر چیز ڈرتی ہے)

جب حضرت فارغ ہوئے تو ان پر نظر پڑی، پوچھا کیا ہے، عرض کیا ہم اس واسطے بھیجے گئے ہیں، فرمایا: ہاں اچھا ہم حکم دیتے ہیں کہ ان کو ہی پکڑ لاؤ چنانچہ وہ لوٹ کر گئے اور ان کو پکڑنے لگے، انہوں نے پوچھا یہ کیا کرتے ہو تم تو میرے تابع ہو، وہ بولے بے شک مگر اوروں کے مقابلہ میں نہ کہ شیخ کے مقابلہ میں چنانچہ لا حاضر کیا۔

خدا کا نام وہ چیز ہے کہ ہر چیز کو مسخر کر لیتا ہے، مؤکل تابع تھے کس کے اور کام دے رہے ہیں کس کو، حضرت شیخ نے عامل صاحب سے پوچھا یہ کیا حرکت تھی، عرض کیا حضرت کی زیارت کو دل چاہتا تھا، فرمایا: زیارت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ نوکروں سے پکڑ کر بلواؤ، پھر فرمایا کہ تم کس خرافات میں مبتلا ہو، بندگان خدا کو مجبور کر کے اپنا محکوم کیوں بنا رکھا ہے ان کی آنکھیں کھلیں اور حضرت سے بیعت ہوئے اور عملیات سے توبہ کی۔

ہر وقت عبادت کی ضرورت

یہ حکایتیں خدا بننے کے لفظ پر یاد آ گئی تھیں۔ ذکر یہ تھا کہ انسان بندہ ہے کسی وقت خدا نہیں بن سکتا، ہر وقت بندہ ہی ہے پیدا اسی واسطے ہوا ہے کہ بندہ بنے اور بندہ بننے ہی کا ترجمہ ہے، عبادت تو اس کے کیا معنی ہوں گے کہ عبادت کے لیے بھی کوئی خاص وقت ہے اس کے تو وہی معنی ہو جائیں گے کہ ایک وقت بندہ بننے کا ہے ایک وقت خدا بننے کا۔

غرض انسان ہر وقت بندہ ہے اور ہر وقت اس کو عبادت کی ضرورت ہے اور حدیث کا مضمون آپ نے سن لیا کہ عبادت غافل قلب سے مقبول نہیں ہوتی تو ثابت ہو گیا کہ ہر وقت ہی ذکر کی ضرورت ہے اس طرح ثابت ہو گیا کہ غفلت کسی وقت جائز نہیں۔

پہلی تقریر کا حاصل تو یہ تھا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت سہی لیکن ذکر خود عبادت کے وقت بھی بدون اس کے نہیں ہوتا کہ دوسرے اوقات میں بھی اس کا اہتمام و استحضار رہے اس واسطے ضرورت ہوئی اس پر مداومت کرنے کی۔

عبادت اور ذکر دائمی مطلوب ہیں

اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ مانا ذکر صرف عبادت ہی کے وقت ضروری سہی مگر عبادت خود دائمی چیز ہے تو ذکر بھی دائمی مطلوب ہوا، دونوں تقریروں میں امر مشترک یہ ہے

کہ غفلت کسی وقت جائز نہیں اور خیال تو کیجئے کہ آیا خدا کے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم کو یاد رکھیں یا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم خدا کو یاد رکھیں۔ وہ خدا اور غیر محتاج اور ہم بندے اور ہر وقت محتاج۔ ظاہر ہے کہ ان کو یاد رکھنا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے وہ اگر ہم کو کبھی بھی یاد نہ کریں تو ان سے کون پوچھنے والا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تو تم کو کسی وقت بھی نہیں بھولتے۔ اگر وہ ایک آن کے لیے بھی بھول جائیں یعنی رحمت کے ساتھ توجہ نہ فرمادیں تو عالم درہم برہم ہو جائے پھر کیا اس کا یہی صلہ ہے کہ تم ان کو ہر وقت بھولے ہی رہتے ہو' کتنی سخت بات ہے' ذرا تو انصاف کرنا چاہیے کیا اس کا کوئی جواب ہو سکتا ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ تمام وعظ کا یہ ہوا کہ ہمارے اندر بڑا مرض غفلت کا ہے اور غفلت بھی کونسی محض فضول ادھیڑ بن کی بدولت ان بے بنیاد باتوں میں دل لگائے رکھتے ہیں جن کا سر نہ پیر کہیں گزشتہ باتوں کو یاد کر رہے ہیں کہیں آئندہ کی وہ تجویزیں سوچ رہے ہیں جو واقع میں بھی نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام وقت ضائع جارہا ہے حتیٰ کہ عبادت کے وقت بھی ان خیالات سے دل خالی نہیں ہوتا اور ایسی عبادت موافق حدیث مذکور کے قبول نہیں ہوئی اس لیے یہ عبادت کا وقت بھی ضائع ہو گیا۔ اسی طرح ساری عمر ختم ہو جاتی اور بیکار ضائع جاتی ہے اور سب سے غفلت ہوتی تو خیر غضب تو یہ ہے کہ سب سے تو غفلت نہیں بس غفلت ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہے اور تو سب کی یاد ہے اگر یاد نہیں ہے تو بس اللہ کی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں نہیں رکھ سکتے تو اور ساری دنیا کو بھی بھلا دیا ہوتا تا کہ کہہ سکتے کہ ہم تو کسی کی یاد بھی نہیں رکھتے نہ ان کی نہ ان کی جیسے ایک ولایتی کا قصہ ہے کہ ہندوستان میں آیا اور ایک حلوائی کی دکان پر سے حلوہ اٹھا کر بھاگا' لوگ اس کے پیچھے دوڑے تو جھٹ منہ میں رکھ کر فرماتے ہیں' جاؤ نہ ہمارا رہا نہ تمہارا تو یہ بھی ہوتا تو غنیمت تھا کہ نہ ہمارا خیال ہوتا نہ تمہارا نہ اللہ کی یاد ہوتی نہ کسی اور کی۔ یہاں تو غضب یہ ہے کہ اللہ ہی کو بھلا رکھا ہے قلب سے اور دوسرے سارے جہان کو اس میں آباد کر رکھا ہے۔

صاحبو! ان سب کو چھوڑ و اور اللہ کی یاد دل میں بساؤ، اگر اس کی یاد براہ راست نہیں بستی ہے تو بجائے اس کے کہ فضولیات کی ادھیڑ بن میں رہو جنت ہی کا تصور کیا کرو اور بیوی کا اور حور کا قصور اور کبھی اپنے قصور کا بھی اس سے اعانت ہوگی۔ ذکر اللہ کے حصول میں اور غفلت کے دور ہونے میں بحمد اللہ اس وقت میں نے غفلت دور کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ وغیرہ سب بتا دیا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعاء کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمارے قلوب کو غفلت سے نجات دیں اور اپنی یاد اور محبت سے پر کردیں تاکہ سب امراض دفع ہو جاویں۔

خلاصہ

یہ کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غفلت کی مذمت بیان فرمائی ہے پس اس میں باطن کی اصلاح ہے انتہی بلفظ حضرت مولانا مدظلہ العالی)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا و مولانا محمدٍ وعلیٰ اله واصحابه اجمعین، واخردعونا ان الحمدللّٰہ رب العالمین، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.

التوجہ

توجہ الی اللہ کے متعلق جامع مسجد تھانہ بھون میں ۹ جمادی الاخری ۱۳۳۱ہجری دو گھنٹہ پانچ منٹ بیٹھ کر ارشاد فرمایا جسے مولانا محمد عبداللہ صاحب نے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۲۰۰ تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینه و نستغفرہ ونومن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل له ومن یضللّٰہ فلاھادی له و نشھد ان لا اله الا اللّٰہ وحدہ لاشریک له ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسوله صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه و بارک وسلم.

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوْا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْھَا وَاَنَابُوْا اِلَی اللّٰہِ لَھُمُ الْبُشْرٰی فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَاھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (الزمر: ۱۷،۱۸)

ترجمہ: (اور جولوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (مراد غیر اللہ کی عبادت ہے) اور (ہمہ تن) اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ مستحق خوشخبری سنانے کے ہیں، سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام الٰہی کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں، یہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں)

آج میرا ارادہ بیان کا نہ تھا اس لیے کہ طبیعت کسلمند و مضمحل تھی لیکن بعض عزیز مہمانوں کی درخواست ہوئی اس لیے جی نہ چاہا کہ ان کی درخواست کو رد کیا جائے اس لیے کہ باہر کے لوگوں کو گاہ گاہ ایسا اتفاق ہوتا ہے اس لیے مختصر سا بیان ہوتا ہے۔

انابت الی اللہ کا وجوب

اس سے قبل جمعہ میں میں نے یہ بیان کیا تھا کہ ہم لوگوں کو حوادث و واقعات زمانہ سے متنبہ ہونا چاہیے اور غفلت کو دور کرنا چاہیے، درمیان میں ایک مضمون ضروری اور ذہن میں آیا تھا اور خیال یہ تھا کہ اس کے بعد جب بیان کا موقع ہوگا تو اس مضمون کو بیان کیا جاوے گا لیکن وہ مضمون ذہن سے نکل گیا، ہر چند سوچا لیکن مطلق یاد نہ آیا، صرف اس کے متعلق اس قدر یاد رہ

گیا کہ میں نے اس مضمون کا لقب توجہ تجویز کیا تھا جیسا کہ گزشتہ جمعہ کے مضمون کو تنبہ سے ملقب کیا تھا اس لقب توجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا مضمون تھا جس کا یہ لقب ہو سکتا ہے اور وہ مضمون انابت الی اللہ ہے اسی واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے انابت کا وجوب اور اس پر ثمرہ بیان فرمایا ہے اور یہ مضمون گزشتہ مضمون تنبہ کے بھی مناسب ہے اس لیے کہ تنبہ کے بعد دوام پھر توجہ کی ضرورت ہے حاصل دونوں بیانوں کا یہ ہوگا کہ ہم کو دو چیزوں کی ضرورت ہے اول تنبہ کی پھر توجہ کی اور ہر چند کہ تنبہ اور توجہ کا حاصل ایک ہے اس لیے کہ تنبہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ حوادث و واقعات سے آدمی کی غفلت دور ہو کر آخرت کی طرف توجہ ہو اور توجہ بھی یہی ہے لیکن یہاں مراد تنبہ سے حدوث توجہ اور توجہ سے بقاء اور دوام اس توجہ کا مراد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر شے کے اندر دو مرتبہ ہیں ایک حدوث کا دوسرا بقاء کا۔ مثلاً نماز پڑھنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جنہوں نے پہلے کبھی نماز نہیں پڑھی اور اس وقت پڑھنا شروع کیا ہے۔ یہ مرتبہ حدوث صلوٰۃ کا ہے اور ایک وہ ہیں جو ہمیشہ سے پڑھتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے' ان کو دوام و بقاء صلوٰۃ کا مرتبہ حاصل ہے۔ اسی طرح توجہ الی اللہ کی بھی دو قسم ہیں ایک حدوث توجہ دوسرے اس کا دوام حدوث توجہ تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ کوئی واقعہ اور حادثہ ہو۔ چنانچہ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہر وقت کھڑے بیٹھے لیٹے اللہ کو یاد کرتا ہے اور جب وہ مصیبت جاتی رہتی ہے پھر بھول جاتا ہے۔ پس یہ مصیبت کے وقت توجہ جو ہوتی ہے یہ حدوث توجہ ہے اور اسی کا نام میں نے تنبہ رکھا ہے اور دوسرا مرتبہ دوام ہے اس توجہ کا یعنی آئندہ بھی ہر وقت یاد رکھنا جیسے شاگرد کو استاد جب زدوکوب کرتا ہے تو اس کو تنبہ ہو جاتا ہے اور سبق یاد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اول مرتبہ توجہ کا ہے پھر اگر وہ سعید ہے تو اس یاد کے سلسلہ کو برابر جاری رکھتا ہے۔ یہ دوسرا مرتبہ توجہ کا ہے اسی طرح بندہ کی سعادت یہ ہے کہ جب اس کو کسی واقعہ سے توجہ الی اللہ ہو تو اس کو برابر قائم رکھے بھولے نہیں پس جمعہ گزشتہ کا بیان تنبہ کے متعلق تھا اور یہ بیان توجہ دائمی یعنی دوسرے مرتبہ کے متعلق ہے۔ اسی دوسرے مرتبہ کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور یہ مضمون نہایت اہم ہے دنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ یعنی اس مضمون توجہ الی اللہ کے ساتھ جیسے کہ آخرت کی مصلحت وابستہ ہے اسی طرح دنیا کی مصلحت کا بھی اس کے ساتھ تعلق ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقاصد دو قسم کے ہیں ایک دنیوی دوسرے اخروی۔

طالبین کی قسمیں

طالبین کی تین قسمیں ہیں بعض مقاصد دنیوی کے طالب ہیں اور بعض مقاصد اخروی کے اور بعض دونوں کے، پس اگر کوئی شے ایسی ہو کہ اس سے صرف دنیوی مقصود حاصل ہوتا ہو اور دینی نہ ہو تو اس کے طالب صرف قسم اول کے لوگ ہوں گے اور اگر کوئی شے صرف مقصد اخروی کی محصل ہو تو اس کے طالب صرف طالب آخرت ہوں گے اور اگر کوئی شے جامع ہو کہ اس سے دنیا و آخرت دونوں ملتے ہوں تو اس کے طالب ہر دو قسم کے ہوں گے پس ہم دعوے کرتے ہیں کہ توجہ الی اللہ ایسی دولت ہے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں کے مصالح کی رعایت ہے۔ چنانچہ عنقریب یہ دعویٰ مع دلائل ثابت ہو جاوے گا۔

طاغوت کا مفہوم

اب آیت کی تفسیر عرض کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے: "**وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ** الخ" لفظ طاغوت طغیان بمعنی تجاوز عن الحد سے ہے۔ اس کا اطلاق شیطان اور بت اور نفس پر آتا ہے، مشترک معنوی ہے، مشترک لفظی نہیں ہے اور انابت بمعنی رجوع ہے مجھ کو مقصود بیان سے صرف "لھم البشریٰ" تک ہے، باقی آیت تتمیم فائدہ کے لیے پڑھ دی ہے کیونکہ اصل تو مجھ کو انابت یعنی توجہ الی اللہ اور اس کے ثمرہ کو بیان کرنا ہے اور وہ "**لَهُمُ الْبُشْرٰى**" تک ہے باقی انابوا کا جو معطوف علیہ تفسیری کے طور پر "**اجتنبوا الطاغوت**" ہے، جس میں نفی ہے اس کے ضد کی وہ بھی اس حیثیت سے مقصود ہے کہ انابوا کی توضیح اس پر موقوف ہے اس لیے کہ شے اپنی ضد سے خوب واضح ہوا کرتی ہے۔ پس حاصل ترجمہ کا یہ ہوا کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں طاغوت سے یعنی شیطان اور بتوں اور نفس سے اور اجتناب ان سے کرنا ہر چند کہ واضح تھا اس لیے کہ ہر ایک کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جو معاملہ ان سے پہلے سے کیا جاتا ہو ان سے بچیں لیکن حق تعالیٰ نے چاہا کہ کلام پاک میں ذرا سا بھی ابہام نہ رہے اور مقصود بالکل متعین ہو جاوے چنانچہ اسی واسطے "**ان یعبدوھا**" فرمایا۔ گویا یوں فرماتے ہیں کہ اجتناب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مثلاً ان کو ہاتھ نہ لگاؤ بلکہ

مطلب یہ ہے کہ پرہیز کرتے ہیں ان کی عبادت کرنے سے' سبحان اللہ قرآن مجید باوجود معجز ہونے کے کوئی ضروری امر اس میں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ "اَنْ یَّعْبُدُوْھَا طَاغُوْتَ" سے بدل ہے۔ طاغوت سے اگر بت مراد ہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں بتوں کی عبادت کرنے سے اور اگر طاغوت سے شیطان مراد ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ پرہیز کرتے ہیں شیطان کی عبادت کرنے سے۔

شیطان کی عبادت کا مفہوم

اور اسی کے ہم معنے دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: "اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ۔" (یعنی اے اولاد آدم کی کیا میں نے تم سے عہد نہیں کیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو) اس میں بظاہر اشکال یہ ہوتا ہے کہ شیطان کی عبادت کون کیا کرتا ہے بتوں کی البتہ وہ لوگ عبادت کیا کرتے تھے جواب اس کا موقوف ہے۔ ایک مقدمہ پر وہ یہ کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ عبادت کے معنے لغت میں غایۃ تذلل کے ہیں۔ چنانچہ طریق معبد بمعنی مذلل آیا ہے اور شریعت کی اصطلاح میں عبادت وہ غایت درجہ کی فرمانبرداری ہے کہ اس فرمانبرداری کے سامنے کسی کی فرمانبرداری نہ رہے اور اسی وجہ سے یہ خاص حق ہے حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ حقیقت ہے عبادت کی اور غیر حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے ہی کو شرک کہتے ہیں لیکن وہ معاملات جو حق تعالیٰ کے ساتھ بندوں پر واجب ہیں وہ ہم کو اپنی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتے اس لیے حق تعالیٰ نے ایسی ذات مقدس کی زبان سے کہ جس کی نبوت دلائل عقلیہ سے ثابت ہے ان معاملات کی فہرست ہم کو بتلا دی ہے۔ من جملہ ان معاملات کے یہ بھی معاملہ ہے کہ حق تعالیٰ کے امر کے ساتھ اگر کوئی مزاحم و معارض بھی ہو تب بھی اطاعت کا حق بجز حق تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اسی درجہ میں ہوگی لیکن وہ نیابتہ ہوگی۔ حقیقتاً و بالذات ایسی اطاعت بجز حق تعالیٰ کے کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اب سمجھئے کہ شیطان کی عبادت کے کیا معنے ہوں گے وہ یہ ہوں گے کہ امر شیطان کے مزاحم اگر انبیاء و اولیاء قرآن و حدیث و علماء دین و عقل کے احکام ہوں تو ان سب اوامر کو پس پشت ڈال کر شیطان کا کہنا مانا جاوے۔ (بقول شیخ علیہ الرحمتہ)

بقول دشمن پیان دوست بشکستی   بہ بین کہ از کہ بریدی وبا کہ پیوستی

(دشمن کے کہنے میں آ کر تو نے دوست سے پیان وفا توڑ ڈالا' ذرا غور تو کر کہ تو نے کس سے کٹ کر کس سے رشتہ جوڑا ہے)

توجہ کی حقیقت

بہر حال وہ اشکال کہ شیطان کی کون عبادت کرتا ہے دفع ہو گیا اور حاصل معنے کا یہ ہوا کہ جو لوگ شیطان پرستی و بت پرستی سے بچتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے لیے بڑی بشارت ہے' یہ تو آیت کا ترجمہ ہوا اس سے حقیقت مجملہ توجہ کی معلوم ہوگئی ہوگی اب حقیقت مفصلہ سنئے وہ یہ کہ میں نے اول دعویٰ کیا تھا کہ توجہ سے میری مراد نفس توجہ نہیں بلکہ اس کا دوام اور بقاء مقصود بالبیان ہے اور آیت میں ایسی ہی توجہ مراد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انابوا کو بذریعہ عطف کے مقابل عبادۃ الطاغوت کے فرمایا ہے اور محاورات میں متقابلین کو ذکر کرنا بشرط عدم عارض اس پر دال ہوتا ہے کہ یہاں تیسری قسم نہیں ہے کل دو ہی شی ہیں' عبادت طاغوت یا انابتہ الی اللہ اور انابت الی اللہ بطور عطف تفسیری کے اجتناب عن الطاغوت کی تفسیر ہے۔ پس طاغوت سے بچنا ہی انابت الی اللہ ہے۔ عبادت الطاغوت اور انابت میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جب یہ متقرر ہو گیا اب یہ سمجھنا چاہیے کہ بت پرستی کی کسی وقت اجازت نہیں ہے۔ پس اجتناب عن الطاغوت فرض دائم ہوا اور چونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ اجتناب عن الطاغوت عین انابت الی اللہ ہے پس انابت الی اللہ بھی فرض دائمی ہوا۔

دوام توجہ

پس مطلوب میرا ثابت ہو گیا کہ دوام توجہ مدلول آیت کا ہے اور چونکہ اجتناب عن الطاغوت اور انابت الی اللہ دونوں کو مترادف فرمایا ہے اس لیے احد المترادفین میں جس قدر مرتبے نکلیں گے اسی قدر درجات دوسرے میں ہوں گے۔ چنانچہ اجتناب عن الطاغوت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی بت پرستی کرنا چھوڑ دے۔ اس کے بدون تو ایمان ہی نہیں ہوگا جب آدمی

بت پرستی چھوڑ دے گا تو ادنیٰ مرتبہ ایمان کا اس کو حاصل ہوجاوے گا یا یوں کہئے کہ ادنی مرتبہ انابت کا حاصل ہوجاوے گا اور ادنیٰ اس لیے کہا کہ بدون اس کے مومن نہیں کہلاتا۔ افسوس ہے کہ آج کل اسی درجہ پر اکتفا کر کے یہ سمجھ لیا کہ ہم منیب و متوجہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس درجہ والوں کو بھی منیبین میں داخل فرمالیا ہے۔ چنانچہ ادنیٰ درجہ ایمان کا یہی ہے کہ آدمی بت پرستی چھوڑ دے حالانکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اکثر اوقات ایسے گزرتے ہیں کہ ان میں نہ بت پرستی کی طرف توجہ ہے اور نہ توجہ الی اللہ ہے بلکہ دونوں میں واسطہ نکلتا ہے۔

نماز اور حضورِ قلب

چنانچہ بعض صوفیاء نے اسی بناء پر اس میں توسع نہیں کیا بلکہ توجہ کو ہر وقت ضروری قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نماز میں وہ حضورِ قلب کو اول سے آخر تک لازم ٹھہراتے ہیں اگر ایک لحہ بھی غفلت ہوگی تو وہ فرماتے ہیں کہ نماز کا اعادہ کرے اور اس اعادہ کرنے کو وہ اس نماز میں تو متصلا فرماتے ہیں جن کے بعد نوافل مکروہ نہیں اور جن نمازوں کے بعد نوافل مکروہ ہیں ان میں اس وقت کے گزرنے کے بعد فرماتے ہیں اور اعادہ کرنے میں بھی اگر حضور نہ ہوتو پھر پڑھنا چاہیے حتیٰ کہ ایسی نماز ہو کہ اس میں اول سے آخر تک حضور ہو لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ امر عادۃً سخت دشوار ہے کہ ایسی نماز ہو کہ اس میں ایک لحہ بھی غفلت نہ ہو اس لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق کے اندر ایک وسعت نکالی ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ نماز ہم کتنی دیر میں پڑھ سکتے ہیں۔ مثلاً ۱۵ منٹ میں چار رکعت پڑھ سکتے ہیں اس کے بعد نماز پڑھ کر دیکھنا چاہیے کہ کتنی دیر اس نماز میں حضور رہا اور کتنی دیر غفلت۔ مثلاً غفلت ۱۰ منٹ رہی ہے اس کے بعد اس کا اعادہ کرے پھر ان چار رکعت میں دیکھے کہ کتنی دیر حضور رہا۔ مثلاً ۵ منٹ حضور رہا تو ۱۰ منٹ اس کو حضور حاصل ہوگیا اس کے بعد پھر اس کا اعادہ کرے حتیٰ کہ ۱۵ منٹ حضور کے پورے کرلے۔ یہ طریقہ چند روز کرے ان شاء اللہ پوری نماز کے اندر حضور اس کو میسر ہونے لگے گا لیکن اس میں شیخ کامل سے مشورہ کرلے اس لیے کہ ہر شخص کا حال جدا ہے' بعض کے لیے یہ طریق مناسب ہے بعض کے لیے نہیں' بعض کے لیے کچھ اور مناسب ہے میں نے فن کا مسئلہ بیان کردیا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ

آج ہی سے اس پر عمل شروع کر دیا جو کچھ کرو شیخ کامل سے پوچھ کر کرو، غرض یہ کہ بعض صوفیاء نے تو لاصلوٰۃ الا بحضور القلب کے ظاہر پر نظر فرما کر اس میں بالکل وسعت نہیں فرمائی اور فرمادیا کہ بغیر حضور کے نماز نہیں ہوگی۔

نماز کے درجات

البتہ فقہاء کرام اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمادے چونکہ بڑے شفیق ہیں اور ان کی نظر جیسی معاد پر ہے معاشی پر بھی ہے اور جس طرح تدین ان کا منظور الیہ ہے اسی طرح تمدن بھی محط لحاظ ہے اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ لاصلوٰۃ الا بحضور القلب مسلم ہے لیکن نماز کے درجات مختلف ہیں اور حضور قلب کے مراتب بھی متفاوت ہیں۔ اگر حضور اعلیٰ درجہ کا ہے تو نماز بھی اکمل مرتبہ کی ہوگی اور اگر حضور میں کمی ہوگی تو اسی درجہ میں نماز بھی ہوگی حتیٰ کہ نفس صلوٰۃ کی صحت کے لیے یہ فرماتے ہیں کہ شروع میں تھوڑا سا حضور قلب جس کو نیت کہتے ہیں ہونا ضروری ہے اگر اس قدر بھی نہ ہوگا تو وہ نماز ہی نہ ہوگی اور مستند فریقین کا وہ حدیث اعرابی کی ہے کہ اس نے آ کر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز بغیر تعدیل ارکان جلدی جلدی پڑھی جب نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**وعلیک السلام ارجع فصل فانک لم تصل**"[1]، یعنی تجھ پر بھی سلام لوٹ نماز پڑھ اس لیے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ یہ حضرات صوفیاء کا تو اس طرح مستند ہے وہ فرماتے ہیں کہ دیکھو اس شخص نے جلدی جلدی بلاحضور نماز پڑھی تھی اس کی نسبت آپ نے فرمایا کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ معلوم ہوا کہ بغیر حضور نماز نہیں ہوتی اور اسی حدیث میں ہے کہ اس اعرابی نے پھر اسی طرح نماز پڑھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا تیسری مرتبہ اس نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، مجھ کو تو ایسی ہی نماز آتی ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طریقہ نماز کا بتلایا اور مع تعدیل ارکان وخشوع وخضوع کے اس کو نماز تعلیم فرمائی اور آخر میں یہ فرمایا کہ جس قدر اس میں سے کمی کرے گا اسی قدر تیری نماز میں سے کمی ہوجاوے گی۔ یہ مستند فقہاء کا ہے کہ اس سے معلوم

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۱۹۲، سنن الترمذی: ۳۰۳)

ہوا کہ خشوع وخضوع وتعدیل ارکان کی کمی سے نماز میں کمی ہوگی نماز بالکل نہ جاوے گی۔ چنانچہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ سن کر فرمایا "لم تذهب صلوته کلها" اسی واسطے ہم صوفیاء کے اس قول کے کہ نماز بلا حضور نہیں ہوگی تو جیہ یہ کرتے ہیں کہ بلا حضور کامل نہیں ہوگی ورنہ نفس صلوٰۃ کی صحت کے وہ بھی قائل ہیں۔

انابت کے درجات

اور فقہاء کے قول کی موید یہ آیت بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طاغوت سے بچنے کو انابت میں داخل فرمایا ہے گو وہ انابت متجدد اور منحصر نہ ہو۔ الحاصل ایک مرتبہ انابت کا تو یہ ہوا کہ بتوں کی عبادت نہ کرے اور یہ ادنیٰ درجہ ہے دوسرا مرتبہ انابت کا اعلیٰ درجہ ہے اور وہ بھی مقابل ہے عبادت طاغوت کا، جس طرح پہلا درجہ مقابل تھا پس انابت میں جب اعلیٰ درجہ نکلے گا تو عبادت طاغوت میں بھی اس کے مقابلہ ایک مرتبہ اور نکلے گا فرق اس قدر ہے کہ انابت میں تو غلو کی جانب میں مراتب نکلیں گے اور عبادت طاغوت میں جو اس کے مقابل مراتب نکلیں گے وہ سفل کی جہت میں ہوں گے یعنی اگر انابت ادنیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت اس کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ چنانچہ اس کا بیان اوپر آ چکا ہے اور اگر انابت اعلیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت کا ادنیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا اعلیٰ درجہ تو ہم بیان کر چکے ہیں اب انابت کا اعلیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا ادنیٰ درجہ جو اس کے مقابل ہے اس کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ قاعدہ مقررہ مسلمہ ہے کہ "الاشیاء تعرف باضدادها" (اشیاء اپنی متضاد سے پہچانی جاتی ہیں) اس لیے اول عبادت طاغوت کا درجہ بیان کیا جاتا ہے اس سے انابت کا اعلیٰ درجہ خود سمجھ میں آ جاوے گا۔ جاننا چاہیے کہ صوفیاء کرام فرماتے ہیں: "ماشغلک عن الحق فهو طاغوتک" (یعنی جو شے تجھ کو خدا سے غافل کردے وہ تیرا بت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ غفلت کو بت پرستی سے تعبیر فرماتے ہیں جتنی دیر غفلت ہوگی اسی قدر گویا بت پرستی میں مشغول رہے گا۔ اسی بناء پر اکثر صوفیاء کرام کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بت پرست لکھتے ہیں۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں تو جابجا یہ الفاظ دیکھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے حکیم سنائی فرماتے ہیں:

بہر چہ از دوست و امانی چہ کفرآں حرف و چہ ایماں

بہر چہ از یار دورافتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(ہر وہ بات جو دوست سے قریب کرے خواہ وہ ظاہراً کفر کی بات لگے وہ وجہ زیبا پسندیدہ ہے اور ہر وہ چیز جو دوست سے دور کرنے کا سبب بنے خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو وہ بری ہے)

مولانا فرماتے ہیں:

ہر چہ جز ذکر خدائے احسن است — گر شکر خواری ست آں جان کندن است

(اللہ کریم کے ذکر کے سوا خواہ کوئی چیز کتنی ہی بھلی ہو وہ بھی جان نکالنے کے برابر ہے)

بعض اہل ظاہر خشک مزاج حضرات صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں کہ سبب غفلت کو بت اور غفلت کو بت پرستی کہنے سے مسلمانوں کو بت پرستی اور شیطان پرست بناتا ہے جواب اس کا یہ ہے کہ اس قسم کا اطلاق خود حدیث شریف میں وارد ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ کبوتر کے پیچھے جارہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا "**شیطان یتبع شیطانة**"[1] (یعنی یہ شخص شیطان ہے اور شیطان کے پیچھے جارہا ہے) دیکھئے کبوتر ایک پاک جانور ہے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے حق میں وہ کبوتر شیطان ہوگیا ہے اس پر وہ اثر کیا ہے جو شیطان کیا کرتا ہے اور مثل شیطان کے ضرر رساں ہوگیا اس لیے کہ اس نے خدا سے غافل کردیا ہے بیچارے صوفی تو سبب غفلت کو بت ہی کہتے ہیں۔ حدیث میں تو اس سے بڑھ کر سبب غفلت کو شیطان فرمایا۔ پس اگر "**کل ماشغلک عن الحق فھو طاغوتک**" میں طاغوت سے مراد شیطان ہو تب تو حدیث اور قول صوفیاء مطابق ہیں اور اگر طاغوت سے مراد بت ہوں تو یہ قول بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا اس لیے کہ شیطان تو فی نفسہ شر ہے بخلاف اصنام کے کہ اس کے اندر فی نفسہ خبث نہیں اس کو خبیث اور شر اضافتہ کہا جاتا ہے اور شیطان کے اندر جو شر ہے اس کا اثر تو خود اسکی ذات پر پڑے گا چنانچہ معذب ہوگا جہنم میں جاوے گا' بخلاف اصنام کے کہ وہ معذب نہ ہوگا وہ جہنم میں تو ضرور جاویں گے اس لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "**اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ**۔" (بے شک تم اور اللہ کے سوا جن کی تم عبادت

---

[1] سنن ابی داؤد:۴۹۴۰'مشکوۃ المصابیح:۴۵۰۶)

کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہیں) لیکن ان کا جہنم میں جانا تعذیب کے لیے اور مغضوبیت کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ اس لیے کہ بت پرستوں کو حسرت ہو اور اپنی حماقت ظاہر ہو اور ملامت قوی ہو چنانچہ اسی واسطے چاند سورج بھی جہنم میں جاویں گے لیکن عذاب کے لیے نہیں بلکہ اس لیے تا کہ ان کے عابدین جان لیں کہ یہ معبود نہیں ہیں اگر معبود ہوتے تو جہنم میں کیوں جاتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "لَوْ كَانَ هٰؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا" (اگر یہ خدا ہوتے تو جہنم میں نہ لائے جاتے) اور وجہ یہ ہے کہ بت اور چاند سورج وغیرہ یہ غیر مکلّف ہیں اس لیے تعذیب کے لیے یہ جہنم میں نہ جاویں گے۔

کسوف اور خسوف کا سبب

اور یہاں سے عوام کی ایک غلطی کا ارتفاع بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ کسوف اور خسوف میں چاند سورج کو تکلیف اور عذاب ہوتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ کسوف اور خسوف کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت اور ہیبت ظاہر فرماتے ہیں کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ ایسے ایسے اجرام نیرہ عظیمہ میں بھی جو چاہیں تصرف کریں، پس اس کے مقتضا پر کسوف وخسوف کے وقت لازم تو یہ تھا کہ اپنی فکر کرتے اور استغفار کرتے، برعکس اس کے علل اختراعیہ میں لگ گئے، یاد رکھو ان کو کوئی تکلیف و عذاب نہیں یہ تو سب اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ. اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ.

(یعنی اے مخاطب تو دیکھتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں سب سجدہ کرتے ہیں اور شمس وقمر اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور دواب اور بہت سے آدمیوں میں سے) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ساجدین وعابدین کو ذکر فرمایا ہے اور بڑے شرم کی بات ہے کہ اس فہرست میں جب آدمیوں کا ذکر آیا تو "کثیر من الناس" (لوگوں میں بہت سے) فرمایا یہ نہیں فرمایا "والناس" پس اس آیت سے ثابت ہوا کہ چاند

سورج ساجدین میں داخل ہیں پھران کو عذاب ہونے کے کیا معنے اور شیطان چونکہ مطرود و مردود اور عاصی و رجیم ہے اس لیے وہ جہنم میں تعذیب کے لیے جاوے گا۔ پس معلوم ہوا کہ شر شیطان میں بہ نسبت بت کے زیادہ ہے اور حدیث میں سبب غفلت کو شیطان فرمایا تو صوفیاء نے اگر سبب غفلت کو بت کہہ دیا تو کیا حرج ہوا۔

غفلت کا ادنیٰ درجہ

پس ہر سبب غفلت طاغوت ہے جب یہ امر منقح ہو گیا اب سمجھئے کہ ادنیٰ درجہ اشتغال بالطاغوت کا یہ ہے کہ کسی شے میں لگ کر خدا تعالیٰ سے غافل ہو جاوے اور اس ادنیٰ درجہ کا مقابلہ انابت میں یہ ہے کہ ہمہ تن مشغول بحق ہو کوئی ساعت توجہ الی الحق سے خالی نہ ہو اس لیے جب خالی ہوگا تو عبادت طاغوت کے ادنیٰ درجہ میں داخل ہو جاوے گا' اب واضح ہو گیا کہ انابت کا اعلیٰ درجہ کیا ہے اور عبادت طاغوت کا ادنیٰ درجہ کیا ہے اور عبادت طاغوت کا یہ درجہ گو بڑا درجہ نہیں لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ضرور ہے اور جب مبغوض ہوا تو اس سے بچنا اور اس کے مقابل یعنی دوام توجہ کا حاصل کرنا واجب ہوا اور یہ درجہ گو موقوف علیہ ایمان کا نہیں ہے کہ بغیر اس کے ایمان معتبر نہ ہو لیکن مقبولیت و قرب کا موقوف علیہ ضرور ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ ہم لوگوں پر جیسے یہ واجب ہے کہ بت پرستی سے مجتنب رہیں اسی طرح ایک درجہ میں دوام توجہ الی اللہ اور اجتناب عن سبب الغفلتہ بھی واجب ہے اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ مرتبہ توجہ کا ہم کو حاصل ہے یا نہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً اسباب غفلت میں ہم لوگ شب و روز مبتلاء ہیں اور ابتلاء کے علاوہ اس پر زیادتی یہ ہے کہ اس کو کچھ معصیت بھی نہیں سمجھتے اور نہ کبھی اس کا خیال آیا کہ ان اسباب غفلت سے اجتناب کریں۔ الا ماشاء اللہ اور بعض تو اسباب غفلت کے اندر انہماک میں اس قدر بڑھے ہیں کہ اس کو ہی کمال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بڑا ہوشیار وہ سمجھا جاتا ہے جو دنیا خوب کماوے اور اس میں مشغول ہو۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" (ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اللہ اکبر ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا (راستہ کا اختلاف تو دیکھو کہ یہ کہاں سے کہاں لے جائے گا)

یہاں پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وقت ہم کیسے متوجہ رہیں کیا دنیا کے سب

کاروبار، تجارت، زراعت اولاد، مال سب چھوڑ کر تسبیح لے کر مسجد میں بیٹھ جائیں یہ تو بہت مشکل ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسی اشکال کے ذہن میں راسخ ہوجانے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس مرتبہ سے محروم ہیں اور تصوف کی حقیقت یہی سمجھتے ہیں کہ سب کاروبار چھوڑ کر حجرہ میں بیٹھ رہیں اور اسی بناء پر نماز میں حضور قلب کو ناممکن سمجھ کر اس کی تحصیل کو بالکل چھوڑ دیا۔ بات یہ ہے کہ حضور قلب اور دوام توجہ کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اگر حقیقت سمجھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ اس میں کچھ بھی اشکال نہیں اس لیے اول اس کی حقیقت بتائی جاتی ہے۔

حضور قلب کا مفہوم

پس جاننا چاہیے کہ لوگ حضور قلب اور دوام توجہ فی الصلوٰۃ کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ کوئی خطرہ اول سے آخر تک نماز میں نہ آوے حالانکہ یہ معنے نہیں اس لیے کہ یہ تو عادۃً ناممکن ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی خطرہ کو خود نہ لاوے اور خود اگر آوے تو وہ حضور کے منافی نہیں ہے اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، آنا غیر اختیاری ہے اور اس پر کوئی ملامت نہیں اور لانا اختیاری اور محل ملامت ہے کیونکہ قلب مثل شارع عام کے ہے جیسے شارع عام میں اچھے برے شریف رذیل، چمار بھنگی سب چلتے ہیں اسی طرح انسان کا قلب ہے کہ اس میں اچھے برے خطرات سب آتے ہیں اور اس آنے پر مواخذہ نہیں ہے اس لیے کہ مواخذہ ہوتا ہے امر اختیاری پر اور خطرات کا آنا اختیاری نہیں ہے اس لیے شریعت نے یہ حکم نہیں دیا کہ کوئی خطرہ نہ آوے۔ ہاں یہ حکم فرمایا ہے کہ تم ان خطرات کو خود مت لاؤ۔ اب معلوم ہوگیا ہوگا حضور قلب اور دوام توجہ فی الصلوٰۃ کچھ بھی مشکل نہیں اس میں کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، اسی طرح دوام توجہ الی اللہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ غیر خدا کا خیال ہی نہ آوے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مستقلاً خود نہ لاوے اور اگر تبعاً لاوے تو اس کے منافی نہیں اور یہ ممکن الدوام بلکہ بعد محبت کے تو لازم الدوام ہے۔

حضور قلب کی عجیب مثال

میں اس کی حقیقت کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً کسی عورت پر عاشق ہوگیا، کوئی ساعت اس کو اس کی یاد سے خالی نہیں جاتی حالانکہ سوتا بھی ہے، کھاتا بھی ہے، دنیا کے سب کام کرتا ہے لیکن دل ہر وقت اسی طرف ہے یہ اس کا طبعی امر

ہو گیا ہے اور اس کی مخالفت سے سخت نفرت ہو گئی ہے جو کام کرتا ہے اول یہ سوچ لیتا ہے کہ اس کے خلاف مزاج نہ ہو، خصوصاً اگر وہ بلا بھیجے ہیں کہ آج تم ہمارے یہاں آنا اس وقت تو اس کی عجیب حالت ہوتی ہے اور محبوبہ کے یہاں جانے کے واسطے بڑے اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھتا ہے کہ میری صورت جنون کی سی ہو رہی ہے تو اول نائی کو بلا کر خط بنواتا ہے اور غسل کے لیے کھلی منگواتا ہے اور کپڑے سفید دھوبی سے دھلواتا ہے اور یا درزی سے نئے سلواتا ہے، عطر اگر نہ ہو تو وہ بھی اہتمام سے منگواتا ہے، غرض اسی بننے سنورنے میں کئی گھنٹے خرچ ہو گئے، کوئی ظاہر بین دیکھے تو کہے کہ دیکھئے محبوبہ نے تو اپنے گھر بلایا اور یہ ان دھندوں میں لگ رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اس نے اسی کی رضا کے لیے کیے ہیں، نہا رہا ہے تو اس لیے کہ محبوبہ پسند کرے، کپڑے پہنتا ہے تو اس لیے کہ محبوبہ راضی ہو، عطر لگاتا ہے تو وہ بھی اسی واسطے کہ محبوبہ خوش ہو، غرض کام سب کچھ کرتا ہے لیکن اس کی رضا و یاد سے قلب کسی وقت خالی نہیں ہے جو کام کرتا ہے یا تو اس لیے کرتا ہے کہ وہ ناراض نہ ہو اور یا اس لیے کہ وہ راضی ہو جائے اسی کو توجہ دائم کہا جاتا ہے اور عرف عام میں اسی کو کہا جاتا ہے کہ کسی گھڑی بھولتا نہیں، خواہ اس کو مجاز لغوی کہو یا حقیقت کہو، گفتگو یہ ہے کہ عرف عام میں جس کو یوں کہا جاتا ہے کہ ہر گھڑی یاد کرتا ہے ایسا معاملہ بندہ پر حق تعالیٰ کے ساتھ ایک مرتبہ میں ضروری ہے حاصل یہ ہے کہ نوکری زراعت تجارت دنیا کے سب کام کرو مگر جو کچھ کرو وہ حق تعالیٰ کی رضا کے لیے کرو، یہ تو اعلیٰ درجہ ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے اس لیے کہ یہ ہر شخص کا کام نہیں اتنا تو ضروری ہے کہ جو کام کرے اس میں یہ دیکھ لے کہ یہ کام حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں جو کام بھی کرے سب میں اس کا لحاظ رکھے کہ حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف نہ ہو، یہ مرتبہ واجب ہے اور طاعت واجبہ کا موقوف علیہ ہے اور یہ کہ جو کام کرے وہ رضا کے واسطے کرے یہ اس سے اعلیٰ درجہ ہے۔ موقوف علیہ طاعت واجبہ کا نہیں یہ شان اولیاء کاملین کی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے نفس کے لیے نہیں کرتے بلکہ رضا کے لیے کرتے ہیں۔

خلاف رضائے الٰہی کام نہ کرنے کے عزم صحیح کی ضرورت

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم تو عطر اس لیے لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پسند آوے، ایک مرتبہ فرمایا کہ جب پانی پیو ٹھنڈا پیو، ٹھنڈا پانی پینے سے بال بال

سے الحمدللہ نکلتی ہے سبحان اللہ ان حضرات کی نیت ہر امر میں یہی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوں اور شکر کامل ادا ہو یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کھانا کھانے' کپڑا پہننے جانے' چلنے پھرنے ہر کام میں یہی نیت ہو یہ نیت فرض دائم نہیں مگر اتنا ضروری ہے کہ ہر کام میں یہ خیال کرے کہ یہ خلاف مرضی حق تعالیٰ تو نہیں ہے غرض ہر کام اگر للرضا نہ ہو مگر یہ خیال تو ضرور ہے کہ میں خلاف رضا نہ کروں یہ مرتبہ فرض دائم ہے سو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مشکل نہیں ہے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دلائل وجوب کے بالکل بین وظاہر ہیں اور یہ بھی پیش نظر ہو گیا ہوگا کہ واقعی ہم لوگ بڑی کوتاہی کرتے ہیں یہ حوصلہ تو کہاں ہے کہ ہر کام ہمارا للرضا ہو لیکن ہم کو تو یہ درجہ وجوب بھی میسر نہیں کہ ہمارے کام خلاف رضا نہ ہوں چنانچہ اس کا مطلق خیال ہی نہیں' شب وروز معصیت میں گزر جاتے ہیں اگر کبھی خیال آتا بھی ہے تو شیطان کہتا ہے:
"اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والے بے حد مہربان ہیں)
حالانکہ اس کے معنے یہ نہیں کہ جو چاہو کیے جاؤ اللہ تعالیٰ بخش دیں گے۔

شانِ نزول

حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگوں نے شکایت کی تھی کہ اگر ہم لوگ ایمان لے بھی آ دیں تو کیا فائدہ ہے اس لیے کہ جو گناہ پہلے کیے ہیں وہ تو لکھے ہوئے ہیں ان پر مواخذہ ضرور ہوگا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی حاصل اس کا یہ ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان لے آؤ' پچھلے گناہ ہم معاف کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے شکستہ دلوں کے لیے اس کو نازل فرمایا تھا کہ مایوس نہ ہوں اس کے لیے مایوسی کا اثر یہ تھا کہ طاعت کی طرف نہ آتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آلہ اطاعت بنایا تھا کہ مایوسی دفع ہو جاوے اور طاعت اختیار کر لیں ہم لوگوں پر اس کا برعکس اثر ہوا کہ اس کو آلہ معصیت بنا لیا' اللہ تعالیٰ نے تو آئندہ کے لیے معصیت چھوڑنے کے لیے اس کو نازل فرمایا تھا' ہم نے اس کو معاصی کا ارتکاب کرنے کے لیے سمجھ لیا' وہی مثل ہوگئی گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں ہم پر واجب تو یہ تھا کہ ہر عمل میں یہ سوچتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض تو نہ ہوں گے ہماری حالت یہ ہے کہ اول یہ سوچتے ہیں کہ اس عمل میں دنیا کا تو کوئی نقصان نہیں جن طاعات کی عادت پڑ رہی

ہے وہ وہی ہیں جن میں کوئی مصلحت فوت نہ ہو امتحان کا وقت تو وہ ہے جبکہ ایک طرف دین ہو اور ایک طرف دنیا پھر دین کی جہت اختیار کریں۔ غرض معلوم ہوا کہ ہم کو توجہ دائم کا درجہ واجب بھی حاصل نہیں ہے۔ تیسرا مرتبہ انابت کا اور ہے وہ اس سے بھی اعلیٰ درجہ ہے وہ یہ کہ کبھی بھولے نہیں حتیٰ کہ سوتے ہوئے بھی غفلت نہ ہو خواب بھی دیکھتا ہے تو وہ بھی ذکر کر کے ہی خواب دیکھتا ہے۔ یہ درجہ واجب نہیں مستحب ہے اور ہر شخص کے مناسب نہیں کیونکہ عادۃً موقوف ہے۔

ترک تعلقات کے لیے ایک ضروری شرط

ترک تعلقات پر بلکہ اسکی تحصیل اس شرط کے ساتھ بھی مشروط ہے کہ کوئی واجب فوت نہ ہو مثلاً ایک شخص ہے اہل وعیال کا نفقہ اس کے ذمہ ہے وہ اگر اس کی تحصیل میں لگے گا تو یقینی بات ہے کہ تمام وجوہ معاش کو اول چھوڑنا پڑے گا اور جب چھوڑے گا تو اہل وعیال کی حق تلفی ہوگی اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ اہل وعیال کی تربیت کرے اور واجبات ادا کرتا رہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص نے حج فرض ادا کرلیا' دوسری مرتبہ حج نفل ادا کرنا چاہتا ہے' فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک نماز جانے کا بھی اندیشہ ہو تو اس کو حج کرنا حرام ہے۔ اسی کو حضرت مسعود بک فرماتے ہیں:

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے حج کے جانے والو تم کہاں ہو محبوب تو یہاں ہے جلدی آ جاؤ)

مستحب اور واجب میں فرق

فقہاء نے لکھا ہے کہ مندوب اس وقت تک مندوب ہے کہ اس کے اشتغال سے کوئی واجب ترک نہ ہو اور الحمد للہ کہ قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ.

(اے مومنو! تم ان بتوں کو برا نہ کہو جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں (اس لیے) کہ وہ ضد میں آ کر ناواقفی سے اللہ کو برا کہیں گے) دیکھئے بتوں کی مذمت کرنا مباح اور بعض وقت

مستحب ہے لیکن چونکہ اس سے حق تعالیٰ کی شان پاک میں بے ادبی کا احتمال تھا جو کہ ترک واجب ہے اس لیے اس سے روک دیا گیا۔ آج کل کے مناظرین نے اس سے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے، بے دھڑک فریق مخالف کے پیشواؤں کو برا کہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اس کا سبب یہ خود ہوتے ہیں۔ غرض آیت سے فقہاء کا یہ قاعدہ کہ مندوب اس وقت تک مندوب رہتا ہے کہ کوئی واجب فوت نہ ہو ثابت ہو گیا۔ پس یہ مرتبہ کہ ایک دم بھی غفلت نہ ہو یہ مندوب ہے اور یہ اس وقت تک مندوب رہے گا کہ اس کے اشتغال میں کوئی واجب وفرض فوت نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص فارغ ہے نہ اہل وعیال ہیں نہ اور کوئی جھگڑا ہے معاش سے اطمینان ہے اس کے لیے تو مندوب کیا ضروری ہے کہ وہ ہر وقت متوجہ الی الحق رہے۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں:

خوشا روز گارے کہ دارد کسے | کہ بازار حرصش نہ باشد لبے
بقدر ضرورت یسارے بود | کند کارے از مرد کارے بود

(اگر کسی خوش نصیب کو حرص ولالچ سے آزادی حاصل ہو جائے تو اسے مبارک ہو بس ضرورت کے مطابق یعنی قوت لایموت اسے حاصل رہے اور وہ مردوں کا سا کام (اپنی آخرت کے لیے) کرتا رہے

بڑے بد بخت ہیں وہ لوگ کہ خدا تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دے رکھا ہے دنیا کی تمام نعمتیں ان کو میسر ہیں کوئی فکر ان کو نہیں اور وہ اپنا وقت چوپایوں میں فضولیات میں اور حقہ نوشی کے اندر برباد کرتے ہیں۔ یاد رکھو اگر کوئی شخص گناہوں میں بھی مشغول نہ ہوا لیکن لغویات میں اپنا وقت برباد کیا اس کو بھی بعد مرنے کے بڑی حسرت ہوگی۔

خجل آنکس کہ رفعت وکار نساخت | کوس رحلت زند و بار نہ ساخت

(وہ شخص شرمندگی وندامت اٹھاتا ہے جو مقصود حاصل کیے بغیر روانہ ہو گا یعنی کوچ کا اعلان تو ہو گیا اور اس نے ابھی تک زادِ راہ ہی نہیں باندھا جو اہل بصیرت ہیں ان کی کیفیت تو یہ ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم | جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

(میں محبوب کے گھر پہنچ بھی گیا تو کیا ہوا جبکہ کوچ کی گھنٹی ہر لمحہ سامان سفر باندھنے کیلئے پکار رہی ہے)

سفرِ آخرت کا الارم

یعنی مجھ کو کوئے محبوب میں یعنی خدا تعالیٰ کی یاد میں کیسے امن وعیش یعنی اطمینان اور بے فکری ہو جبکہ ہر وقت جرس یہ فریاد مچا رہا ہو کہ کجاوے باندھو جب ہر وقت کوچ کی گھنٹی بج رہی ہو۔ بڑا غافل ہے وہ جو اس وقت بے فکری سے باتیں بنا رہا ہو اور کوچ کی تیاری نہ کرے وہ گھنٹیاں یہی ہیں جو جابجا موتیں ہو رہی ہیں ریل پر دیکھا ہوگا کہ جب گھنٹی بج جاتی ہے سب مسافر اپنا اپنا سامان لے کر تیار ہو جاتے ہیں اور ریل تو ریل عرب کے سفر میں دیکھا ہے کہ اونٹ جو کہ اپنے اختیار کی سواری ہے وہ بھی نہیں ٹھہرتے' جب جمال حی حی پکارتے ہیں اور اونٹوں کے لادنے کا تہیہ کر لیتے ہیں پھر وہ بالکل نہیں دیکھتے کہ کون فارغ ہے اور کون نہیں۔ چنانچہ بعض قضائے حاجت کرتے ہوئے ہیں' بعض کچھ پکاتے ہوئے ہیں سب چھوڑ کر ہنڈیا ہاتھ میں لیے ہوئے بھاگتے ہیں اور اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ سفرِ آخرت کی گھنٹیاں بج رہی ہیں' ہر وقت حی حی کا شور ہے کوئی دوست مر گیا' کوئی عزیز مر گیا لیکن ہم ہیں کہ خوابِ خرگوش میں کروٹ ہی نہیں بدلتے۔ مسلمانوں کو عموماً بھی بے فکر نہ ہونا چاہیے اور خصوصاً ان لوگوں کو جن کو اللہ تعالیٰ نے معاش سے بے فکر کیا ہے ان کو تو ضروری ہے کہ ہر وقت متوجہ رہیں کسی وقت غفلت نہ ہو اب یہیں پر ذاکرین کو دوامِ توجہ کے متعلق ایک غلطی ہو جاتی ہے پوری بات تو وقتاً فوقتاً جس طرح کے حالات پیش آویں شیخ ہی سے طے ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی اجمالاً کچھ ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ انسان کا خاصہ طبعی ہے کہ ہر وقت ایک کام نہیں کر سکتا' طبیعت اکتا جاتی ہے جیسے کوئی رات دن پڑھے اور کسی وقت بھی فارغ نہ ہو اور سیر و تفریح سے جی نہ بہلاوے تو لازمی بات ہے کہ طبیعت اس کی اکتا جاوے گی اور بعض مرتبہ ایسی پژمردہ ہوگی کہ وہ بالکل معطل محض ہو جاوے گا۔ اسی واسطے ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر سبق دس دفعہ کہنے کا شوق ہو تو آٹھ دفعہ کہو دو دفعہ چھوڑ دو تاکہ شوق باقی رہے اور اس شوق سے پھر کام لیا جاوے۔ اسی طرح عابدین ذاکرین کو بھی یہ امر پیش آیا ہے کہ کثرتِ ذکر سے ان کو ایک قسم کا ملال اور اکتاؤ پیش آ جاتا ہے اور بعض مرتبہ شیخ کامل اگر نہ ہو تو اس کا نتیجہ آخرہ غفلت و تعطل ہو جاتا ہے اس وقت یہ ضروری ہے کہ سب کام خلوت کا چھوڑ دے اور باغ میں دوستوں کے مجمع میں بیٹھے اور کچھ دیر باتیں کرے مزاح کرے تو وہ نشاطِ سابق پر عود کر آوے گا اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ غفلت کی اجازت ہے۔ صاحبو!

یہ غفلت نہیں اس کو بھی ذکر ہی میں شمار کریں گے اس لیے کہ معین ذکر ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کوئی شخص پوچھے کہ تمہارے یہاں کھانے میں کیا ہوتا ہے اور کس حساب سے ہوتا ہے تو تم کہو کہ جنس اس قدر اور مصالحہ اس قدر اور لکڑیاں اتنی تو وہ شخص اعتراض کرے کہ کیا آپ لکڑیاں بھی کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ معترض احمق ہے اس لیے کہ جس سے کھانے میں اعانت ہو وہ کھانے ہی کے حساب میں شمار کی جاتی ہے۔

معین ذکر

صاحبو! جس کو آپ غفلت سمجھے ہوئے ہیں یہ بھی ذکر کے لیے ہے اس لیے کہ یہ معین ذکر ہے طبیعت میں تازگی ونشاط اس سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی تو طبیعت کی افسردگی کی وجہ سے یہ ہوتی ہے اور کبھی اس وہم سے افسردگی ہو جاتی ہے کہ لذت نہ آنے سے شبہ ہو جاتا ہے کہ میرا ذکر نافع نہیں حالانکہ لذت نہ آنا یہ غیر نافع ہونے کی دلیل نہیں یہ امر طبعی ہے کہ ہر چیز میں اول اول مزہ آتا ہے پھر خوگر ہونے کے بعد اس میں وہ مزہ نہیں رہتا چنانچہ کسی نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے سوال کیا تھا کہ حضرت ذکر میں مزہ نہیں آتا' فرمایا کہ بھائی پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ابتداء میں ذکر شروع کرتا ہے تو چونکہ ایک نئی شے قلب میں آتی ہے تو جوش وخروش لذات کیفیات طاری ہوتی ہیں اور جب اس سے انس بڑھتا ہے تو کچھ بھی نہیں رہتا جیسے نئی بیوی سے شروع میں محبت کا بڑا جوش ہوتا ہے اور جب پرانی ہو جاتی ہے تو محبت جاتی نہیں بلکہ وہ محبت راسخ ہو جاتی ہے اور انس بڑھ جاتا ہے اس لیے جوش وخروش جاتا رہتا ہے غرضیکہ ہر وقت ایک کام کرنے سے اس میں لذت نہیں رہتی۔

لذت کی ایک عجیب حکایت

ایک امیر اور غریب کی حکایت یاد آ گئی' امیر نے دیکھا کہ غریب خوب موٹا تازہ سرخ سفید نکلا ہوا ہے' پوچھا کہ بھائی تم کیا کھاتے ہو جو ایسے موٹے خوش وخرم ہو' اس نے کہا کہ جناب میں بڑے مزے میں ہوں' ہر مہینے تو نئی شادی کرتا ہوں اور ہمیشہ مزیدار کھانا کھاتا ہوں' امیر صاحب نے کہا کہ یار کھلاؤ تو معلوم ہو۔ غریب نے کہا کہ اچھا آج ہمارے یہاں

تمہاری دعوت ہے امیر صاحب جب کھانے کے لیے آئے تو بڑی دیر ہوگئی کھانا ندارد امیر صاحب کو بھوگ لگی' کہنے لگے کہ میاں کھانا لاؤ کہنے لگے کہ صاحب جلدی نہ کیجئے میری بیوی اکیلی پکانے والی ہے آپ کے یہاں تو مامائیں ہیں' ملازم ہیں' میں غریب آدمی ہوں' تھوڑی دیر کے بعد پھر انہوں نے تقاضا کیا اس نے پھر حیلہ حوالہ کر دیئے' جب بھوک سے بیقرار ہوئے تو گھر میں سے باسی روٹی اور چنے کا ساگ لاکر پیش کر دیا کہ سہارے کیلئے تھوڑا سا اگر دل چاہے اس میں سے کھالو پھر کھانا تیار ہوجاوے گا۔ امیر صاحب کو چونکہ بھوک خوب لگی ہوئی تھی وہ کھانا اس قدر لذیذ معلوم ہوا کہ عمر بھر بھی ایسا کھانا نہ کھایا تھا' اس لیے کہ اپنے گھر تو یہ تھا کہ صبح ہوئی ناشتہ موجود ہے اس کے بعد فواکہات آئے وہ کھائے' کھانے کا وقت ہوا کھانا آیا اب بھوک کہاں اب سوچ رہے ہیں کہ کھائیں یا نہ کھائیں' مصاحبوں نے عرض کیا کہ حضور کچھ کھا لیجئے' کہنے سننے سے بلا رغبت اس میں سے بھی کچھ کھایا چونکہ کھایا بے بھوک اس لیے اب جوارش کمونی اور جوارش مصطگی کھا رہے ہیں۔ حکیم صاحب بلائے جا رہے ہیں غرض چونکہ اشتہائے صادق سے کبھی کھانا نہ کھایا تھا اس لیے کھانے میں لذت بھی نہ آئی تھی اور یہاں ملاپوری بھوک پر تو خوب کھایا' اس کے بعد پھر تازہ لذیذ کھانے حاضر کیے گئے تو اب کون کھاوے' غریب نے کہا اس میں سے بھی کھایئے' بہت لذیذ ہیں' امیر نے کہا بس بھائی اس سے زیادہ لذیذ نہیں' غریب نے کہا بس وہ لذیذ کھانا یہی ہے جو میں کھایا کرتا ہوں' یعنی خوب بھوک میں کھاتا ہوں' کہنے لگے واقعی بڑا لذیذ کھانا کھاتے ہو' اچھا یہ تو کھانے کا قصہ ہوا' اب بتلاؤ ہر مہینے شادی کا کیا قصہ ہے' کہنے لگے کہ جناب میں کبھی اندر گھر میں نہیں سوتا' ہمیشہ باہر سوتا ہوں' جب مہینہ ختم ہوا اور میری عورت ایام معمولی سے نہا دھو کر فارغ ہوئی اس وقت میں اس کے پاس جاتا ہوں تو مجھ کو وہی لذت آتی ہے جو پہلی شب میں ہوتی ہے۔ بخلاف آپ کے کہ ہر وقت آپ کا یہی شغل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جو لذت دائم ہوگی وہ لذت نہ ہوگی کسی وہمی کو یہ شبہ نہ ہو کہ شاید جنت میں بھی لذت منقطع ہو جاوے گی کیونکہ دائم ہوگی۔ بات یہ ہے کہ اس عالم میں جو یہ ہمارا ادراک ہے یہ نہایت ضعیف ہے اور اشتیاق بھی محدود ہے اس لیے یہ ادراک اپنے ضعف کی وجہ سے لذات کو محسوس نہیں کرتا اور اشتیاق بھی ختم

ہو جاتا ہے اور وہاں ادراک میں قوت ہوگی اشتیاق برابر بڑھتا چلا جائے گا جو چیز کھائیں گے نہایت اشتیاق سے کھائیں گے اس لیے لذت وہاں کی ختم نہ ہوگی اسی واسطے محققین نے فرمایا ہے کہ ذاکرین کو چاہیے کہ کوئی وقت فراغ کا نکالیں کہ اس میں سیر وتفریح میں مشغول ہوں تاکہ طبیعت پھر تازہ ہوجاوے اور اگر یہ شخص خود نہیں نکالتا تو اللہ تعالیٰ خود اس کی مصلحت کی رعایت فرماتے ہیں کہ قبض طاری فرمادیتے ہیں جس سے یہ گھبراتا ہے پریشان ہوتا ہے اس کے بعد پھر بسط ہوتا ہے اور تازگی سابق عود کرآتی ہے۔ بہرحال جو شخص ہر وقت کام میں لگا رہتا ہو کسی وقت بھی فارغ نہ ہوتا ہو سمجھ لو کہ یہ کچھ نہیں۔

جد کلہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے کہا فلاں جد کلہ یعنی فلاں شخص سراپا جد ہے یعنی ہر وقت ضروری کام میں لگا رہتا ہے کسی وقت فارغ ہو کر دوستوں میں ہنستا بولتا نہیں فرمایا "ھو ھزل کله" یعنی وہ سراپا ہزل ہے یعنی وہ بیکار ہے۔

با کمال شخص

حاصل یہ کہ تین قسم کے لوگ ہیں اول تو وہ جو سب سے کنارہ کش ہوتے ہیں اور ذکر و عبادت میں مشغول ہیں کسی سے بولتے تک نہیں۔

اگر کوئی آتا بھی ہے تو خلوت خانہ سے برآمد نہیں ہوتے اگر کچھ بات کریں گے تو اشارہ سے جواب دیں گے ایسے شخص کو لوگ باکمال سمجھتے ہیں اور ایک وہ ہے جو رات دن ہنسی مذاق دل لگی لغویات فضولیات ہی میں رہتا ہے یہ دونوں کچھ نہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے کہ وقت پر عبادت بھی کرتا ہے اور کسی وقت دوستوں میں ہنسی دل لگی کی باتیں بھی کرتا ہے توسط کو لیے ہوئے یہ شخص باکمال ہے غرض جو ہر وقت کام میں رہتا ہے وہ کسی نہ کسی وقت ضرور بیکار ہوجاوے گا، ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور بہت دیر تک باتیں کیں آخر میں عرض کیا حضرت میں نے آپ کی عبادت میں بڑا حرج کیا، فرمایا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ نماز پڑھنا ہی عبادت ہے بھائی دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے۔

مفہوم عبدیت

ایک مرتبہ حضرت نے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ الخ" (میں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں) میں تخصیص جن وانس کی وجہ بیان فرمائی حالانکہ تمام مخلوق بالخصوص ملائکہ طاعت میں مشغول ہیں' فرمایا کہ عبدیت محض طاعت اور آقا کی خدمت گزاری ہی کو نہیں کہتے کہ یہ تمام مخلوق میں مشترک ہے بلکہ عبدیت ایک خاص شان کی عبادت کو کہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبد کا کوئی خاص کام مقرر نہیں بلکہ وہ تو حکم کا بندہ ہے جو حکم مولیٰ کا ہو اس کو وہ کرنا چاہیے بخلاف نوکر کے کہ اس کے لیے خاص کام معین ہے' غلام کے لیے کوئی کام معین نہیں' ایک وقت وہ ہوگا کہ مولا اس کو اپنا لباس پہنا کر اپنا منیجر بنا کر بھیجے گا' ایک وقت وہ ہوگا کہ مولیٰ اس سے اپنا پاخانہ پیشاب دھلوائے گا' فرشتوں کی شان تو نوکر کی سی ہے کہ جو کام ان کو بتلا دیا گیا ہے اسی میں مشغول ہیں' بعض رکوع میں ہیں' بعض سجدہ میں ہیں' بعض صور منہ میں لیے کھڑے ہیں' بعض جان نکالنے کے لیے معین ہیں' بعض مینہ برسانے کے لیے مخصوص ہیں' بعض کو وحی کی خدمت سپرد ہے اور اسی طرح تمام مخلوق کی حالت ہے بخلاف انس وجن کے کہ ان سے ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ نماز پڑھو' ایک وقت کہا جاتا ہے کہ پاخانہ میں جاؤ نماز مت پڑھو اور یہ تعجب کی بات نہیں حدیث شریف میں خود آیا ہے "لایصلی احد کم وھو حاقن"[1] اور ایک وقت حکم ہے سو دوسرے وقت فرمان ہے کہ جاگو ایک وقت کہا جاتا ہے کہ قلم پکڑنا عبادت ہے دوسرے وقت سامان حرب میں اعداء دین سے مقابلہ کرنا عبادت ہے جیسے اللہ اللہ کرنا عبادت ہے اسی طرح قہقہہ لگانا بھی عبادت ہے اس لیے کہ معین ذکر ہے جیسے پہلی مثال میں بیان کیا کہ لکڑی بھی کھانے میں داخل ہے اسی واسطے فرمایا "الالیعبدون" یعنی ان کو عبد بنانے کے لیے پیدا کیا' غرض مختلف ہیئتوں سے یہ سب کام دوام ذکر ہی ہیں۔ بشرطیکہ اس ہنسنے بولنے میں بھی غرض یہی ہو کہ ذکر میں تجدید ہو ورنہ پھر غفلت میں داخل ہے۔ الحاصل تیسرا درجہ انابت کا جو کہ مندوب ہے اس میں شرط یہ ہے کہ کوئی واجب ترک نہ ہو۔

---

[1] (سنن ابی داؤد' کتاب الطھارۃ ب: ۴۱' الترغیب والترھیب ۳: ۴۳۷)

خلاصہ وعظ

خلاصہ تمام تقریر کا یہ ہوا کہ انابت کے تین درجے ہیں ایک یہ کہ کفر وشرک چھوڑ دو' دوسرا یہ کہ جو کام کرو خدا تعالیٰ کی رضا کے واسطے یا ناراضی سے بچنے کے لیے کرو' تیسرا درجہ یہ کہ اشتغال باللہ ہر وقت ہو' پہلا درجہ موقوف علیہ ایمان کا ہے دوسرا درجہ موقوف علیہ طاعت واجبہ کا ہے۔ تیسرا درجہ موقوف علیہ درجات قرب ہے اور بعض کو دوسرے ہی درجہ سے درجات قرب نصیب ہو جاتے ہیں جبکہ درجہ ثالثہ کی تحصیل کا سامان نہ ہو' سبحان اللہ حق تعالیٰ کا کلام بھی کیا جامع ہے کہ دو لفظوں میں اس قدر مضامین آ گئے۔

ثمرہ انابت

اس کے بعد اس انابت کا ثمرہ ارشاد ہوتا ہے اور اسی سے میرا دعویٰ کہ انابت الی اللہ ایسی شے ہے کہ اس سے دنیا وآخرت دونوں ملتی ہیں (جس کا شروع میں ذکر آیا ہے) ثابت ہوگا۔ "لَهُمُ الْبُشْرٰى" یعنی ایسے لوگوں کے لیے بشارت ہے بظاہر "لَهُمُ الْبُشْرٰى" میں بھی تین درجے نکلیں گے یعنی جس درجہ کی انابت ہوگی اسی درجہ کی بشارت بھی ہوگی چنانچہ جو انابت میں کامل ہیں وہ دنیا وآخرت دونوں میں خوش ہیں کہ کوئی غم نہیں ستاتا اور جو انابت میں کم ہیں وہ اس بشارت میں بھی کم ہیں۔ (علی ہذا القیاس ۱۲ ناقل) بشارت کو حق تعالیٰ نے مطلق ارشاد فرمایا ہے' دنیا یا آخرت کے ساتھ خاص نہیں فرمایا اس لیے آیت میں بوجہ اطلاق کے بشریٰ کا فرد کامل ہی مراد ہوگا اور حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ ان مقبول بندوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں خوشی ہے اور دوسری آیت سے اس تعمیم کی تائید بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

اَ لَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ

(یاد رکھو اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ کسی (مطلوب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں وہ (اللہ تعالیٰ کے دوست) ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی (منجانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوشخبری ہے۔

بشریٰ کا مفہوم

اب یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رویائے صالحہ مبشرات میں سے ہیں اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بشریٰ سے آیت میں خاص رویاء صالحہ مراد ہے جواب یہ ہے کہ حدیث سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ رویاء صالحہ بھی بشریٰ کی ایک فرد ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ بشریٰ منحصر اس میں ہے چنانچہ من المبشرات فرمایا ہے حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں بھی خوشی ہے اور آخرت میں بھی خوشی ہے لیکن بعض نے دنیا کی خوشی سے موت کے وقت کی خوشی مراد لی ہے۔ چنانچہ آیا ہے: "تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ اَنْ لَّاتَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا" (ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو) چنانچہ نیک بندوں کو موت کے وقت بھی خوشخبری دی جاتی ہے بہت سے مردوں کی اس قسم کی حکایت سننے اور دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ایک گاؤں میں ایک تیلن تھی جو بالکل ان پڑھ جاہل تھی، جب وہ مرنے لگی تو نہایت فصیح عربی کے الفاظ اس کے منہ سے نکلے، اس کے عزیز قریب سمجھے کہ ہذیان میں بک رہی ہے، وہاں ایک شخص ذی علم ملازم سرکاری تھے، کوئی ان کے پاس آیا اور کہا ذرا آپ تشریف لے چلئے اور سنئے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے وہ گئے تو وہ کہہ رہی تھی "ھذا ان الرجلان یقولان ادخلی الجنة" (یعنی یہ دو آدمی مجھ کو کہتے ہیں کہ جنت میں چل) میں نے ان لوگوں سے پوچھا یہ کیا عمل کرتی تھی، لوگوں نے کہا کہ جناب کچھ بھی عمل نہ کرتی تھی اور بڑی لڑاکا تھی، البتہ ایک خصلت اس میں تھی وہ یہ کہ جب اذان ہوتی تھی تو کسی کو بولنے نہ دیتی تھی اور تمام لڑائی اس کی اسی پر تھی اور کہا کرتی تھی کہ اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور تم بولتے ہو۔ حق تعالیٰ کی رحمت ہے جس عمل کو چاہے پسند فرمالیں۔ اس قسم کے بہت سے قصے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت بھی بشارت ہوتی ہے۔ غرض حدیث میں بشری سے مراد رویاء صالحہ آیا اور بعض نے بشری سے موت کے وقت کی بشارت مراد لی ہے اس سے معلوم ہوا کہ بشری سے کوئی خاص بشری مراد نہیں بلکہ بشری یہاں عام ہے اور اس کے یہ سب مختلف افراد ہیں یہاں تو منیبین کے لیے دنیا و آخرت کی خوشی آیت سے ثابت ہوئی۔

حضرات اہل اللہ پریشان کیوں نہیں ہوتے

اب میں کہتا ہوں کہ مشاہدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے' دیکھ لیجئے کہ حضرات اہل اللہ کسی وقت پریشان نہیں ہیں اور وہ خودتو کیا پریشان ہوں گے آپ کو جس وقت پریشانی ہو آپ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھ لیجئے' خود آپ کی پریشانی مبدل بہ اطمینان ہوجاوے گی اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ ہم لوگوں کو تو دنیا کی طرح طرح کی پریشانیاں اور تفکرات اور غموم ہیں اس لیے پریشان ہیں اور وہ آزاد ہیں اس لیے پریشان نہیں تو اس میں ان کے اہل اللہ ہونے کو کیا دخل' سو اس کا امتحان یہ ہے کہ آپ ان کو ایسے وقت دیکھئے کہ جب ان پر کوئی واقعہ مصیبت کا ہو کہ جس میں آپ گھبرا جاتے ہوں ان کو آپ اس وقت دیکھیں گے کہ ان کی جمعیت میں مطلق ذرا برابر فرق نہیں' مثلاً ان کا بیٹا یا عزیز مر جاوے یا کوئی مالی نقصان پہنچے اس وقت ان کو دیکھئے' میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو رنج نہ ہوگا ان کے آنسو نہ بہیں گے' رنج بھی ہوگا' روئیں گے بھی لیکن جس کا نام پریشانی ہے' گھبراہٹ ہے' اضطراب ہے' قلب کا تفرق ہے' وہ مطلق نہ ہوگا' دل سے راضی برضائے الٰہی ہوں گے۔ بخلاف دنیاداروں کے کہ ایسے وقت پریشان ہوتے ہیں کہ ہائے اب کیا ہوگا' دل کسی کام میں نہیں لگتا' ہر وقت وہی دھن لگ جاتی ہے اور اہل اللہ مغموم بھی ہوتے ہیں اور اسی عین غم میں راضی بھی ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے دنبل نکل آیا اور ڈاکٹر نے یہ تجویز کیا کہ یہ بغیر شگاف کے اچھا نہ ہوگا تو وہ مریض بہت خوشی سے اس عضو کو نشتر زن کے سامنے کردے گا۔ دیکھئے اس وقت اس کو نشتر لگانے کی تکلیف بھی محسوس ہوگی مگر اس پر دل سے راضی ہے اور جانتا ہے کہ اس میں میری بہبودگی ہے۔ چنانچہ بعد نشتر لگانے کے وہ نائی انعام مانگتا ہے' حضور انعام لائیے' چنانچہ خوشی سے اس کو انعام دیتے ہیں اگر ناراض ہوتا تو انعام کیوں دیتا' اسی طرح اہل اللہ اگر بیمار ہوتے ہیں یا ان کا کوئی عزیز مرتا ہے تو تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر اندر سے دل ان کا ہر وقت باغ باغ ہے' کسی وقت پریشانی یا اضطراب نہیں بخلاف دنیاداروں کے کہ اگر کوئی بیٹا یا عزیز مرجاتا ہے تو حسرتیں اور ارمان آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس جی برباد ہوگئے' کیسا اچھا ہوتا کہ دس برس اور جیتا اور بعض تو اتنا بڑھتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی

شکایت کرنے لگتے ہیں نعوذ باللہ منہ اور خواص اہل اللہ کی تو یہ شان ہے ہی ان کے عوام میں بھی ایسے ایسے موجود ہیں کہ خواہ کچھ گزر جائے مگر ان کی زبان سے بجز شکر کے کلمات کے اور رضا کے کچھ نہیں نکلتا۔ یہاں تھانہ بھون میں ایک خان صاحب تھے اکثر بیچارے سخت تکلیف میں رہتے لیکن جب کوئی پوچھتا تو ہنس کر یہی کہتے کہ اللہ کی رحمت ہے۔

اہل اللہ کا مختلف مذاق

اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو اہل اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم کو بخار ہے سر میں درد ہے بات یہ ہے کہ بخار وغیرہ ظاہر کرنا دو طور سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ شکایت کے طور پر ہو اور قضائے الٰہی اور اپنی خواہش میں جو مزاحمت ہوتی ہے اور اپنی خواہش حاصل نہیں ہوتی اس لیے تنگ دل ہوتا ہے اور اپنا درد ظاہر کرتا ہے یہ تو مذموم ہے اور اس طور کا اظہار حضرات اہل اللہ میں نہیں ہوتا اور دوسری جہات اظہار مرض کی یہ ہے کہ اپنا عجز اور درماندگی اور قضا کے سامنے اپنی بیچارگی ظاہر کرنا مقصود ہے اور نیز مخاطب یعنی عیادت کرنے والے کا اکرام اور اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ منظور ہے اس لیے کہ جو شخص آپ کی عیادت کے واسطے آیا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ تمہارا درد معلوم کر کے تمہارا شریک حال ہو اور غمخواری کرے۔ اگر آپ نے خشک جواب دیا کہ جی اچھا ہوں یہ بد اخلاقی ہے اور یہ رضا نہیں ہے بلکہ بزبان حال آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایسے مضبوط ہیں کہ کوئی شے ہم کو از جارفتہ نہیں کر سکتی بعض اولیاء اللہ سے کسی نے پوچھا کہ اب تو آپ کی طبیعت اچھی ہے' فرمایا کہ نہیں لوگوں نے کہا کہ کیا آپ مرض ظاہر کرتے ہیں' فرمایا کہ کیا میں خدا کے سامنے پہلوان بنوں' عجز ظاہر نہ کروں' غرض حضرات اہل اللہ کا گو اس بارے میں بھی مذاق مختلف ہے لیکن یہ امر مشترک ہے کہ تنگی قلب میں ہرگز ہرگز نہ ہو گی اور دنیاداروں سے جب سنا ہے شکایت ہی کے کلمات سنے گئے ہیں بلکہ کفر و شرک تک کے کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں' مجھ کو تو ایسے کلمات سے اس قدر نفرت ہے کہ کان سن نہیں سکتے' غرض محبان دنیا کسی وقت بھی خدا تعالیٰ سے راضی نہیں ہیں' خواہ غم پیش آوے یا خوشی بخلاف اہل اللہ کے کہ غم کے وقت ان کی جب یہ کیفیت ہے تو خوشی کے وقت تو کیا کہنا ہے خوشی کے وقت ان کو خوشی بھی اوروں سے زائد ہوتی ہے اگر کوئی

شبہ کرے کہ جب انہوں نے سب کو چھوڑ دیا ہے تو ان کو دنیا کی خوشی کی بات سے خوشی کیوں ہوتی ہے' بات یہ ہے کہ خوشی کی بات سے دنیا داروں کی خوشی تو اور طرح کی ہے اور ان کی خوشی اور نوع کی ہے دنیا دار تو نفس نعمت ہی پر خوش ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھتے ہیں اور حضرات اہل اللہ اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ یہ عطائے محبوب ہے ان کا سرمایہ لذت عطائے محبوب ہے نہ کہ کھٹائی' مٹھائی' نمک مرچ اس لیے ان کو خوشی بھی اوروں سے زائد ہوتی ہے اگر عاشق کو محبوب کی طرف سے مثلاً انبہ ملے اور وہ کھٹا اور گلا ہوا ہو تو وہ اسی کو بھی اسی قدر کے ساتھ کھائے گا جیسے کہ اور میٹھے اور لذیذ کو کھاتے ہیں' غرض ہر نعمت میں ان کو اوروں سے زائد لذت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ عورت کے ساتھ ہم بستری میں بھی ان کو اوروں سے زیادہ لطف آتا ہے' ایک تو وجہ اس کی بیان ہو چکی اور دوسری وجہ اس کی عقلی بھی ہے وہ یہ کہ دنیا دار لوگ تو اپنی شہوت کو مختلف طریقوں سے نکالتے ہیں کچھ آنکھوں کے ذریعے سے کچھ کانوں سے' کچھ ہاتھوں سے' اب خرچ ہو کر جو باقی رہی وہ چونکہ بہت تھوڑی مقدار ہوتی ہے اس لیے لذت ان کو کم ہوتی ہے بخلاف دینداروں کے انہوں نے اپنی آنکھیں محارم سے پھوڑ لیں' قلب کو خطرات فاسدہ سے روکا' ہاتھ کو تھاما' اس لیے جو مادہ پیدا ہوا وہ اندر ہی رہا جب وہ اپنی بی بی سے ہم بستر ہوں گے تو ان کو بے حد لطف آئے گا۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا کا لطف بھی اگر ہے تو وہ بھی دیندار ہی کو ہے ان سے زیادہ کوئی خوش نہیں ہے۔

حکایت حضرت بہلول داناؒ

حضرت بہلول دانا نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے کیسا مزاج ہے' جواب دیا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ جو کام دنیا میں ہوتا ہے وہ اس کے حسب خواہش ہوتا ہے' بہلول اس جواب سے حیران ہوئے (اس لیے کہ یہ تو خدا تعالیٰ کی ہی شان ہے) فرمایا کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو جو کام دنیا میں ہوتا ہے سب اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے وہ کسی وقت پریشان نہیں ہوتے۔

کوئے نا امیدی مرد کامید ہاست

(نا امید ہونے کی کیا ضرورت ہے ابھی تو بہت امیدیں موجود ہیں)

لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے) ان کی شان ہوتی ہے اور کسی چیز سے تو ان کو کیا خوف ہوتا موت کہ جس سے سب بھاگتے ہیں اور نام سے اس کے ڈرتے ہیں اگر تصور بھی ہوجاوے تو دل دھڑ کنے لگے اس سے تو ان کو خوف ہے ہی نہیں بلکہ خوف کیا ان کو اس پر مسرت اور اس کی تمنا ہوتی ہے۔

ایک صاحب حال کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم
نذر کروم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تادر میکدہ شادان و غزل خواں بروم

(میں اس دن کتنا خوش ہوں گا جب اس ویران دنیا سے رخصت ہوں گا، محبوب حقیقی کی تلاش میں اور اسی کی رضا کی طلب میں روانہ ہوجاؤں گا، میں نے منت مانی ہے کہ اگر کسی دن مجھے وہ گھڑی نصیب ہو تو میں خوشی اور مسرت میں گاتا ہوا جاؤں گا)

اور اگر کوئی شخص کہے کہ جناب فرصت میں باتیں بناتے ہیں جب مرنے کا وقت آیا ہوگا اس وقت یہ تمنائیں معلوم ہوگئی ہوں گی جواب یہ ہے کہ عین موت کے وقت بھی ان کی یہی حالت دیکھی گئی ہے چنانچہ ایک بزرگ عین موت کے وقت کہتے ہیں:

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ گھڑی آ پہنچی کہ میں عریاں ہوجاؤں یعنی جسم کے لباس کو اتار دوں اور سراسر جان بن جاؤں)

حکایت حضرت سلطان الاولیاء

اگر کوئی کہے کہ یہ تو عین موت کے وقت کی حالت ہے ممکن ہے کہ بعد مرنے کے حقیقت معلوم ہوئی ہو اس لیے مرنے کے بعد کا بھی ایک قصہ سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو ان کے ایک خلیفہ پر بیحد غم طاری ہوا، جب جنازہ اٹھا کر لے چلے تو ان کے منہ سے بے اختیار یہ شعر نکلے۔

سرو سیمینا بصحرا مے روی سخت بے مہری کہ بے ما می روی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(ہمارے محبوب جو فخر گلشن تھا وہ بیابان کی طرف روانہ ہو رہا ہے یہ کیسی بے محبتی کی بات ہے کہ ہم نشیں چھوڑ کر جا رہا ہے اے محبوب تیرا چہرہ پورے عالم کا قبلہ دیدار تھا تو کس کا دیدار کرنے جا رہا ہے)

لکھا ہے کہ حضرت سلطان جی کا ہاتھ کفن سے باہر نکلا یعنی اس حالت میں بھی وجد طاری ہوا اور وجد کمال اطمینان کے وقت ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ کو دنیا میں برزخ میں آخرت میں کہیں غم نہیں وہ ہر وقت خوش ہیں۔

عاشقاں را روز محشر با قیامت کار نیست عاشقاں راجز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن بھی بھلا قیامت سے کیا کام ان کو تو جمال یار ہی مطلوب و مقصود ہے اور وہ محشر کو بھی جمال یار ہی کے طلب ہوگی)

تحصیل علم واجب ہے

یہ ہے بشریٰ جس کی نسبت فرمایا ہے "لَهُمُ الْبُشْرٰى" الحمدللہ میرا دعویٰ دلائل عقلیہ سے نقلیہ سے مشاہدہ سے ہر طرح ثابت ہوگیا' یعنی یہ امر بالکل واضح ہوگیا کہ توجہ الی اللہ ہی وہ دولت ہے کہ جس سے دنیا اور آخرت دونوں ملتی ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: "فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ" یعنی میرے ان بندوں کو بشارت دیدیجئے جو بات توجہ سے سنتے ہیں پھر اچھی بات کا اتباع کرتے ہیں اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ تحصیل علم واجب ہے اس لیے کہ استماع قول کا حاصل علم ہی حاصل کرنا ہے اس لیے ضروری ہے کہ توجہ الی اللہ کے ساتھ علم دین بھی حاصل کرو' میں یہ نہیں کہتا کہ سب مولوی بنو بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسائل سے واقفیت حاصل کرو' اردو کے رسائل ہی سہی اور اب تو بہت کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے اور اگر اردو نہ پڑھ سکو تو کم از کم ان کتابوں کو سن ہی لو۔ آگے ارشاد ہے: "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ." یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ عقل والے ہیں' ہدایت کا استعمال اکثر نقل میں اور لب کا عقل میں آتا ہے مطلب یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً توجہ الی اللہ اور تحصیل علم دین ضروری ہے۔ عقلاً تو اس لیے کہ عقلاء زمان دنیا میں جو کام کرتے ہیں راحت کے لیے کرتے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ راحت توجہ الی اللہ میں ہے اور نقلاً خود ثابت ہی ہے' نیز "هداهم الله" ایک بشریٰ عاجلہ ہے اور نہایت عظیم خوشخبری ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دل خوش کن بات نہیں ہے اس لیے دلائل صحیحہ سے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں' بے راہ نہیں ہیں تو اس سے بڑا بھاری اطمینان ہوتا ہے اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

صراط مستقیم پر ہونا بہت بڑی نعمت و بشارت ہے

میں ایک مرتبہ سہارنپور سے لکھنؤ جانے کے واسطے ریل میں سوار ہوا میرے سوار ہونے کے ساتھ میرے ایک ہم وطن بھی سوار ہوئے اور اسی درجہ میں بیٹھے جس درجہ میں میں تھا، میں سمجھا کہ یہ بھی لکھنؤ جاتے ہوں گے میں دوسرے ساتھیوں سے جو پہنچانے آئے تھے باتیں کرتا رہا، اس خیال سے کہ یہ تو اب ریل میں آ ہی گئے ان سے تو گاڑی چھوٹنے کے بعد فراغت سے باتیں کریں گے، اس لیے ان سے کوئی بات نہیں کی جب ریل چھوٹ گئی اس وقت میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں، کہا میرٹھ، میں نے کہا کہ جناب یہ گاڑی تو لکھنؤ پہنچے گی میرٹھ تو دوسری گاڑی جاوے گی، یہ سن کر حیران ہو گئے اور جاڑے کا موسم تھا، نہ رضانہ کمبل وہ اس خیال میں تھے کہ چند گھنٹہ میں میرٹھ چلا جاؤں گا، اس زمانہ میں میرٹھ میں انہوں نے ایک اخبار جاری کیا تھا جب یہ سنا کہ لکھنؤ جاوے گی، سخت پریشان ہوئے، میں نے کہا کہ اب پریشانی سے کیا فائدہ، گاڑی تو اب رڑکی سے ورے کہیں ٹھہرے گی، نہیں اب خواہ مخواہ آپ پریشان ہوتے ہیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، باتیں کرلو، اس وقت میری تو یہ حالت تھی کہ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی تھی میری مسرت بڑھتی تھی اس لیے کہ سمجھتا تھا کہ مقصود قریب ہوتا جاتا ہے اور میں راہ پر چل رہا ہوں اور ان کی پریشانی بڑھتی تھی اس لیے کہ مقصود سے دور ہوتے جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میں بے راہ چل رہا ہوں، اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اپنے راہ پر ہونے کے علم سے بھی بڑی مسرت ہوتی ہے۔ آخرت کی نعمت تو جب ملے گی لیکن اگر ہم کو یہاں دلائل صحیحہ سے معلوم ہو جاوے کہ ہم راہ پر ہیں۔ یہ بھی بڑی بشارت اور نعمت ہے۔ یہاں ہی سے "اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ." (یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب) کے معنے سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ ہدایت سے مراد تو اس آیت میں دنیا میں اس کا علم ہونا ہے جو کہ بشری عاجلہ ہے اور فلاح سے مراد اخروی فلاح ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ توجہ الی اللہ نہایت ضروری ہے ہم اور آپ مل کر توجہ الی اللہ کو اپنا سرمایہ سمجھیں اور اس کے مراتب میں سے اگر اعلیٰ نہ ہو تو متوسط درجہ (یعنی جو کام کرو حق تعالیٰ کی رضا کے لیے کرو یا کم از کم خلاف رضا نہ ہو) تو ضرور حاصل کریں۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماوے۔ آمین

خواص الخشیۃ

خوف حق کے خواص و آ ثار کے متعلق تھانہ بھون مکان سراج الحق میں ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۰ ہجری کو خطاب فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد. فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡم. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَیۡبِ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّاَجۡرٌ کَبِیۡرٌ وَاَسِرُّوۡا قَوۡلَکُمۡ اَوِجۡھَرُوۡا بِہٖ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ. اَ لَایَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ. (سورۃ الملک آیت نمبر ۱۲ تا ۱۴)

ترجمہ: (بے شک جولوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر کہو اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے کیونکہ وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہیں' بھلا کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے)

یہ تین آیتیں سورۃ ملک کی ہیں حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں ایک بہت بڑے عمل کی فضیلت بیان فرمائی ہے' گویا کہ وہ عمل مفتاح الاعمال ہے اور اسی مضمون کی تاکید کیلئے کچھ مضامین بڑھائے ہیں اور وہ عمل خشیت اور خوف یعنی خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے پس ان آیتوں میں اپنے سے ڈرنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ یہ حاصل ہے اس مقام کا اجمالاً۔

خشیت اعمال صالحہ کی کنجی ہے

اور حقیقت اس فضیلت کی اس کے اثر میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے اور وہ اثر ہی سبب ہوا ہے اس وقت بیان کرنے کا اور وہ اثر یہ ہے کہ یہ عمل یعنی خشیت کنجی ہے عمل صالح کی اور وہ دو عمل ہیں' طاعات کو اختیار کرنا اور معاصی کو ترک کرنا اور اگر کوئی کہے کہ گناہ

نہ کرنا تو کوئی عمل نہیں اس لیے کہ عمل تو کسی شے کا کرنا ہے اور یہاں نہ کرنا ہے۔ مثلاً ہم اس وقت بیٹھے ہیں نہ چوری کر رہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں نہ کسی پر ظلم کر رہے ہیں تو یہ تو کوئی عمل نہیں پھر اس کو عمل صالح کے تحت میں داخل کرنا کس وجہ سے ہے۔ بات یہ ہے کہ معاصی نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک تو بلا تعلق عزم کے اس حیثیت سے تو واقعی وہ عمل نہیں بلکہ عدم العمل ہے اور دوسری صورت یہ کہ ترک کا عزم کرنا اس اعتبار سے وہ بھی ایک عمل ہے اسی واسطے اس کو کف النفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس پر اجر بھی ہے۔

اعمال کی دو قسمیں

خلاصہ یہ کہ عمل کی دو قسمیں ہیں طاعات کا اختیار کرنا اور معاصی سے اپنے نفس کو روکنا خشیت ان دونوں کی مفتاح ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طاعت نہ کرنا اور گناہ کرنا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس وقت خوف خداوندی غالب نہیں ہوتا۔ غلبہ خوف کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ آدمی کسی طاعت کو چھوڑ دے یا کوئی گناہ کرے۔

خوف عقاب

دیکھ لیجئے کہ اگر استاد یا پیر یا باپ سامنے موجود ہو تو آدمی ان کے سامنے کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کرتا تو اس کی کیا وجہ ہے۔ خوف ہی تو ہے جو اس کو مانع ہو رہا ہے اور یہ خوف دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو خوف عقاب کا یا خوف ناراضی کا یعنی یا تو یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر میں اس امر کا ارتکاب کروں گا تو مجھ کو سزا ہوگی اور یا یہ ڈر ہوتا ہے کہ میرا آقا میرا مولا مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ کسی ناگوار کے احتمال سے خوف ہوتا ہے اور وہ امر ناگوار ایک سزا ہے ایک سخط مولیٰ۔ پس اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ خشیت مامور بہ کے کرنے اور منہی عنہ کے اجتناب کے لیے مفتاح ہے۔ چنانچہ دنیا کے معاملات میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں محکوم جو حاکم کی مخالفت نہیں کرتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے ان ہی دو امر کے خوف سے شاگرد جو استاد کی اطاعت کرتا ہے اس کی وجہ بھی یہی خشیت ہے مرید جو مشائخ سے سرتابی نہیں کرتے اس کا باعث بھی یہی ہے اسی طرح خالق تعالیٰ شانہ میں بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب کبھی مخالفت ہوگی یا کسی فرض و واجب کا ترک ہوگا اس وقت خدا تعالیٰ کا خوف غالب نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ ہم

لوگ گناہوں پر دلیر ہیں اور اگر کوئی شبہ کرے کہ پھر چاہیے کہ ہم مومن بھی نہ رہیں اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ جیسے یاس کفر ہے اسی طرح خوف نہ ہونا بھی کفر ہے۔

خوف کے مراتب

حقیقت یہ ہے کہ خوف کے مراتب مختلف ہیں ایک خوف وہ ہے جو درجہ اعتقاد میں ہو یہ تو ادنیٰ درجہ ہے اور ایک وہ ہے جو درجہ حال میں ہو اور جبکہ مدار ایمان کا خوف پر ہے تو ایمان کے بھی اسی طرح دو مرتبے ہیں ایک وہ ایمان جو صرف درجہ اعتقاد تک محدود رہتا ہے یہ تو عوام کا ایمان ہے کہ جب قلب میں ٹٹولتے ہیں تو قیامت جنت دوزخ حساب کتاب سب کا حق ہونا قلب میں پاتے ہیں اور تحریک و تذکیر و ترغیب و ترہیب کے وقت ہی متحضر ہو جاتا ہے اور باقی اوقات میں اس سے غافل ہیں سو یہ ایمان اعتقادی موقوف ہے خوف اعتقادی پر اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ جو اعتقاد سے متجاوز ہو کر درجہ حال میں آ گیا ہے یہ خواص کا ایمان ہے کہ ایک خاص حالت ان پر رہتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ علوم اجمال کے درجہ میں ان کو ہر وقت متحضر رہتے ہیں کسی وقت نہیں بھولتے ان کو ایک ملکہ راسخہ حاصل ہو جاتا ہے جس کو یادداشت کہا جاتا ہے جیسے کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو دیکھئے کہ ہر وقت اس کا خیال رہتا ہے یا کسی مقدمہ کا خوف ہو جاتا ہے ہر وقت اس کا دھیان رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بیٹھے لیٹے کھانا کھانے میں سونے میں کسی وقت اس کو نہیں بھولتا یا کوئی مرض وبائی پھیلتا ہے تو بعض لوگوں کو ہر وقت اسی کا اندیشہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض تو اس خوف کی وجہ سے مر بھی جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے تو وہ کسی وقت بھولتا نہیں اور یہ ایمان حالی موقوف ہے' خوف حالی پر' بس یہ شبہ جاتا رہا اور اس استحضار کا جو ایمان حالی و خوف حالی سے ہوتا ہے یہ اثر ہے کہ آدمی اس سے ہر وقت متاثر رہتا ہے ایسے بندے مقبول اور اہل نسبت کہلاتے ہیں ایسے لوگوں کا ایمان ہر وقت تازہ رہتا ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

تازہ کن ایمان نہ از گفت زباں ۔۔۔ اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

(یعنی ایمان کو صدق دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں تم نے تو باطن میں خواہشات نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے)

ایمان تازہ رکھنے کا حکم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایمان کے تازہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان حضرات کی حالت وعمل بالکل اسی کے موافق رہتی ہے اور اسی لیے وہ ہر وقت خدمت حق کے لیے تازہ رہتے ہیں، کسی وقت ملول نہیں ہوتے۔ یوں طبعی تکان تو ان حضرات کو بھی بمقتضائے بشریت ہو جاتا ہے مگر قلبی تکان نہیں ہوتا جیسے شوقین طلبہ کسی وقت ملول نہیں ہوتے یعنی جی نہیں اترتا تھک جاتے ہیں اور جیسے کسی محبوب کی طلب میں عاشق ہر وقت تازہ رہتا ہے تھک بھی جاتا ہے اور اسی تازگی کے سبب کبھی یاس اور ناامیدی ان کے پاس نہیں آتی۔ جیسے مولانا فرماتے ہیں:

کوئے نومیدی مرد کامید ہاست   سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

(یعنی ناامیدی کی راہ مت چلو اللہ تعالیٰ سے بہت امید ہیں ظلمت کی طرف مت جاؤ بہت سے خورشید بھی ہیں)

خاصیت ایمان

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایمان کی خاصیت ہے کہ اس سے ہر وقت تازگی بشاشت انشراح مومن کے قلب میں رہتا ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ.'' (سو جو لوگ ایمان دار ہیں اس صورت نے تو ان کو ایمان میں ترقی دی ہے اور خوش ہو رہے ہیں) اگر کوئی کہے کہ اہل سلوک کو قبض بھی تو پیش آتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ تازگی مذکور اور آثار ایمان کے ان کے قلب میں اس وقت بھی ہوتے ہیں لیکن ان کو قبض کے وقت اس طرف التفات نہیں رہتا۔ اسی واسطے جب وہ کسی محقق سے رجوع کرتے ہیں اور وہ ان کو حقیقت سے آگاہی دیتا ہے تو پھر وہی بشاشت پانے لگتے ہیں کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اسی بشاشت سابقہ کا ظہور ہو جاتا ہے۔ غرض ان حضرات پر اس حالت کا غلبہ رہتا ہے۔ گو ضعف کسی وقت ہو جاتا ہے لیکن مطلق تازگی ہر وقت رہتی ہے، غرض جس طرح ایمان کے دو درجے ہیں ایک اعتقاداً اور ایک حالاً اور اسی طرح خوف چونکہ

مدار ایمان کا ہے اس کے بھی ایسے ہی دو درجے ہیں ایک درجہ اعتقاد کا اور ایک درجہ حال کا کہ ہروقت اس کا اثر غالب رہے اور خوف اعتقادی کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص جو مجسٹریٹ ضلع اور عدالت اور جیل خانے سے غائب ہے کبھی اس کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو حاکم سے ڈرتا تو وہ بھی ہے لیکن یہ خوف اعتقاد میں ہے اس پر حالت کا غلبہ نہیں اور ایک وہ شخص کہ حاکم اور مجلس حکم اس کو ہروقت پیش نظر ہے اور جیل خانہ اور قیدی اور ہتھکڑی ہروقت اس کے سامنے ہے اس پر جس خوف کا غلبہ ہوگا یہ خوف حالی ہے۔ پس عوام کی نسبت یوں نہ کہیں گے کہ خوف نہیں ہے خوف ضرور ہے لیکن اعتقادی ہے جو نفس ایمان کے لیے کافی ہے۔ البتہ جیسا خوف ہے اسی درجہ کا ان میں ایمان بھی ہے اب کوئی اشکال نہیں رہا۔

کمال ایمان کی نفی

اور یہاں سے اس حدیث کے معنی بھی معلوم ہو گئے کہ حدیث میں آیا ہے: "لا یزنی الزانی وھو مومن ولا یسرق السارق وھو مومن"[1] (یعنی نہیں زنا کرتا کوئی زنا کرنے والا اس حال میں کہ وہ مومن کامل ہو اور نہیں چوری کرتا کوئی چوری کرنے والا اس حال میں کہ وہ مومن کامل ہو یعنی چوری وزنا کی حالت میں ایمان کامل نہیں رہتا) یعنی جس وقت گناہ کیا گیا اس وقت چونکہ خوف درجہ حال میں نہیں ہے اس لیے ایمان بھی اسی درجہ کا منفی ہے پس اس حدیث میں کمال ایمان کی نفی ہے نہ کہ نفس ایمان کی نفی اسی لیے حضرات شراح حدیث اہل سنت نے اس حدیث میں مومن کے معنی مومن کامل کہے ہیں جس کو طلباء محض تاویل سمجھتے ہیں لیکن اس تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حقیقت پر محمول ہے اس لیے کہ تقسیم کا اپنی ہر قسم پر صادق آنا حقیقتاً ہی ہوتا ہے بلکہ عرفاً تو مطلق کا اطلاق اکثر کامل ہی پر ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا ایک لقمہ کو کوئی نہیں کہتا تو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ادنیٰ ایمان کو ایمان ہی نہ کہا جاتا مگر یہ محض حق تعالیٰ کا فضل ہے ایسے ایمان کو بھی انہوں نے ایمان میں شمار کیا ہے غرض وہ اشکال بلواحقہ بالکل صاف ہو گیا اور یہ تمام تر تقریر حدیث کے متعلق اہل علم کے یہاں موجود ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے اب میں اصل مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸، کنز العمال: ۱۳۰۹)

تقریر ابتدائی سے یہ ثابت ہوا کہ جب آدمی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس وقت خوف نہیں ہوتا یعنی ایسا خوف نہیں ہوتا جیسا کہ ایک کلکٹر کو دیکھ کر چپڑ اسی کو ہوتا ہے اور جیسے کسی کو یہ خبر ملی ہو کہ تمہارے گھر کا محاصرہ ہو گیا ہے۔ اگر چہ وہ جانتا ہے کہ میں بری ہوں اور اس محاصرہ سے کچھ نہ ہوگا مگر جو حالت خوف کی اس وقت ہوتی ہے گناہ کرتے ہوئے ایسی نہیں ہوتی 'افسوس ہے کہ ایک ادنیٰ حاکم جو خدا کے سامنے کسی درجہ میں بھی نہیں اس کا تو اتنا خوف اور مالک حقیقی اور احکم الحاکمین کا خوف کچھ نہیں کہ کس دلیری سے اس کی مخالفت کرتے ہو۔

شفاعت کبریٰ

صاحبو! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ تم کو کچھ عذاب بھی نہ دیں صرف کھڑا کر کے اتنا پوچھ لیں کہ ارے ظالم تجھ کو ہمارا اتنا بھی خوف نہ تھا کہ جتنا اپنے چھوٹوں سے ہوتا ہے تو اس وقت جو ذلت و شرمندگی ہوگی اسی کا خوف گناہ سے بچنے کے لیے کافی ہے کیونکہ ایسے موقع پر آدمی یہ چاہا کرتا ہے کہ بلا سے دوزخ میں چلا جاؤں لیکن یہاں سے مجھ کو خلاصی ہو چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے جب سب اولین و آخرین قبور سے اٹھائے جائیں گے اور مجرمین کو سخت ذلت و پریشانی ہوگی تو سب بے قرار ہوں گے کہ کسی طرح یہاں سے نجات اور خلاصی ہو اور آپس میں مشورہ کریں گے کہ کیا تدبیر کریں چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہوگا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ مقبول بندے اور بے گناہ ہیں ان کی خدمت میں عرض کریں تا کہ وہ ہماری اس بات میں شفاعت کریں۔ پس سب جمع ہو کر آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے اور عرض کریں گے کہ آپ صفی اللہ ہیں اور آپ کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے آپ دعا فرمایئے اور شفاعت فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہاں سے خلاصی دیں تو وہ فرمائیں گے کہ میرا یہ منصب نہیں ہے اور شجر کے کھانے کا عذر فرمائیں گے پھر نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی یہی جواب دیں گے اور اپنے اپنے عذر ذکر کریں گے۔ حتیٰ کہ فخر عالم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی خدمت میں آئیں گے، آپ سب کی شفاعت فرمائیں گے کہ اس میدان سے نجات ہو یہ شفاعت کبریٰ کہلاتی ہے اس کے بعد سب کو موقف سے نجات ہوگی اور حساب و کتاب شروع ہوگا اور اس میں مومنین

وکافرین سب داخل ہیں یہ حدیث کا حاصل ہے اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سب مومنین وکافرین جو اس مقام سے خلاصی چاہیں گے اس کی کیا وجہ ہے یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ اس وقت سب کو یہ گمان ہوگا کہ ہم سب یہاں سے چھوٹ کر بہشت میں چلے جائیں گے اس لیے کہ حقائق وہاں منکشف ہوں گے' مغیبات مشاہدہ ہوں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" (سواب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ غفلت اٹھادیا' سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے) اور کفار کو معلوم ہوگا کہ ہم معذب ہوں گے تو پھر خلاصی پا کر دوزخ میں جانا کیوں گوارہ کیا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ چونکہ وہاں اولین وآخرین جمع ہوں گے ان سب کے سامنے رسوا ہونے سے بچنا چاہیں گے۔ طبعی بات ہے کہ آدمی رسوائی سے بچنے کے لیے سزا اور تکلیف کو اختیار کر لیتا ہے اور عام رسوائی میدان قیامت میں ہوگی' دوزخ میں نہ ہوگی۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دوزخ میں ہر کافر کو ایک صندوق میں بند کر کے الگ الگ آگ میں دفن کر دیا جائے گا پھر وہاں تاریکی بھی ہوگی کوئی ایک دوسرے کو نہ دیکھے گا۔ "وَوَجَدُوْا مَاعَمِلُوْا حَاضِرًا" (جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب موجود پائیں گے) اس کی تفسیر میں حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ گناہ کو اس کی صورت میں دکھلایا جائے گا۔ مثلاً اہل محشر کو یہ معلوم ہوگا کہ چور نقب دے رہا ہے' زانی زنا کر رہا ہے اور اس کو بعید نہ سمجھا جائے' دیکھئے بائیس کوپ میں اچھی خاصی دوڑتی ہوئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ وہ تلوار لگی اور سر کٹ گیا اور گولا پھٹا اور توپ چلی۔ جب مخلوق کو ایسی قوت دی ہے کہ وہ واقعات گزشتہ کو ہو بہو دکھلا دیتے ہیں تو کیا خداوند تعالیٰ گناہوں کو ان کی صورت میں نہیں دکھلا سکتے' ضرور اس سے زیادہ پر قادر ہیں۔

صورت گناہ

اور یہ تفسیر حضرت استاذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت فرمائی تھی کہ جب یہ آلہ ایجاد بھی نہ ہوا تھا۔ حضرات یہ مضمون تو بڑے خوف کا ہے' ہم لوگ جو مولوی بنے ہوئے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں ہماری یہ حالت ہے:

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر میکنند ۔۔۔ چوں بخلوت میرسند آں کار دیگر میکنند

(یعنی بے عمل واعظ محراب ومنبر پر رونق افروز ہو کر دوسروں کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں یعنی خلاف شریعت کام کرتے ہیں)

پس تو ہمارے وہ اعمال اگر اس طور سے حاضر کیے گئے تو کس قدر رسوائی ہوگی اور جو ہمارے وعظوں کے مخاطب تھے وہ کیا کہیں گے کہ یہ ہمارے ناصح ہیں، باتیں کیا کرتے تھے اور کام کیا کرتے تھے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تفسیر ظنی ہے تو لیجئے میں دوسری دلیل رسوائی کی پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرشتے پکار پکار کر کہیں گے:

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

(اعمال کے گواہ فرشتے یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں، سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی زیادہ لعنت ہے جو کہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ یعنی دین سے روکتے تھے) اور اسی واسطے اس دن کو اللہ تعالیٰ نے یوم التناد بھی فرمایا ہے۔ غرض وہاں یہ رسوائیاں ہوں گی پس اسی رسوائی سے بچنے کے لیے اس میدان سے کفار بھی خلاصی چاہیں، اگر چہ جانیں گے کہ یہاں سے سیدھے دوزخ میں جائیں گے مگر اس حیثیت خاص سے اس کو آہون سمجھیں گے تو صاحبو! اگر قیامت کے متعلق ہم کو یہ بھی اطمینان دلایا جائے کہ ہم تم کو دوزخ میں نہ بھیجیں گے لیکن یہ ضرور پوچھتے رہیں گے کہ نالائق تو نے یہ کیا کیا کہ جس قدر اپنے چھوٹوں سے ڈرا کرتا تھا اتنا بھی ہم سے نہیں ڈرا اور وہ پوچھنے کا وقت بھی ہوگا کہ حق تعالیٰ کے تمام صفات و جاہ وجلال اور اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور قہاریت اور اپنی مملوکیت و مقہوریت پیش نظر ہوگی تو واللہ یہ بھی مر جانے کی جگہ ہے۔ چہ جائیکہ یہ سوال بھی ہو اور دوزخ بھی ہو اور روحانی ذلت بھی ہو اور جسمانی کلفت بھی ہو تو کیا یہ مجموعہ بھی خوف کے لیے کافی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحصیل خوف کے لیے بس اتنا سوچ لینا بھی کافی ہونا چاہیے کہ اگر تجھ سے یہ سوال ہو گیا تو تیرے پاس کیا جواب ہے اور مجموعہ تو بہت زیادہ درجے میں اکفی ہونا چاہیے۔ پس اپنے دل میں

خوف پیدا کرو جب خوف پیدا ہوگا تو پھر کوئی گناہ نہ ہوگا اس لیے کہ خوف ہی نہ ہونے کی وجہ سے سب خرابیاں ہیں، جتنا جتنا خوف پیدا ہوتا جائے گا اسی درجہ کی خرابیاں دفع ہوتی جائیں گی کیونکہ خوف کے مراتب مختلف ہیں بعض کو تو اتنا ہی خوف ہوتا ہے کہ وہ خوف ان کو صرف کفر سے باز رکھتا ہے اور بعض کو کبائر سے روکتا ہے اور بعض کو صغائر سے بھی ہٹا دیتا ہے اور بعض پر ایسا خوف ہوتا ہے کہ خلاف اولیٰ سے بھی وہ بچتا ہے اور بعض جو حیا کی وجہ سے بچتے ہیں تو حیا بھی ایک قسم کا خوف ہی ہے، حیا کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی واقع میں ایک خوف کی ہی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ خوف اس کا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا کیا کہے گا، غرض خوف کہو یا حیا اس کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ جب مقبولان الٰہی پر جب اس کا غلبہ ہوتا ہے تو بعضے جائز کام بھی وہ نہیں کر سکتے اور کبھی کرتے ہیں تو ان کو تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ پاؤں پھیلائے ہوئے خلوت میں بیٹھے تھے، الہام ہوا کہ او بے ادب ہمارے سامنے پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔

ملامت کی قسمیں

اس پر اگر کوئی طالب علم شبہ کرے کہ پاؤں پھیلانا جائز ہے یا نہیں اگر نہیں تو دلیل کیا ہے اور اگر جائز ہے تو عتاب کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ بلا شبہ جائز ہے لیکن ملامت کی قسمیں مختلف ہیں۔ یہ ملامت گناہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ملامت خصوصیت کی وجہ سے ہے اور اگر یہ شبہ ہو کہ ہم پوچھتے ہیں کہ اس الہام کو اگر نہ مانیں تو گناہ ہوگا یا نہیں، اگر نہ ہوگا تو ملہم اور غیر ملہم میں کیا فرق ہوا عوام کو بھی گناہ نہیں ہوتا اس کو بھی نہیں ہوا۔

الہام کی مخالفت سے دنیا کا ضرر ہوتا ہے

پھر خصوصیات کیا ہوئی اور اگر ہوتا ہے تو الہام بھی حجۃ شرعیہ ہوا حالانکہ وہ حجۃ شرعیہ نہیں اس کا جواب نہایت قابل قدر ہے وہ یہ ہے کہ الہام کی مخالفت سے گناہ تو نہیں ہوتا ہے مگر دنیا کا ضرر ہو جاتا ہے اور دنیا کے ضرر کی دو قسمیں ایک قسم تو یہ ہے کہ مال یا جان کا ضرر ہو جائے۔ سو الہام کی مخالفت میں کبھی یہ ضرر بھی ہو جاتا ہے چنانچہ ایک بزرگ کسی سے ملنے کے لیے چلے، الہام ہوا کہ مت جاؤ، بیٹھ گئے، پھر چلے پھر الہام ہوا کہ مت جاؤ، تیسری بار اٹھے تھے کہ

ٹھوکر لگی اور گر پڑے، بہت چوٹ لگی اس کو بہت تعجب ہوا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ شخص بدعتی تھا، اگر یہ بزرگ وہاں جاتے تو عوام کے دین میں فتنہ ہوتا' دوسری قسم دنیا کے نقصان کی یہ ہے کہ ذوق وشوق میں کمی آ جائے اور الہام کی مخالفت سے زیادہ اسی نوع کا نقصان ہوتا ہے اور ذوق وشوق کو جو دنیا کی شے کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نفسانی کیفیت غیر مختص باہل الدین ہے گو وہ بعض احوال میں معین الدین بھی ہو مگر مطلوب بالذات نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ نافع ہوتا ہے جیسے کوئی نماز پڑھتا ہو لیکن نماز میں اس کا جی نہیں لگتا لیکن وہ جبر کر کے نفس پر نماز پڑھتا ہے یہ شخص اس حالت کے اعتبار سے اس سے افضل ہے جس کو ذوق وشوق ہو کیونکہ یہ زیادہ مجاہدہ کر رہا ہے اور اسی واسطے ثواب بھی اس کا زیادہ ہے اگر کوئی کہے کہ پھر ذوق وشوق کیوں مطلوب ہے بات یہ ہے کہ خود نفس پر یہ اعتماد نہیں ہے کہ ہر وقت کام کرے گا اور جب اس کے اندر ایک محرک یعنی ذوق وشوق پیدا ہو جاتا ہے تو طاعات آسانی سے ہونے لگتی ہیں۔ پس ذوق وشوق کو خود قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں لیکن بعض احوال میں معین ہو جاتا ہے غرض فی نفسہ یہ دنیا کی چیز ہوئی پس اگر یہ ذوق وشوق کم ہو جائے گا تو یوں کہیں گے کہ دنیا کا نقصان ہوا اس لیے کہ نفع عاجل جو دین کا جزو نہ ہو وہ دنیا ہی کا نفع ہے اور دین کا نقصان وہ کہلاتا ہے جس پر کوئی سزا یا وعید یا حرمان ثواب ہو اور ذوق وشوق ایسی چیز نہیں۔ پس مخالفت الہام سے کبھی کبھی اس قسم کا نقصان ہو جاتا ہے غرض ان بزرگ پر جو پاؤں پھیلانے پر عتاب ہوا پس اسی وقت ان بزرگ نے پاؤں سمیٹ لیے اور ساری عمر نہیں پھیلائے۔ یہ تو ایک پرانے بزرگ کا واقعہ ہے نیا واقعہ لیجئے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ادب اور حیا

حضرت حاجی صاحب قلبہ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک خاص خادم بیان کرتے تھے کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ جب لیٹتے تھے پاؤں نہ پھیلاتے تھے' اول اول تو میں سمجھا کہ شاید کوئی اتفاقی بات ہو گی مگر جب مدتوں تک اسی طرح دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ ایسا قصداً کرتے ہیں' میں نے پوچھا کہ حضرت اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ پاؤں نہیں پھیلاتے' فرمایا ارے باؤلے اپنے محبوب کے سامنے کوئی پاؤں بھی پھیلایا کرتا ہے۔

اور ایک دوسری حکایت ایسے ہی حیا اور ادب کی اور لیجئے وہی خادم کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت قدس سرہ کے واسطے ایک شخص نے سیاہ رنگ کا جوتہ بھیجا تو حضرت نے اس کو پہنا نہیں' میں نے عرض کیا کہ حضرت لوگ تو آپ کے لیے اس واسطے بھیجتے ہیں کہ آپ اس کو استعمال فرمائیں۔ فرمایا کہ اس کا رنگ سیاہ ہے اور جب سے مجھ کو خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ معلوم ہوا ہے تب سے میں نے سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا اس لیے کہ خلاف ادب معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح جب سے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا غلاف سبز دیکھا ہے سبز رنگ کا جوتا نہیں پہنا۔ پس ان حضرات پر خوف اور حیا کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ مباحات تک کو ترک کر دیتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارے تمام امراض کا سبب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں خوف نہیں ہے اس لیے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے اور گو یہ خوف واجب ہے مگر میں نے بجائے دلائل وجوب کے محض فضیلت کی آیت اس لیے اختیار کی ہے کہ فضیلت سے زیادہ رغبت پیدا ہوتی ہے اور ترغیب کا اثر بہ نسبت ترہیب کے اکثر طبائع ضعیفہ میں زیادہ ہوتا ہے اور آج کل طبائع ضعیفہ کی کثرت ہے۔ پس ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ" (یعنی جو لوگ اپنے رب سے غیب میں ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے)

خوف کا اعتدال

اب یہاں یہ امر قابل غور اور نتیجہ خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے **یخشون** کا تعلق لفظ **ربھم** سے فرمایا' یعنی یہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور **یخشون اللّٰہ** نہ فرمایا۔ اس میں تعدیل خوف کی طرف اشارہ ہے' مخلوق کے کلام میں ایسی رعایات نہیں ہوتی ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر کا نہیں خالق کا کلام ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خوف کے اندر دو خاصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ گناہوں سے روکتا ہے جیسے مدلل پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تو جب ہے کہ خوف درجہ اعتدال میں ہو اور دوسرا خاصہ یہ ہے کہ طاعت سے بھی روک دیتا ہے۔ یہ اس وقت ہے کہ فوق الحد ہو دنیوی امور میں ہم اس کی نظائر بکثرت دیکھتے ہیں کہ جب کسی امر کا زیادہ خوف ہوتا ہے تو کام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کوئی مضمون لکھ رہا ہو اور کوئی ایسا شخص جس کو وہ اپنے استعداد میں زیادہ سمجھتا ہو دیکھنے لگے تو ہرگز نہ لکھا جائے گا'

امتحان میں وہ طلباء جن پر ممتحن کا خوف غالب ہو جاتا ہے ناکام ہو جاتے ہیں۔ علی ہذا بہت سے نظائر سے یہ امر ثابت ہے کہ غلبہ خوف میں کام نہیں ہوتا جیسا کہ اگر بالکل خوف نہ ہو تو کام نہیں ہوتا اور اسی لیے زندگی میں حکم ہے: "اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا" (اپنے رب سے ڈرو) یعنی خشیت اور مرنے کے وقت ارشاد ہوتا ہے: "لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ" (تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو) اور یہی منشاء ہے اس ارشاد کا کہ جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ زندگی میں تو خوف کا غلبہ ہونا چاہیے تا کہ گناہوں سے بچا رہے کیونکہ وہ وقت عمل کا ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ ہونا ضرور ہے اس لیے کہ وہ وقت لقاء حق کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید لے کر ملنا چاہیے تا کہ "بمقتضائے انا عندظن عبدی بی"[1] (یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) یہ شخص مورد رحمت ہو لیکن غلبہ خوف سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حد سے متجاوز ہو جائے' یہاں غلبہ مقابلہ میں امید کے ہے یعنی امید سے زیادہ خوف ہو۔

سالکین مستہلکین

اس لیے کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب خوف فوق الحد ہوتا ہے تو وہ مانع طاعات بن جاتا ہے چنانچہ بہت سے سالکین پر جب خوف کا غلبہ ہو گیا ہے تو طاعات چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض نے نماز چھوڑ دی ہے کسی نے ذکر چھوڑ دیا ہے' اصطلاح صوفیاء میں ان کو سالکین' مستہلکین کہتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبول مقرب نہیں ہوتے اور یہ لوگ اپنی خودرائی کی وجہ سے ایسے گڑھے میں گرتے ہیں کہ تمام عمر اس سے خلاصی نہیں ہوتی ایسے وقت رہبر کامل کی ضرورت ہے وہ بہ تدابیر اس مہلکے سے نکال لیتا ہے اور تدابیر متعلقہ تدبیر باطن بعض مرتبہ ایسی لطیف ہوتی ہیں کہ عوام کا فہم ان کے ادراک سے قاصر ہوتا ہے بلکہ ان کو بادی النظر میں نامناسب سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک دوست کو ایسا قبض واقع ہوا کہ ذکر و طاعت و روزہ و نماز میں جی نہ لگتا تھا۔ انہوں نے اپنا حال مجھ کو لکھا' میں نے جواب میں لکھا تم خلوت چھوڑ دو' ادھر ادھر سیر کرو' دوستوں سے ہنسو بولو' نفس کو خوب آرام دو' چنانچہ دو تین روز کے بعد وہ حالت جاتی رہی' انبساط ہو گیا' بات کیا تھی کہ میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آئی کہ خلوت میں رہتے

---

[1] (مسند احمد ۲:۳۱۵' الترغیب والترھیب ۲:۳۹۳)

رہتے طبیعت میں ایک جمود اور خمود ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ اس کی وجہ سے احساس نہیں رہا اور اندیشہ اس کا ہوا کہ زیادہ انقباض اگر ہوا تو مبادا روزہ نماز بھی چھوڑ بیٹھیں' اس لیے میں نے ان کے لیے بجائے خلوت کے جلوت اور بجائے اعتکاف کے طواف پر تجویز کیا' غرض اس راہ میں بڑے بڑے قصے پیش آتے ہیں کہ ان میں کسی شیخ کامل کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

تخویف کی دو قسمیں

الحاصل غلبہ خوف کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ آدمی کام سے جاتا رہتا ہے اس کی تعدیل کے واسطے بجائے اللہ کے رَبَّهُمْ فرمایا اور اس سے تعدیل اس طرح ہوئی کہ آدمی جو کسی سے ڈرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں' ایک تو ایسا ڈرنا ہے جیسے چور کوتوال سے ڈرتا ہے یا مجرم حاکم سے ڈرتا ہے یا جیسے شیر اور بھیڑیے سے ڈرتا ہے کہ یہاں تو محض خوف ہی خوف ہے امید کا نشان ہی نہیں اور دوسری قسم یہ ہے جیسے لڑکا اپنے شفیق باپ سے ڈرتا ہے یہ اور قسم کا ڈرنا ہے کہ اس میں خوف کے ساتھ باپ کی شفقت پر اعتماد کر کے امید معافی کی بھی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ واضح مثال اس خوف کے متنوع ہونے کی یہ لیجئے کہ حاکم کا بیٹا حاکم سے بحیثیت حکومت کے تو اور طرح ڈرتا ہے اور بحیثیت باپ ہونے کے اور نوع سے ڈرتا ہے۔ پس رَبَّهُمْ اگر نہ فرماتے تو اللہ کے بعض بندے بوجہ غلبہ استحضار شان جلال وقہاریت کے خوف کی وجہ سے جان ہی دے دیتے اس لیے رَبَّهُمْ اختیار فرمایا کہ جس ذات سے خوف کی فضیلت بیان ہو رہی ہے وہ تمہاری مربی بھی ہے تم سے بے تعلق نہیں وہ کوئی شیر یا بھیڑیا نہیں اے میرے مقبول بندو! تم اس قدر خوف کے اندر مت گھلو جیسی مجھ میں شان جلال وقہاریت ہے۔ اسی طرح شان تربیت بھی تو ہے۔ اسی وجہ سے فَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّه (جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے) میں بھی ربہ فرمایا ہے اور یہاں ربہ کے ساتھ ایک لفظ مقام کا اور زیادہ فرمایا اس میں عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ خوف کے قائم رکھنے کے لیے بڑھایا ہے۔ شرح اس کی موقوف ہے ایک مثال پر وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی کا باپ اگر حاکم ہو تو جب وہ برسر اجلاس ہوگا تو اس کا اور اثر ہوگا اور جب رنج پر ہوگا تو دوسرا اثر ہوگا۔ اجلاس پر تو شان حکومت جلوہ گر ہوگی' خواہ کوئی سامنے آئے اور رنج پر شان

شفقت پدری کی ظاہر ہوگی اس وقت شان حکومت ظاہر نہ ہوگی پس مقام کا لفظ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ گو وہ تمہارا رب ہے جس کا مقتضا شفقت و رحمت و تربیت ہے لیکن جبکہ وہ قیامت کے دن جلال و قہاریت کے ساتھ ظہور فرمائیں گے تو اس وقت ان کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر کے اس کے ڈرنا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ مقام کا لفظ خوف دلانے کو بڑھایا اور رب بہ تعدیل خوف کے لیے لائے۔ اسی طرح یہاں "یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" (جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) میں اسی تعدیل کے لیے ربوبیت کو یاد دلایا اور جاننا چاہیے کہ "یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" میں **ربھم** کا لفظ جیسے کہ جانب افراط کی تعدیل کرتا ہے اسی طرح جہت تفریط کا بھی معدل ہے یعنی نفس خوف کے وجود کا بھی محرک ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تخویف کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ کسی امر موجل سے خوف دلایا جائے جیسے کہا جائے کہ اگر چوری یا ڈکیتی کرو گے تو جیل خانہ جاؤ گے اس کا اثر تو ضعیف ہے اس لیے کہ ممکن ہے کہ مقدمہ میں رہا ہو جائیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ کسی امر معجّل سے تخفیف ہو مثلاً کسی سرکاری ملازم سے کہا جائے کہ فلاں جرم کا اگر ارتکاب کرو گے تو سب سے اول سزا یہ ہوگی کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی' تنخواہ بند ہو جائے گی اور پھر جیل خانہ جاؤ گے' یہ مؤثر قوی ہے کیونکہ نوکری کا نفع کہ تنخواہ ہے وہ فی الحال جاری ہے اس کا انقطاع زیادہ مخوف ہے اسی طرح تعزیرات الٰہیہ میں بھی سمجھئے کہ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دوزخ میں جلو گے اس کا اثر بعض طبائع پر ضعیف ہے اس لیے کہ جانتے ہیں کہ میاں جب قیامت ہوگی دیکھا جائے گا' اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان پر یہ اثر ایسا ضعیف ہوتا ہے کہ بعضے آدمی بے باکی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

گناہوں کی نحوست

چنانچہ ایک زمیندار نے کسی غریب آدمی کا ایک کیکر کا درخت کاٹ لیا تھا' اس نے کہا کہ میاں صاحب یہاں تو تمہاری چل گئی مگر یاد رکھو قیامت کے دن پکڑے جاؤ گے تو وہ زمیندار کہتے ہیں کہ میاں اتنے آدمیوں میں میں کہاں ملوں گا' اس بے باکی کی وجہ یہی ہے کہ قیامت کا اثر قلوب پر بہت ضعیف ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ قیامت موجل ہے اور اگر مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دنیا میں رزق نہ ملے گا' مال و اولاد کا نقصان

ہوگا تو چونکہ یہ فوری سزا ہے اس لیے اس کا اثر قوی ہوتا ہے اب سمجھئے کہ رَبُّهُمْ سے کس طور سے نفس خوف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گویا یہ فرماتے ہیں کہ ایسی ذات سے ضرور ڈرنا چاہیے کہ تمہاری تربیت کا مدار اسی کے ہاتھ میں ہے اس لیے اگر اس سے نہ ڈرو گے تو تمہاری تربیت میں کمی آ جائے گی، مثلاً روزی نہ ملے گی، عافیت جاتی رہے گی، سبحان اللہ کلام اللہ کے ایک ایک لفظ کے اندر کتنے بے شمار معانی بھرے ہوئے ہیں اور ہمارے ہر مقام پر نظائر بیان کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام اللہ کے اندر پورا لطف اس کو آئے گا جس کی محاورات اور واقعات پر نظر ہو اور استدلال اور فلسفیت کی زیادہ کاوش سے خالی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم تو گناہوں کے اندر رات دن رہتے ہیں اور ہم کو خوب رزق ملتا ہے، نافرمانی سے رزق کبھی نہیں گھٹتا، اس کے دو جواب ہیں اول تو نقلی قرآن وحدیث سے مسلمانوں کا چونکہ وہ ایمان ہے اس لیے ان کے لیے تو یہی کافی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا" (یعنی جو شخص میری یاد سے اعراض کرے اس کے لیے تنگ زندگی ہے) اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَعِيْشَةً ضَنْكًا سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیات آخروی تنگ ہوگی لیکن مَعِيْشَةً کے لفظ سے متبادر یہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے، دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن وحدیث کے ضرورت نہیں لیکن ہم تبرعاً واقعات سے دکھلاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا شے مطلوب ہے، جائیداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے ڈھیلے تو مطلوب ہیں نہیں مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے اگر کہو کہ مطلوب جائیداد سے روٹی، کپڑا اور مکان ہے اس میں رہنا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا، پہننا بذاتہ مطلب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہ مقصود ہوتا عاریت کے کپڑے اور عاریت کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں آتا جیسے اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس پہننا، کھانا، رہنا مقصود نہیں، کوئی اور شے مطلوب ہے، وہ کیا ہے وہ ہے لذت راحت حلاوت چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے اس لیے وہ مطلوب ہے لڑکپن میں۔ میں ایک مرتبہ

والد صاحب کی خدمت میں دیوبند سے گیا ہوا تھا وہاں عید یا بقر عید آ گئی اور اس کے کپڑے میرے ہمراہ نہ تھے اور مجھ کو بعض اعزہ کے عاریتی کپڑے ملنے لگے تو مجھ کو کلفت ہوتی تھی اور اپنے مستعمل کپڑوں میں زیادہ لطف معلوم ہوتا تھا مگر بعض بے حس بھی ہوتے ہیں جس طرح بعض عورتیں محض مٹکانے چمکانے کے لیے پرایا زیور لے جاتی ہیں اور اس کو اپنا ظاہر کرتی ہیں کتنی سخت بیہودہ حرکت ہے اچھی خاصی ریاء اور نمائش ہے۔

جمعیت خاطر کی خصوصیت

غرض دنیا کی تمام چیزوں سے مقصود جمعیت وسکون قلب ہے اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت کسی ایسے شے میں نہیں جس کو راحت وسکون لوگ سمجھتے ہیں یہ سب عین پریشانی ہے۔ چنانچہ اہل دنیا کو دیکھ لو کہ رات دن ان کو ادھیڑ بن تو لگی رہتی ہے کسی وقت بھی آرام میسر نہیں' میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت وسکون حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے اگر شک ہو تو تین دن ہی فرمانبرداری کر کے دیکھ لو اور یہ التزام کرو کہ تمام منہیات سے تین دن تک مجتنب رہیں گے' پھر قلب کی پہلی حالت اور موجودہ حالت میں موازنہ کرلو' یقیناً فرق معلوم ہوگا اور اگر پھر بھی حس نہ ہو تو پھر اپنی مثال ایسی سمجھ لو کہ جو مینڈک تمام عمر گندہ چہ بچہ میں رہا ہو اس کو کیا معلوم ہو کہ سمندر میں کیا ہے۔ اسی طرح جس نے حلاوت باطن نہ دیکھی ہو وہ اس کا کیا ادراک کرے اگر کوئی کہے کہ ہم تو شب و روز اپنے دنیا کے کاموں میں اور بال بچوں میں ہنسی خوشی رہتے ہیں ہم کو تو کچھ بھی پریشانی نہیں تو اس کے جواب میں پھر میں بھی کہوں گا کہ واللہ حس نہیں دنیا کے اندر اتنا انہماک ہے کہ حس بھی باطل ہوگئی اس کا فیصلہ بہت سہل ہے تم ایک ہفتہ کے واسطے اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے توبہ کرو اور واجبات وفرائض کا التزام کرو' ایک ہفتہ اس حالت میں گزارنے کے بعد جو پھر اپنی اصلی حالت قبیح کی طرف عود کرو گے تو اس حالت حسن کو یاد کر کے یہ کہو گے:

خوشا وقتی و خرم روز گارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیسا اچھا وقت اور پرلطف زمانہ تھا کہ اس میں محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو رہا تھا) اور یہ کہو گے:

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور اس ہفتے کی لذت یاد آئے گی حتیٰ کہ اس کا یہ اثر ہوگا کہ پھر اسی ہفتے کی طرف عود کرو گے ممکن نہیں کہ مقناطیس کشش نہ کرے تو یہ کیا شے ہے جس کو وہ ڈھونڈتا ہے وہ یہی جمعیت خاطر ہے اور ایک بڑی خاصیت فرمانبرداری میں یہ ہے کہ دل بڑا قوی رہتا ہے اور حق تعالیٰ سے اس کو وحشت نہیں ہوتی۔ ایک عیسائی لکھتا ہے کہ مسلمان کے پاس یہ بڑی دولت ہے کہ وہ اپنے خدا سے شرمندہ نہیں یعنی جیسے نافرمان وحشت سے جان چراتا ہے منہ چھپاتا ہے مطیع اس سے محفوظ ہے دیکھ لیجئے کہ کسی تحصیل میں تحصیلدار اپنا منصبی کام نہ کرتا ہو یا رشوت ستانی میں بدنام ہو یا سست ہو کام اس کا خراب ہو اور ایک دوسری تحصیل کا تحصیلدار کارگزار اور ہر کام کو وقت پر کرنے والا ہو اور دونوں تحصیلوں میں صاحب کلکٹر اطلاع کریں کہ ہم فلاں تاریخ تحصیل کا معائنہ کریں گے تو اول تحصیلدار کی تو سن کر ہی روح فنا ہو جائے گی اور اسی وقت سے وحشت سوار ہوگی کہ دیکھئے کیا پیش آتا ہے اور اپنے سزایاب ہونے کا خیال ہوگا اس لیے وہ یہ بھی نہ چاہیے گا کہ حاکم کا سامنا ہو اور جو تحصیلدار اپنا کام کرتا ہے اس کو خوشی اور مسرت ہوگی کہ مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ میری کارگزاری حاکم کے روبرو پیش ہوگی۔ گو حاکم کے حاکمانہ انداز سے وہ بھی ڈرتا ہے لیکن اس کا ڈرنا اور نوع کا ہے اسی طرح فرمانبردار اور نافرمان بندے کو سمجھ لیجئے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ مطیع کو اپنے اعمال پر ناز ہے۔

طاعت میں خاصیت

بات یہ ہے کہ طاعت میں خاصیت ہی ہے کہ اس سے مطاع کے ساتھ انس اور محبت اور اس کا شوق بھی بڑھتا ہے اور یہی راز ہے کہ اللہ والوں کو موت کا ہر وقت شوق رہتا ہے کہ کسی طرح جلدی وہ دن آ جائے ہم اپنے محبوب حقیقی سے جا ملیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک طوطا کسی پنجرے میں مقید ہو باغ میں اور دوسرے طوطے آتے سیر کرتے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر وہ بھی پھڑ پھڑاتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کاش میں اس پنجرے سے رہائی پاؤں اور ان کی طرح آزاد ہو جاؤں پس یہ قالب خاکی مثل پنجرے کے اور طائر روح مثل طوطے کے ہے۔ روح ان حضرات کی چاہتی ہے کہ کسی طرح اس جسم کی قید سے نکل جائے اور دوسرے طائران عالم قدس میں جا ملے اور ایک طوطا وہ ہے کہ پنجرے میں وہ بھی قید ہے

لیکن پنجرے کے چاروں طرف بلیاں بیٹھی ہیں کہ یہ نکلے تو ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں تو وہ اس پنجرے ہی کو غنیمت سمجھتا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا' یہ مجرم کی مثال ہے غرض بعض تو اس پنجرہ قالب سے نکلنا چاہتے ہیں۔

اہل اللہ کی تمنائے موت کا سبب

اور وہ اہل اللہ ہیں اس لیے کہ ان کو اس کا شوق ہے کہ یہاں سے خلاصی پاتے ہیں' عالم ارواح کی سیر اور حق تعالیٰ کا قرب یا کیف نصیب ہو اور اس شوق میں وہ زبان حال یا مقال سے یہ کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم　　راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

(وہ دن بہت ہی اچھا ہے کہ اس سرائے فانی سے میں کوچ کر کے محبوب حقیقی کے روبرو جاؤں)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(میں نے نذر مانی ہے کہ اگر یہ غم انجام کو پہنچ جائے اور کوچ کا وقت آ جائے تو اس کے شکرانے میں محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

اور بعض اس پنجرے سے نکلنا نہیں چاہتے بلکہ نہ نکلنے کو چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کی روح کو بوجہ اپنے کرتوتوں کے ادراک ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی پابزنجیر ہونا پڑے گا اس لیے موت کے نام سے بھی ان کو نفرت ہے' دہلی کے بعضے بادشاہوں کا قصہ سنا ہے کہ موت کا نام بھی ان کے دربار میں نہ لیا جاتا تھا بلکہ جنازہ نکالنے کے لیے ایک خاص دروازہ بنایا گیا تھا اور اس کا نام خضر دروازہ رکھا گیا تھا۔ بعض لوگ سورہ یٰسین شریف پڑھنے سے بلکہ سننے سے گھبراتے ہیں اس لیے کہ مردوں پر پڑھی جاتی ہے۔

حکایت مومن خاں دہلوی

مومن خاں شاعر سے رمضان شریف میں ایک ڈوم نے کہا تھا کہ تراویح میں جس دن وہ سورۃ آئے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ کو پہلے سے اطلاع کر دیجیو' اس کا یہ اعتقاد تھا کہ سورہ یٰسین شریف سننے سے مر جاتا ہے' مومن خاں نے ایک دن براہ مزاح کہا کہ میاں وہ سورہ تو رات آ چکی سنتے ہی بخار چڑھ آیا اور دو تین دن بعد مر گیا تو بعضے موت سے اتنا گھبراتے ہیں کہ

اس گھبراہٹ میں ہی ان کو موت بھی آ جاتی ہے۔ بوڑھے سے بوڑھا بھی جینے کی تمنا کرتا ہے میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک بوڑھیا تھی اس کو کسی لڑکی نے کہہ دیا کہ بڑھیا مر جا بہت برا مانا اور کسی سے شکایت کی کہ سنا بھی فلانی مجھ کو یہ کہتی ہے کہ تو یوں ہو جا' اللہ اکبر کس قدر موت سے کراہت تھی کہ اس کا نام بھی نہیں لیا' بخلاف بزرگان دین کے کہ ان کو موت کا شوق ہوتا ہے۔

طاعت سے موت وحیات دونوں میں حلاوت ہوتی ہے

ایک بزرگ نے زمانہ طاعون میں لوگوں کو بھاگتے دیکھا' معلوم ہوا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں' تو شوق وتعجب سے فرماتے ہیں: "**یا طاعون خذنی الیک**" یعنی اے طاعون تو مجھ کو پکڑ لے یعنی یہ لوگ اس دولت کے قابل نہیں مجھ کو یہ دولت نصیب ہو جائے۔ گویا ان کی یہ کیفیت تھی کہ بزبان حال یہ کہتے تھے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمنوں کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہوں' دوستوں ہی کے سر سلامت رہیں کہ آپ ان پر خنجر آزمائیں)

غرض فرمانبرداری وہ شے ہے کہ اس سے حیات میں بھی حلاوت ہوتی ہے اور موت میں بھی اور نافرمانی وہ بلا ہے کہ خواہ کتنا ہی سامان عیش ہو حتیٰ کہ سلطنت بھی ہو مگر پریشانی ہی پریشانی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ فرمانبردار امیر کبیر ہوتے ہیں اور نہ یہ دعویٰ ہے کہ فرمانبردار پر کوئی مصیبت نہیں آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو مقصود اصلی ہے امیری اور تونگری کا یعنی راحت اور سکون اور جمعیت وہ ان ہی حضرات کو حاصل ہے حتیٰ کہ مصیبت میں بھی اور جو حقیقت ہے مصیبت کی یعنی پریشانی قلب وہ ان کے پاس نہیں آتی۔ اگرچہ صورۃ مصیبت میں ہوں اور یہ بہت کھلی بات ہے دیکھ لو اگر دو شخص ہوں ایک ان میں سے مطیع ہو اور اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو اور دوسرا نافرمان اور محبّ دنیا ہو اور دونوں کے مثلاً دو بیٹے جوان ایک عمر اور ایک لیاقت کے ہوں اور وہ دونوں بتقدیر الٰہی مر جائیں' رنج طبعی دونوں کو ہوگا لیکن غیر مطیع پریشانی حسرت وارماں میں مدتوں گھلے گا اور مطیع یہ کہے گا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اَلَیْہِ

رَاجِعُوْنَ" (یعنی ہم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور ہم سب لوگ اسی کی طرف جانے والے ہیں) پھر یہ پریشانی کا ہے کی، پریشانی اس کے پاس نہ آئے گی اس لیے کہ وہ سمجھے گا کہ جو کچھ واقع ہوا عین مصلحت اور حکمت ہے، غرض فرمانبردار کسی حال میں گھبراتا نہیں۔

حکایت مفتی عنایت احمد صاحب مرحوم

میں نے عبدالرحمٰن خاں صاحب مالک مطبع نظامی سے سنا ہے کہ مولانا مفتی عنایت احمد صاحب مرحوم حج کو تشریف لے گئے تھے۔ طوفان آیا جہاز ڈوبنے لگا اور پانی چاروں طرف سے غرغراس میں آرہا تھا، تمام مخلوق جو اس میں تھی سخت پریشانی میں تھی اور مفتی صاحب مرحوم ایک جگہ اطمینان سے بیٹھے ہوئے اس آیت کا تکرار فرمارہے تھے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے فرمادیجئے کہ ہم کو ہرگز کچھ مصیبت نہ پہنچے گی مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہ ہمارا مولا ہے اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے) یہ آیت پڑھتے پڑھتے غرق ہو گئے۔ غرض فرمانبردار ہر حالت میں راضی ہے حتیٰ کہ مصیبت میں بھی یہ تفاوت تھا۔ مصیبت میں اور نعمت کی حالت میں بھی مطیع اور غیر مطیع کے درمیان تفاوت ہے یعنی نافرمان کو نعمت میں بھی پوری لذت نصیب نہیں بلکہ وہ بھی فرمانبردار ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ طعام کے اندر بھی اس کو وہ لذت آتی ہے کہ دوسرے کو نہیں آتی، لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ فرمانبرداری کو کھانے کے مزے کے اندر کیا دخل ہے لیکن تھوڑا سا غور فرمائیں گے تو سمجھ میں آجائے گا۔ دیکھیے جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی ہر شے پیاری معلوم ہوتی ہے، خواہ وہ شے خراب ہی ہو۔ مثلاً دو انبہ میں ایک تو اپنا خریدا ہوا اور ایک محبوب نے دیا ہو دونوں میں بڑا فرق ہے، محبوب کے دیئے ہوئے انبہ کو اگرچہ وہ ترش ہی ہو جس رغبت سے کھائے گا اپنے انبہ کو اس طرح نہ کھائے گا اور اس میں مزہ بھی بہت آئے گا۔ اس لیے کہ وہ مزہ نرے انبہ کا نہیں بلکہ وہ اس نسبت کا ہے کہ محبوب کا دیا ہوا ہے پس ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جس کو حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہو گیا ہے اس کو ہر نعمت میں بے حد مزہ آئے گا کہ یہ میرے محبوب نے مجھ کو عطا فرمائی ہے اس کو سوکھی روٹی میں وہ

لطف آئے گا جو دوسروں کو پلاؤ، قورمہ میں نہیں آتا اور حرام خور نافرمان اناج کی کوٹھیاں اور پانی کے تالاب کے تالاب خالی کر دیتے ہیں اور کبھی دل میں تو کیا زبان پر بھی یہ نہیں آتا کہ معطی حقیقی کا شکر کریں اور ان نعمتوں کو اس کی طرف سے سمجھیں، پھر وہ اس نسبت کی لذت سے بھی محروم ہیں اور نعمت تو نعمت فرمانبردار کو تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مصیبت اور تکلیف میں بھی مزہ آتا ہے جیسے محبّ کو محبوب کی مار میں بھی لطف آتا ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ نافرمانی میں معیشت کے تنگ ہونے کے کیا معنی ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ربھم جیسا کہ افراط خوف کو درجہ توسط پر لانے والا ہے اسی طرح نفس خوف کو بھی درجہ تفریط سے ترقی دینے والا ہے اور خشیۃ پر مغفرت اجر کبیر کے مرتب کرنے سے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ اگر خشیت نہ ہوگی تو ان کے لیے مغفرت اور اجر کبیر کا وعدہ نہیں۔

خشیت اور مغفرت میں ربط

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ خشیت اور مغفرت اور اجر کبیر میں کیا جوڑ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خشیت پر ان دونوں کو مرتب فرمایا تو ربط کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، اول تو یہ کہ خشیت ایک حسنہ ہے اور یہ ثابت ہے کہ "اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ" (یعنی نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں) اس علاقہ سے مغفرت من الذنب اور اجر کبیر اس کے لیے لازم ہے۔ دوسری وجہ ربط کی یہ ہے کہ جب خشیت ہوگی تو گناہوں سے توبہ کرنا اس کے لیے لازم ہے اور نیز تمام اعمال صالح کا اختیار کرنا بھی لازم ہے۔ "**کما مر فی التمهيد من ان الخشية مفتاح الاعمال الصالحة**" (جیسے تمہید میں گزرا کہ خشیت اعمال صالحہ کی کنجی ہے) اور ظاہر ہے کہ توبہ کو حسب وعدہ مغفرت لازم ہے اور اعمال صالحہ کو اجر کبیر "ولازم الملازم لازم" (لازم کا لازم بھی لازم ہوتا ہے) اور یہ دوسری وجہ ربط کی وجداناً زیادہ قریب ہے تو حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ ایسی خشیت پیدا کرو کہ جس سے ایسا سامان ہو جائے۔ (یعنی توبہ و اعمال صالحہ کی توفیق ہو جائے) کہ اس پر مغفرت اور اجر کبیر مرتب ہو اور چند کہ واؤ سے عطف کرنا ترتیب کو مفید نہیں لیکن ترتیب ذکری بھی کسی نکتہ سے خالی نہیں ہوتی۔ پس مغفرت کو پہلے لانے اور اجر کبیر کو بعد میں لانے کے اندر نکتہ ہو سکتا ہے کہ خشیت کے مقتضاء میں بھی ترتیب ہوتی ہے۔ چنانچہ جس کے اندر خشیت ہوگی وہ اول اپنے معاصی سے توبہ کرے گا۔ اس پر تو مغفرت مرتب ہوگی اور پھر اعمال صالحہ کو اختیار کرے گا۔ اس پر اجر کبیر متفرع ہوگا۔

ضرورت توبہ

اب ہم کو چاہیے کہ ہم بھی یہی ترتیب اختیار کریں کہ توبہ اسی وقت کرلیں پھر اعمال صالحہ میں سے جس جس کا وقت آتا رہے اس کو بجالاتے رہیں اس لیے کہ گناہ تو ہر وقت ہی ہوتے رہتے ہیں اس لیے توبہ بھی ہر وقت ہی کرنا ضروری ہے اس کے لیے کسی وقت کا انتظار کیوں کیا جائے اس کو سن کر اگر کوئی مدعی تقویٰ کہے کہ ہم سے تو کوئی بھی گناہ نہیں ہوتا نہ یہ کہ ہر وقت ہوتا ہو میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے، گناہ ہوتے ہیں مگر سمجھ میں اس لیے نہیں آتا کہ پورا علم نہیں چنانچہ شادی کی رسوم کے متعلق جب نصیحت کی جاتی ہے کہ تو اکثریوں کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم نے ناچ کرایا ہے۔ یہ تمام تر علم نہ ہونے کی خرابی ہے کہ دین کی خبر ہی نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ بس ناچ کرانا گناہ ہے۔ صاحبو! جس طرح ناچ کرانا گناہ ہے اسی طرح فخر کے واسطے کھانا کھلانا، دینا دلانا یہ سب بھی منع ہے اور ظاہر ہے شادی اور غمی کی رسوم اکثر تفاخر و نمائش ہی پر مبنی ہیں، پھر گناہ نہ ہونے کے کیا معنی۔ پس یہ تمام خرابی علم سے ناواقفیت کی ہے کہ گناہ کو گناہ نہیں جانتے ورنہ اگر پورا علم ہو تو ایک لحظہ بھی معصیت سے خالی نظر نہ آئے کیونکہ گناہ جوارح کے الگ ہیں قلب کے الگ پھر ہر ایک میں بے انتہا جلی اور دقیق شعبے ہیں۔ ذرا احیاء العلوم کو یا اس کے ترجمے کو تو پڑھ کر دیکھو یا سن کر کہ اس کی تصدیق ہو جائے گی مگر بوجہ جہل کے بعض اپنے کو ایسا بری سمجھتے ہیں کہ ان پر جب کوئی تکلیف یا مصیبت آتی ہے تو بعضے کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم سے کیا گناہ ہو گیا تھا جس میں ہم پکڑے گئے۔ صاحبو! تم کو بجائے اس کے کہ مصیبت پر تعجب ہوتا ہے کہ کس گناہ سے آئی اگر ان نعمتوں پر تعجب ہوتا جو تم کو مل رہی ہیں اور صحیح و سالم چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں ہلاک نہیں کر دیئے جاتے تو یہ زیادہ زیبا ہوتا ہمارے اعمال تو ایسے ہیں کہ ہم کو ایک ٹکڑا روٹی کا اور ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ ملنا چاہیے اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ جب کوئی گناہ ہوتا ہے تو شیطان پر لعنت کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیطان بہکاتا ہے یاد رکھو کہ چوری جب ہوتی ہے گھر کے بھیدی کے بھید دینے سے ہوتی ہے اسی طرح گناہ جب ہوگا تو آپ کے اندرونی دشمن کی سازش سے ہوگا۔ وہ کون ہے نفس؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ نفس ہمارا صلاحیت پر آ جائے تو اگر ساری دنیا بھی شیاطین سے پر ہو جائے تو کچھ ضرر نہیں، اصلی دشمن تو یہ ہے ہر وقت ہم سے گناہ کراتا رہتا ہے اس لیے ہر وقت توبہ کرنا ضروری ہے۔

توبہ نہ کرنے کے مختلف بہانے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا جن کی شان ہے: "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَاتَاَ خَّرَ" (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلوں خطائیں معاف کردے) اور جن کو خطاب ہے: "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (بے شک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں) باوصف اس عظمت اور علومرتبہ کے آپ فرماتے ہیں: "انی لاستغفر اللّٰہ فی الیوم سبعین مرۃ او کمال قال"[1] یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دن بھر میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں اور ہم باوجود سرتاپا گناہوں میں غرق ہونے کے دن بھر میں ایک مرتبہ بھی توبہ نہیں کرتے اور اس کا ایک عجیب حیلہ یہ نکال رکھا ہے کہ توبہ اس لیے نہیں کرتے کہ پھر گناہ ہوجائے گا۔ صاحبو! یہ شیطان کی شراب ہے کہ اس کو پلا کر اس نے ہم کو غفلت میں ڈال دیا اور اس کو ایک خصلت حمیدہ اور پختگی سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے دل میں توبہ کی بڑی عظمت ہے کہ توبہ کرکے پھر گناہ کو پسند نہیں کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میاں توبہ ہی کہاں کی تھی سو یہ امر توبہ سے بڑا مانع ہے۔ اکثر لوگ اسی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم دنیادار آدمی ہیں' ہماری توبہ ہی کیا ہے' اگر توبہ کر لی تو وہ ٹوٹ جائے گی جواب اس کا یہ ہے کہ ٹوٹ جائے گی پھر توبہ کر لیجئو' اگر کوئی کہے کہ پھر توبہ سے کیا فائدہ۔ فائدہ یہ ہے کہ جن گناہوں سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ تو صاف ہوتے جائیں گے' جرائم کے اندر زیادتی تو نہ ہوگی' دو شخصوں کی اگر پچاس پچاس برس کی عمر ہو اور دونوں نے برابر گناہ کیے ہوں مگر فرق یہ ہو کہ ایک تو برابر توبہ کرتا رہا اور دوسرے نے توبہ نہیں کی تو دونوں کے مواخذے میں فرق عظیم ہوگا۔ یہ فرق تو آخرت کے اعتبار سے ہے۔

توبہ کرنے کا ایک فائدہ عاجلہ

اور ایک فائدہ عاجلہ بھی ہے وہ یہ کہ بار بار توبہ کرنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ چندروز میں بتدریج وہ گناہ چھوٹ جاتا ہے۔ پس یہ توبہ کی برکت ہے کہ اس سے تائب آخر کار متقی پرہیزگار ہوجاتا ہے۔ غرض اگر گناہ اور توبہ دونوں کے سلسلے برابر جاری رہیں تب

---

[1] (سنن ابی داؤد' الدعاء ب: ۴' سنن الترمذی ۳۲۵۹)

بھی ان شاء اللہ تعالیٰ گناہ کا سلسلہ مٹ جائے گا اور توبہ کا سلسلہ "بمقتضائے "سبقت رحمتی علی غضبی"[1] (میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی) غالب آ جائے گا جیسے سلیٹ کی لکھائی ہے کہ پانی سے مٹ جاتی ہے اسی طرح گناہ بھی آب رحمت سے مٹ جائیں گے۔ لیکن اس سے گناہوں پر دلیر نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ میرا مقصود تو اس سے یہ ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ میں گناہ نہ کروں اور نفس سے کشاکش ہوتی ہے کبھی یہ غالب ہوتا ہے کہ باوجود تقاضاء شدید کے نفس کے مقتضاء پر عمل نہیں کرتا اور کبھی بمقتضاء بشریت اس پر نفس غالب آ جاتا ہے اس سے کڑھتا ہے اور روتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور پھر گناہ ہو جاتا ہے وہ پھر ایسا ہی کرتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹنے کی ہوتی ہے ایسے شخص کی ہمت بندھانے کے لیے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں کہ ایسا شخص اس تدبیر سے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن ضرور متقی و پرہیز گار ہو جائے گا۔ اگر نہ بھی ہو لیکن مغفور تو ان شاء اللہ ہو ہی گا۔ باقی جو پہلے سے گناہ میں دلیر ہے اور اس کو کچھ غم ہی نہیں اس کے غم کے علاج ہی کی کیا ضرورت ہے اس کو یہ خطاب نہیں کہ گناہ سے مغموم نہ ہو کہ توبہ اس کا علاج ہے بس میرا مقصود گناہ کی اجازت دینا نہیں۔ نیز ظاہر ہے کہ جس سے گناہ بالکل نہ ہو اور جس سے گناہ ہوا کرے لیکن توبہ بھی کر لے ان میں بڑا فرق ہے۔ اگر کوئی طالب علم شبہ کرے کہ حدیث میں تو آیا ہے "التائب من الذنب کمن لاذنب له"[2] (گناہ سے توبہ کرنے والا مثل اس شخص کے ہے جس نے گناہ نہیں کیا) جس سے مماثلت معلوم ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ خود اس حدیث سے ہی فرق معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ مشبہ بہ وجہ شبہ میں مشبہ سے زیادہ ہے۔ پس "من لاذنب له" (جس نے گناہ نہیں کیا) اور "تائب من الذنب" (گناہ سے توبہ کرنے والا ہے) میں فرق ہے۔

توبہ ہر وقت لازم ہے

ایک جولاہے نے اس کی مثال بیان کی تھی جب کسی طالب علم نے یہ حدیث اس کے سامنے بیان کی کہنے لگا کہ بننے میں جب تاگا ٹوٹ جاتا ہے جوڑنے سے جڑ تو جاتا ہے لیکن

---

[1] (مسند الحمیدی :۱۱۲۶، اتحاف السادۃ المتقین ۸:۵۵۸)

[2] (سنن ابن ماجه :۴۲۵۰، مشکوٰۃ المصابیح:۲۳۶۳)

پھر بھی گرہ رہ جاتی ہے صفائی نہیں آتی' بہرحال توبہ ہر وقت لازم ہے اور اس توبہ کا مکمل یہ بھی ہے کہ حقوق العباد کو ادا کریں' دوسرے اعمال صالحہ کو اختیار کریں تاکہ مغفرت کے ساتھ اجر کبیر بھی مرتب ہو اور اعمال صالحہ کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو ہمت دوسرے علم بلکہ علم کی ضرورت تو توبہ میں بھی ہے اور علم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مولوی بنو بلکہ ردو کے رسائل سبقاً سبقاً کسی عالم سے پڑھ لو یا سن لو بس یہ بھی کافی ہے اور ہمت بڑھانے کے لیے اہل بیت یعنی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو کہ عجیب خاصیت رکھتی ہے۔

کم عقلوں کی حکایات

آگے ارشاد ہے: "وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ." یعنی تم اپنی بات کو آہستہ سرگوشی سے کہو یا جہر سے بیشک اللہ تعالیٰ دلی بات سے واقفیت رکھتے ہیں یہ مضامین تاکید خشیت کے لیے بڑھائے گئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں قیاس "القیاس الغائب علی الشاهد" کا مادہ فاسدہ بہت پھیلا ہوا ہے یعنی غائب کو حاضر پر قیاس کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں چنانچہ ایک بڑھیا نے خود مجھ سے پوچھا مولوی جی تمہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں کی سب خبر ہے۔ یہ تو بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ زندہ بھی ہیں' وہ بیوقوف تو یہ سمجھی کہ مدت ہوگئی ہے اب تک کیا زندہ ہوتے اپنے اوپر قیاس کیا کہ جس طرح ہم مرور زماں سے فنا ہو جاتے ہیں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بھی اب تک کیا زندہ ہوں گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کو دلیل سے سمجھانا چاہیے' میں نے پوچھا بڑی بی تم بتلاؤ رزق کون دیتا ہے کہا کہ اللہ تعالیٰ' بارش کون برساتا ہے کہا کہ اللہ تعالیٰ' اولاد کون دیتا ہے کہا کہ اللہ تعالیٰ' میں نے کہا کہ پھر یہ کام زندہ کیا کرتا ہے یا مردہ کہنے لگی کہ مردہ سے کیا ہوتا ہے' میں نے کہا بس تو سمجھ لو کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سب کام کرتے ہیں تو وہ زندہ ہیں' کہنے لگی کہ ہاں بے شک زندہ ہیں۔ ایک اور بڑھیا اپنی حالت کی شکایت مجھ سے کرنے لگی کہ تنگی ہے' افلاس ہے' یہ ہے' وہ ہے اور آخر میں کہنے لگی میں زیادہ نہیں کہتی کبھی اللہ تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ میرے عیب کھولتی پھرتی ہے (نعوذ باللہ) لیکن ایسے بھولے بھالوں سے مواخذہ بھی نہیں ہے یہ تو کم عقلوں کی حکایتیں ہیں وہ تو اس مرض میں مبتلا ہیں ہی لیکن قیاس الغائب علی

الشاھد ایسا مرض ہے کہ اس میں بڑے بڑے عقلاء مبتلا ہیں اور یہ بڑی گمراہی کا باعث ہوا ہے اس لیے خشیت کی فضیلت معلوم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی کو خیال ہو کہ میاں ہم ایسی جگہ جا کر گناہ کریں گے کہ کسی چیز کو خبر ہی نہ ہو اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ تم لوگ خواہ سرگوشی کرو یا جہر سے بات کرو ہم کو دلوں تک کی خبر ہے۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. (وہ دلی باتوں سے واقف ہیں) میں قول سے لے کر ذات الصدور تک جتنے مراتب ہیں ظہور واخفا کے سب آ گئے اس کی دلیل عقلی ہے: "اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" یعنی وہ ذات جس نے پیدا کیا ہے وہ نہ جانے گا یہ عقلی مسئلہ ہے کہ ایجاد بعد علم کے ہوتا ہے اس لیے کہ فعل اختیاری مسبوق بالارادہ ہوتا ہے اور ارادہ مسبوق بالعلم سے مطلب یہ ہوا کہ کیا ہم تمہاری چھپی کھلی ہوئی بات سے ناواقف ہیں ہم نے خود ہی تو سب کو پیدا کیا۔

تفسیر آیت متلوہ

اس میں بڑی تاکید خشیت کی ہوگی کہ ہر حال میں ڈرنا چاہیے۔ آگے ارشاد ہے: "وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" (وہ باریک بین اور پورے باخبر ہیں) یہ جملہ بھی خشیت کا موکد ہے اس لیے کہ نہ ڈرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی تو مخوف منہ کا بعید ہونا تو اس کی نسبت تو ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قریب ہیں لیکن چونکہ لطیف ہیں اس لیے نظر نہیں آتے۔ دوسری وجہ نہ ڈرنے کی مخوف منہ کو خبر نہ ہونا ہوتی ہے تو اس لیے فرماتے ہیں کہ وہ خبیر بھی ہیں غرض "بفحواء قیاس الغائب علی الشاہد" تم ہم کو مخلوق پر قیاس نہ کرو ہم سے تم کسی بات کو چھپا نہیں سکتے اس لیے خشیت ضروری ہے۔ ان آیات سے خوف کی فضیلت اور اس کا مفتاح سعادات دنیویہ د اخرویہ ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خشیت بہت ہی ضروری شے ہے۔

تحصیل خشیت کا مختصر دستور العمل

اس لیے میں مختصر طور پر ایک دستور العمل عرض کرتا ہوں کہ جس پر عمل کرنے سے خشیت پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ اپنے روزانہ اوقات میں سے آدھ گھنٹہ یا بیس منٹ نکال کر تنہا بیٹھ کر دو چیزوں کو سوچا کرو اول تو اپنے اعمال سیئہ یاد کرو اور خدا تعالیٰ نے جو اس پر سزا مقرر

فرمائی ہے اس کو سوچا کرو اور اس کے بعد اپنے نفس سے کہو کہ اے نفس تو کیوں ہلاک ہوتا ہے، دیکھ تو سہی ان اعمال کی یہ پاداش تجھ کو بھگتنا پڑے گی اور اس کے بعد اپنے مرنے سے لے کر جنت اور جہنم کے داخل ہونے تک جو جو واقعات پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً قبر میں جانا، منکر نکیر کا سوال کرنا، حساب کتاب، پل صراط سب واقعات تفصیل کے ساتھ سوچو یہ وظیفہ اپنا روزانہ رکھو، دیکھئے تو سہی کیا ثمرہ ہوتا ہے۔

تمنا اور ارادہ میں فرق

مگر مشکل تو یہ ہے کہ ہم لوگ کچھ کرتے ہی نہیں بس یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی نظر ڈال دے یا دعا کر دے یا تعویذ دے دے کہ آپ سے آپ سب گناہ بھی چھوٹ جائیں اور عمل بھی خود بخود ہونے لگیں ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے جو کچھ کرے دوسرا ہی کرے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ممبئی میں کسی نے حج کے لیے دعا کرائی تھی، فرمایا میں تو تمام عمر دعا کروں اور تم تجارت کرتے رہو، حج کیسے نصیب ہوگا۔ اس شرط سے دعا کرتا ہوں کہ جس روز جہاز جانے لگے مجھ کو اپنے اوپر کامل اختیار دیدو، میں ہاتھ پکڑ کر جہاز پر سوار کرادوں گا، پس حج کر لو گے، غرض دعا بھی کراؤ اور خود بھی سعی کرو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے کوشش کی تو دعا ہی کا کیا اثر ہوا۔

اسباب اختیاری ہیں

بات یہ ہے کہ دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو بالکل ہمارے اختیار میں نہیں اور مطلوب من العباد نہیں ہیں اور دوسری وہ کہ ان کے اسباب اختیاری ہیں، پہلی قسم میں تو محض دعا پر اکتفا کرنا چاہیے جیسے کوئی آفت سماوی ہے اس کے لیے دعا کرنا کافی ہے اور جن کے اسباب اختیار میں ہیں ان کے اندر تدبیر کرو لیکن چونکہ تدبیر کا مؤثر ہونا اختیار سے خارج ہے اس لیے اس کے لیے دعا کرو اور دعا سے اس تدبیر میں برکت ہو جائے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اس دستور العمل پر روزانہ بلا ناغہ عمل کرو اور دعا بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین تمت۔

ادب الطریق

سلوک الی اللہ کے بارے میں ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ ہجری بروز بدھ بمقام میرٹھ محلّہ کرم علی ارشاد فرمایا:

ادب الاعتدال

۸ ربیع الثانی ۱۳۳۰ ہجری بمقام میرٹھ ریل میں یہ تقریر فرمائی۔

ادب الترک

۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۵ ہجری بروز سوموار ریل میں میرٹھ اور دیوبند کے درمیان یہ تقریر فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سالک کا کام طلب ہے

یہ تقریر اس وقت ہوئی کہ حضرت والا مقام زبر پور ضلع گورکھپور سے بیل گاڑی پر مقام شاہ پور کو روانہ ہوئے۔ بوجہ مسافت راستہ میں ایک پڑاؤ قصبہ گوالا میں کیا' رات کو وہاں رہے صبح کو شاہ پور کو روانہ ہوئے اس راستہ میں یہ تقریر ہوئی۔ حضرت والا کے ساتھ اس وقت احقر اور مفتی محمد یوسف صاحب رام پوری اور حضرت کے بھائی منشی محمد اختر صاحب اور ایک خادم اور تھے۔ مؤخر الذکر خادم ایک مولوی صاحب تھے ان سے خطاب شروع ہوا' فرمایا: آپ کے حالات سنے اور مختلف وقتوں میں سوالات سے اور بات چیت سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ عرض کیا ہاں کچھ پریشانی تو ضرور ہے فرمایا پریشانی کو چھوڑیئے اور حصول مقصود میں جلدی نہ کیجئے (یعنی اس کے جلدی حاصل ہونے کا انتظار نہ کیجئے نہ یہ کہ اس کی تحصیل میں جلدی نہ لگے) اس کا نتیجہ سوائے حیرانی کے کچھ نہیں آپ کا کام طلب ہے باقی حصول مقصود کے آپ مکلف نہیں میرے خیال میں یہی وجہ پریشانی کی ہے۔ مولوی صاحب کی حالت ان کلمات کو سن کر ایسی ہوئی جیسے کوئی بچہ کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد یکلخت اپنی مادر مہربان کے پاس پہنچ جاوے اور اس سے اپنی مصیبتیں کہنے لگے۔ آبدیدہ ہو کر عرض کیا سارا قصہ ہی کہہ دوں۔ میں ابتداء میں گیارہ مہینے حضور کی خدمت میں تھانہ بھون میں رہا' پھر کان پور چلا گیا' پھر گیا حضرت قدس سرہ حیات تھے۔ حضرت کی تجویز یہ ہوئی کہ مجھے نقشبندیت سے مناسبت ہے اور اسی کے موافق تعلیم فرمائی اس سے پریشانی بہت پیدا ہوئی حتیٰ کہ نیند بالکل ندارد ہو گئی اور دماغ مختل ہو گیا۔ حضرت نے مجھے بیعت تو نہیں کیا مگر تعلیم نقشبندیت کی کی پریشان ہو کر مکان پر آ گیا' چند روز بالکل قطع تعلق کر کے متوکلانہ بسر کی' لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا' حضرت قدس سرہ کا ۱۳۲۳ھ میں وصال ہو گیا۔ مولوی محمد سمیع صاحب میرے بھائی کو شاہ گنج لے گئے' وہاں ایک بزرگ تھے جو سلسلہ میں بڑے سید صاحب کے تھے' میرے بھائی کو ان سے بڑا نفع ہوا' تب وہ مجھ کو بھی

ان کے پاس لے گئے۔انہوں نے اول درود شریف پڑھنے کو بتلایا اور اس کے بعد مراقبہ ان کے یہاں مراقبہ کا ہونا ضروری ہے۔ پھر مراقبہ لطائف ستہ وغیرہ بتلایا' پھر بیعت میں بھی داخل کر لیا مگر میں ہمیشہ حضور کی اجازت ہر کام میں لے لیا کرتا تھا' ان کے بعض مریدوں میں پریشانی اور بدعقیدگی پائی گئی' اس واسطے میرا دل اُکھڑ گیا اور ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔اس کے بعد بہت پریشانی بڑھ گئی اور یہ خیال ہوا کہ تو تو کہیں کا بھی نہ رہا ان پر دل نہ جما اور کہیں جانے کی اس واسطے ہمت نہ ہوئی کہ وہ ناراض ہوں گے' عجیب کشمکش میں پڑ گیا' میرے حواس خراب ہو گئے کہ کیا کروں' اپنا سب سے بڑا مرجع حضور کو سمجھتا تھا۔ایسے وقت میں سوا حضور کے کسی پر نظر نہ پڑی مگر حضور تک جا نہ سکا' ادھر یہ خیال ستا تا رہا کہ بلا حاضری کے کچھ ہوگا نہیں تا ہم حضور کو خط لکھا اور اس بات کی اجازت چاہی کہ

اجازت اور مشورہ میں فرق

فلاں صاحب کے پاس جاؤں آپ نے اس کی اجازت دی۔حضرت والا نے فرمایا اجازت اور چیز ہے اور مشورہ اور چیز۔آپ نے اجازت کو مشورہ سمجھا میں اجازت تو عام طور سے دیتا ہوں کہ صلحاء کے پاس جانے میں کچھ حرج نہیں ہے اور مشورے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بات بتاؤں کہ جو صرف غیر مضر نہیں بلکہ مفید بھی ہو اس کی مثال یہ ہے کہ طبیب سے اجازت چاہتے ہیں کہ گنا کھالیں وہ اس کو اگر مضر نہیں دیکھتا تو کہہ دیتا ہے کھالو یہ اجازت ہے اور مشورہ یہ ہے کہ طبیب سے کہتے ہیں کہ آپ کے سپرد ہے جو مناسب تدبیر ہو بتلایئے۔وہ اس وقت ایسی تدابیر نہیں بتلائے گا جو غیر مضر اور مفید نہ ہوں بلکہ وہ تدابیر بتلائے گا جو مفید ہوں اس وقت یہ کبھی نہ کہے گا کہ گنا کھاؤ بلکہ اس وقت کہے گا گلو پیو اور شاہترہ پیو اور کونین کھاؤ اس وقت وہ آپ کا متبع نہ ہوگا بلکہ اپنی رائے کا متبع ہوگا۔خواہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہو اور یہ اتفاقی بات ہے کہ اس کی رائے آپ کی طبیعت کے موافق آپڑے' آپ نے مجھ سے اجازت چاہی تھی' میں نے اباحت کے درجہ میں منع نہیں کیا' مشورہ آج دوں گا۔میرا اصول یہ ہے کہ میں کسی کے کام میں دخل نہیں دیا کرتا جو لوگ مجھ سے کسی کام میں رائے لینا چاہتے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ ان کا دل کسی طرف راغب ہے یا

نہیں اگر دل ان کا کسی طرف راغب ہوتا ہے تو میں ان کو مقید کرنا نہیں چاہتا اور اگر اس کام میں کوئی خاص محظور نہیں ہے تو اس کام سے منع نہیں کرتا یہ مرتبہ اجازت کا ہے اور مشورہ کا موقع وہ ہے کہ رائے لینے والے کا دل کسی طرف مائل نہ ہو اس وقت میں وہ رائے دیتا ہوں جو علاوہ غیر مستلزم محظور ہونے کے مفید اور ضروری ہو بلکہ اپنے نزدیک وہ رائے منتخب کرتا ہوں جو مفید رایوں میں سے بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اور اس وقت بھی میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ رائے لینے والے کو مجبور کروں کہ ایسا ضرور کرو بلکہ خلوص کے ساتھ وہ رائے پیش کر دیتا ہوں اور اس بات کا دعویٰ بھی نہیں ہوتا کہ میری رائے ٹھیک ہی ہے۔

تصرفات دماغی

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی ہوا میں اپنا قصہ بیان کرلوں پھر آج حضرت مجھ کو مشورہ دیں آپ نے قرآن شریف اور درود شریف کی کثرت کی تعلیم فرمائی جس کا میں اب تک پابند ہوں' تین چار سال سے یہی حالت ہے کہ میں نہ ادھر کا ہوں نہ ادھر کا' پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں حالانکہ میں اس کے دفعیہ کی کوشش برابر کرتا ہوں جیسے کوئی کہتا ہے ویسے ہی کرتا ہوں مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ شیخ اول کو بھی چھوڑا طبیعت اس میں پریشان رہی کہ ان کا عتاب نہ ہو دوسرے کسی نے بھی کوئی تسلی بخش بات نہ بتلائی۔ جب کسی کے پاس گیا حضور سے اجازت بھی لے لی' خواب بہت دیکھے اپنے نزدیک اطمینان کر کے کسی کے پاس گیا' فرمایا خوابوں کا کیا اعتبار اول تو آج کل کسی کا خواب بھی معتبر نہیں' خصوصاً اس شخص کا جس کا دماغ مشوش ہو (مولوی صاحب نے چند خواب بیان کیے) فرمایا کہ سب میں احتمال ہے کہ حدیث النفس ہو خوابوں پر بنا کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں' ہاں استخارہ مسنون ہے۔ استخارہ کے بعد جس بات پر دل جمے وہ کرنا چاہیے اس میں امید صالح ہوتی ہے اور جب تک جمعیت قلب حاصل نہ ہو برابر استخارہ کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا استخارہ بھی بہت کیا۔ استخارہ میں یہ آیت قلب میں آئی ہے: ''اُولٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِنْ رَبِّهِمْ'' فرمایا حضرت مولانا نے کہ یہ غیر قابل اعتبار ہے میرے نزدیک یہ تصرفات دماغی ہیں' جس طرف رائے ہوتی ہے قوت واہمہ اسی طرف مائل ہو کر اجازت کی صورت میں دکھلاتی ہے۔ آپ مولوی آدمی علم رکھتے ہیں' ہمیشہ کو یاد کر لیجئے

کہ ایسی باتوں میں نہ پڑیئے۔ عرض کیا یہ آیت بھی قلب میں آتی تھی لیکن شکوک بھی رہتے تھے۔ فرمایا تشویش بڑھنے سے دماغ میں یبس آ گیا ہے اور قوت واہمہ کا فعل قوی ہو گیا ہے۔ یہ شکوک بھی اوہام ہیں۔ مولوی صاحب ساکت ہو گئے۔

نقشبندیہ' چشتیہ اور سہروردیہ کا خاصہ

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات یہ تشخیص کہ آپ کو نقشبندیت سے مناسبت ہے میرے دل کو بالکل نہیں لگی آپ کی مناسبت چشتیہ سے اتنی صاف ہے کہ شک کرنا بھی مشکل ہے۔ آپ کی طبیعت میں فطرتاً شورش اور وارفتگی موجود ہے۔ یہ عشق اور محبت کا مادہ ہے اور یہی چشتیت کا ماحصل ہے ایسے شخص کو نقشبندیت کی تعلیم کرنا فطرت کو بدلنا ہے جس سے کبھی نفع نہیں ہو سکتا۔ نقشبندی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں متانت ہوتی ہے ان کے مزاج سلاطین کے سے ہوتے ہیں۔ نقشبندی سلوک اہتمام کا ہے اس میں سب کام ضابطہ کے ہیں آپ کے مزاج کے مناسب تو بے سروپا سلوک ہے۔ آپ کو ضابطہ میں مقید کرنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ عرض کیا آپ کی صحبت میں تو مجھ کو سکون تھا اس کے بعد کہیں سکون نہیں فرمایا: ''**سبوح لها منها عليها شواهد الحمدلله**'' خود آپ کو اس بات کا اقرار ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری تشخیص صحیح تھی پھر آپ کو کیا سوجھی تھی کہ دوسری جگہ مارے مارے پھرے مگر اس میں بھی ایک نفع ہے۔ ''**الاشياء تعرف باضد ادها**'' (اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اب آپ کو زیادہ نفع کی امید ہے کیونکہ آپ کو حیرانی بہت ہو چکی اب اگر سکون ہو گا تو بہت آپ کو اس کی قدر ہو گی اور فرمایا ہاں ان کو نقشبندیت سے مناسبت تھی' غالباً ان کو دوسری جگہ پریشانی نہیں ہو گی ان سے ہمارا دل زیادہ نہ ملتا تھا' عرض کیا ہاں ان کو دوسری جگہ نفع ہوا تھا تب ہی تو انہوں نے مجھ کو بھی کھینچا۔ فرمایا یہ عجیب بات ہے کہ دو بھائیوں کا مزاج ایک سا ہی ہوتا ہے یہ تجویز صحیح نہیں ہے کہ ان کو نفع ہوا تو آپ کو بھی نفع ہو گا۔ نقشبندی نسبت عاقلانہ اور حکیمانہ ہے اور چشتیہ مجنونانہ ہے بس اب تو آپ کے حسب حال یہ ہے۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دور اندیش کو بہت آزمایا اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ عاشق بنالیا)

ایک شیخ کامل سے وابستہ ہونے کی ضرورت

آپ بہت مزے چکھ چکے اور دیکھ چکے کہ بھٹکے پھرنے سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا اب تو آپ ایک ہی طرف کے ہو جایئے (ایک شخص نے عرض کیا سہروردی خاندان میں کیا بات ہوتی ہے فرمایا وظائف زیادہ تر ہیں' اشغال بالکل نہیں اصلاح اعمال بہت ان کا طریقہ سلف کا سا ہے) مولوی صاحب نے عرض کیا بے شک مجھے آپ کے پاس رہنے سے بہت نفع تھا لیکن کیا کروں مجبوری ہے میں دور بہت ہوں' تھانہ بھون آنے اور رہنے کی مقدرت نہیں دور سے کیا ہو سکتا ہے۔ فرمایا: چند روز پاس رہنے کی ضرورت ہے پھر دور سے بھی کام ہو سکتا ہے اور فرمایا:

پریشانی کا بڑا سبب

میں اور زیادہ وسعت کرتا ہوں کئی طرف قلب کا کھنچنا' سبب ہے آپ کی پریشانی کا آپ کو جن جن حضرات سے تعلق ہوا ہے ان سے قطع تعلق کی نسبت آپ کا خیال ہے کہ باعث ناراضی ہے اور یہ خوف آپ کے دل میں بیٹھ گیا ہے اور یہی اصل ہے آپ کی پریشانی کی۔ اس کا ازالہ رفع سبب سے ہو سکتا ہے۔ جب سبب اس کا تعدد تعلقات ہے تو اس کا ازالہ ازالہ تعدد ہے میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ ایک طرف ہو جایئے' اتنا دل کمزور نہ کیجئے' آخر کون چیز آپ کو یکسو ہونے سے مانع ہے کسی کی ناراضی کا خوف ہے' ناراضی کا مضر ہونا کیسے معلوم ہو سکتا ہے اس کے لیے اگر کوئی معیار ہو سکتا ہے تو وہ شریعت ہے آپ غور کیجئے کہ یکسو ہونے میں آپ کون سا کام خلاف شرع کر رہے ہیں۔ جب کوئی کام خلاف شرع نہیں ہے تو حق تعالیٰ کی خفگی کا خوف تو ہے نہیں کسی انسان کی خفگی اگر ہوگی تو کیا ہوگا۔

ساقیا برخیز و دردہ و جام را　　خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　مانمے خواہم ننگ و نام را

(اے ساقی تلچھٹ شراب اور جام اٹھاؤ اور ماضی کے غم ایام پر خاک ڈال دو (انہیں بھلا دو) اگر چہ عاقلوں کے نزدیک یہ بدنامی ہے مگر ہم سوائے ننگ و نام کے اور کچھ نہیں چاہتے)

حضرت حاجی صاحبؒ کا عجیب طریقہ

اور میں کہتا ہوں جو انسان خفا ہو بعد اس کے کہ معلوم ہو جائے کہ حق تعالیٰ اس کام پر خفا نہیں وہ کیا انسان ہے اور اس کی خفگی سے کیا ہوگا اور وہ انسان ہے تو خفا ہوگا ہی نہیں آپ کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا ہے کہ پہلے شیخ خفا ہو جائیں گے، میں اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ اگر واقعی شیوخ ہیں تو ہرگز خفا نہ ہوں گے اس وہم کو قلب سے نکال دیجئے ہاں ان کی مخالفت نہ کیجئے اور ان کو اطلاع کر دیجئے تاکہ ان کو کسی دوسرے سے سن کر صدمہ نہ ہو اور کبھی ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ کیجئے۔ مجھے پریشانی کا مرحلہ ایسا پیش آچکا ہے کہ کم کسی کو آیا ہوگا' متین شیوخ ان مصیبتوں کو کیا جانیں' ان کا علم تو اسی شخص کو ہوتا ہے جو خود ان کو چکھ چکا ہے۔ مجھے بچپن سے خوش عقیدگی بہت تھی' سوظن کا مادہ بالکل نہ تھا' ہر شخص کے ساتھ اعتقاد ہو جاتا تھا اور اصلیت اس کی یہ تھی کہ مجھے طلب بہت تھی ایسی حالت تھی جیسے پیاسا پانی کو ڈھونڈتا ہے۔ ہر شخص پر یہی نظر پڑتی تھی کہ شاید اس سے کچھ مل جاوے یہ حالت بہت خطرناک ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ نے فضل کیا کہ کسی جعلساز اور مکار کے پھندے میں نہیں پڑ گیا۔ اول حضرت گنگوہیؒ سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر حضرت نے طالب علمی کے سبب انکار کیا۔ پھر حضرت حاجی صاحب کے پاس پہنچا یہ ابتداء زمانہ شباب کا ذکر ہے حضرت کے پاس سے لوٹ کر آیا تو سیری نہ ہوئی تھی جو کچھ حضرت حاجی صاحب نے تعلیم فرمایا وہ کرتا رہا مگر اس میں انتظار ہوا ثمرات کا اور انتظار بھی تعجیل کے ساتھ میں یہ چاہتا تھا کہ آج ہو جاوے جو کچھ ہونا ہے مل گئے۔ صاحب اور انہوں نے خود خواہش کی کہ مجھ سے کچھ حاصل کرو' میں طالب تھا ہی اور عقیدت کا مادہ بہت بڑھا ہوا تھا میں نے منظور کر لیا۔ انہوں نے کچھ بتلایا میں نے اس کے موافق شغل شروع کر دیا تو اس قدر پریشانی بڑھ گئی کہ بیان نہیں کر سکتا' دل دو طرف کھنچتا تھا اور دونوں تعلیموں میں کچھ اختلاف بھی تھا۔ ایسے وقت میں اس شخص کی حالت جس کی پیاس بڑھی ہو اور تعجیل حد سے زیادہ ہو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں دو مہینے تک یہ حالت رہی کہ خودکشی تک کے وسوسے آتے تھے' اگر حق تعالیٰ کی دستگیری نہ ہوتی تو خودکشی میں کچھ بھی کسر نہ تھی حتیٰ کہ ایک روز تنہائی میں ایک شخص میرے پاس آئے ان کے ہاتھ میں

بندوق تھی اس وقت میں بالکل آمادہ ہوگیا کہ اپنی خواہش ان سے ظاہر کردوں کہ میں حیات سے تنگ آ گیا اب دنیا کو مجھ سے پاک کردو اور قریب تھا کہ ان سے کہہ ہی بیٹھوں پھر سوچا کہ یہ کسی طرح مانیں گے نہیں ہر شخص کو اپنا پس وپیش بھی تو ہوتا ہے۔ قتل وہ شخص کرسکتا ہے جو اپنی جان کھونے پر پہلے آمادہ ہوجائے پھر میرے وہ کوئی مخالف نہیں تھے بلکہ محبت رکھنے والے تھے' یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ ایسی بے ہودہ بات کو مان لیں' سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ میرا اچھچھوراپن ظاہر ہوتا' اس خیال سے زبان پر آئی ہوئی بات رک گئی' خدا تعالیٰ کو بہتر کرنا تھا' غرض اس قدر پریشانی تھی کہ یہ نوبتیں ہوگئیں' بالآخر حضرت حاجی صاحب کو لکھا' حضرت گنگوہی کو اس واسطے اطلاع نہ کی کہ میں خود جانتا تھا کہ مولانا یہی کہیں گے کہ سب کو چھوڑ کر ایک طرف ہوجاؤ اور میرے دل میں خیال یہ جما ہوا تھا کہ ''خذما صفا ودع ماکدر'' حضرت حاجی صاحب کو لکھا حضرت کو سخت تشویش ہوئی۔

حضرت کو مجھ سے بے حد محبت تھی' حضرت پریشان ہوگئے اور سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ جوان آدمی ہے جوش بڑھا ہوا ہے تحمل نہ ہوا' وہاں سے کوئی صاحب آنے والے تھے' زبانی کہلا بھیجا کہ جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی سے رجوع کرتے ہو۔ حضرت کی عادت کے بالکل خلاف ہے کبھی کسی کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں کہا مگر میرے ساتھ اس قدر خصوصیت تھی (حق تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا) کہ یہ لفظ فرمائے اور خط بھی لکھا۔ میں کانپور میں تھا' ظہر کا وقت تھا' یہ پیام اور خط پہنچا وہ اثر کیا اس نے جو آگ پر پانی کرتا ہے مغرب کا وقت نہ آیا تھا کہ سب پریشانی رفع ہوگئی۔ پھر اطمینان سے کام کرتا رہا' الحمدللہ حضرت کی برکت سے طریق کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔

شیخ اول کو قطع تعلق کی ضرورت اطلاع

پھر یہ وسوسہ ہوا کہ دوسرے صاحب سے قطع تعلق ہوگا تو ناراض ہوں گے۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں' سمجھ میں یہ آیا کہ گول مول بات رکھنا تو ٹھیک نہیں' اطلاع کردینا چاہیے۔ پھر خفا ہوں یا کچھ ہوں جوانی اور ہوشیاری کا عالم تھا ایک تدبیر کے ساتھ ان سے قطع تعلق کیا تاکہ قطع کی نسبت انہیں کی طرف رہے وہ ...... میں تھے میں نے ان کو خط لکھا کہ

"بمقتضائے الدین نصح" (دین خیر خواہی کا نام ہے) میں نہایت ادب خیر خواہانہ عرض کرتا ہوں کہ بعض باتیں آپ کی خلاف شرع ہیں ان کو چھوڑ دیجئے اور میں نے یہ بھی لکھا کہ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حالت شریعت کے مطابق ہو جاوے اس سے وہ بے حد خفا ہوئے اور خود ہی قطع تعلق کر دیا اور نہایت خفگی کا خط آیا جس میں یہ بھی تھا کہ میں تم کو وہ دولت دینا چاہتا تھا جو مجھ کو حضرت علیؓ سے پہنچی ہے تم اس کے اہل تھے مگر قسمت تمہاری اور اخیر میں یہاں تک لکھا تھا کہ دعا کرو خدا میرا میرے زندقہ پر اور تمہارا تمہاری شریعت پر خاتمہ کرے' میری جو غرض تھی یعنی قطع تعلق وہ پوری ہو گئی' میں بے قصور تھا اس واسطے میں نے اس کی کچھ پروا نہ کی پھر...... وہ صاحب تھانہ بھون آئے یہ وقت میرے واسطے بہت نازک تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اب ان سے ملاقات ضروری ہو گی' میں کیا عذر کروں گا اور یہ ممکن نہیں کہ میں ملوں نہیں مگر میں دل کڑا کر گیا تو ان سے ملا نہ ان کے پاس گیا نہ کچھ کہا نہ کچھ سنا۔ انہوں نے جب ایسا دیکھا تو بہت برا بھلا کہا۔ ایک لوہار نے اس کو مجھ سے نقل کرنا چاہا اور میرا طرف دار بن کر ان صاحب کی شان میں کچھ گستاخی کرنا چاہی میں نے اس کو ڈانٹ دیا کہ خبردار جو کچھ کہا ہم جانیں اور وہ جانیں تم کون بیچ میں بولنے والے۔ (بحمد اللہ میں نے تہذیب سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا) وہ میرے بزرگ ہیں ان کو منصب ہے کہنے کا اور جانے کتنی دفعہ انہوں نے ہم کو بچپن میں مارا ہو گا اور ہم نے کتنی دفعہ ان پر پیشاب کیا ہو گا ہم اور وہ دو دو نہیں ہیں اس نے یہ باتیں جا کر ان سے نقل کر دیں اس کا بڑا اثر ہوا' پھر ایک شخص نے ان سے کہا آپ ہی مل لیجئے کہا مل تو لوں مگر میرا خیال ہے کہ مجھ سے نہ ملے گا اور کہیں ٹل جاوے گا اس نے کہا نہیں ایسا ہرگز نہ ہو گا میں ذمہ دار ہوں مگر ان کو بہت غیظ تھا کہا میں ملوں گا بھی تو بڑا بن کر تو ملوں گا نہیں وہ بڑا سمجھتا تو خود ہی آ کر نہ ملتا' ہاں رند بن کر ملوں گا اور پائجامہ اتار کر اس کے سامنے جاؤں گا تو کیا اس حالت میں بھی وہ مجھ سے ملے گا' اس شخص نے کہا کہ اس حالت میں میں ذمہ نہیں کرتا۔ اسی اثناء میں عید آ گئی' اتفاق سے ان سے مڈبھیڑ ہو گئی مگر میں نے سلام نہیں کیا' اس پر بڑے خفا ہوئے پھر بقر عید آ گئی مجھے اس وقت قرائن سے معلوم ہو گیا کہ آج امامت کرنا پڑے گی تردد ہوا کہ میں ان کے سامنے نماز کیسے پڑھاؤں گا' ان کو امام بنانا چاہیے مگر اس کو اور لوگ شاید نہ مانیں اور میں امام بن گیا تو علاوہ

بدتمیزی کے ان کو کدورت رہے گی کیونکہ مجھ کو باطل پرست سمجھتے ہیں۔ آخر یہ کیا کہ نماز جلال آباد جا کر پڑھی' غرض ان سے بول چال نہیں ہوئی' پھر وہ چلے گئے اور وفات بھی ہوگئی بس سن لیا آپ نے بہت یوں کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا اس سے پریشانی ہے کہ میں حضرت سے دور ہوں اور حضوری کی کوئی صورت نہیں' فرمایا آپ کچھ بھی کہیں لیکن بڑی وجہ پریشانی کی کشاکشی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ان قصوں سے نفع یہ ہے کہ آپ کو راہ کی بصیرت ہوئی' مجھے اس پریشانی سے بڑا نفع ہوا' گھر میں اس کی مثال دیا کرتے ہیں کہ ایسا ہے جیسے کوئی گلستان میں رستہ قطع کر رہا تھا' درمیان میں برابر ایک خارستان آ گیا' یہ شخص اس میں جا گھسا' پھر لوٹ پھر کے اسی گلستان میں آ کر چلنے لگا تو اس کو مقصود کی قدر زیادہ ہوئی ہے۔ نیز اس کو اس خارستان میں گزرنے سے تمام ان دشواریوں کا عمل ہو جاتا ہے جو راہ میں پیش آتی ہیں پھر وہ دوسروں کو لے چلنے میں بڑا ماہر ہو جاتا ہے گھر میں سمجھ اس فن کی بہت اچھی ہے ہاں عمل میں نہیں۔ افسوس کہ ایسا آدمی کام نہ کرے' کام نہ کرنے سے بعضے اخلاق بھی بے اصلاح ہیں اور اس پریشانی سے مختلف شیوخ کے بعد حضرت کی دستگیری دیکھ کر بڑا نفع ظہور شان حاجی صاحب کا ہوا' زمانہ قبض میں اوروں سے بھی رجوع کیا' حضرت کسی نے وظیفے بتا دیئے اور کسی نے کچھ کسی نے کچھ محقق ایک بھی نہ ملا۔ حضرت کا عجیب طریقہ تھا اور اصل میں مرض کو ایسا صحیح پکڑ لیتے تھے کہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا اور شفقت ایسی تھی کہ نظیر ملنا مشکل ہے اسی وجہ شفا حکمی ہوتی تھی۔ حضرت مولانا گنگوہی بھی حضرت ہی کے طریقہ پر تھے اور حضرت کے طریقہ کے پورے جامع تھے مگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ چلتا تھا کیونکہ مولانا کو مجلس میں اصول و فروع کے بیان کا اہتمام نہ تھا۔ صرف ایک عالم معلوم ہوتے تھے اور میں ایسا اوچھا ہوں کہ کسی بات کو نہیں چھپاتا' میرا خیال ہے کہ فن تصوف کو آج کل طشت از بام کرنا چاہیے' ہزاروں قسم کی گمراہیوں اور تلبیسوں میں لوگ پڑے ہوئے ہیں اصلاح بلا اس کے کیسے ہو میں اصول و فروع سب کو کھلم کھلا بیان کر دیتا ہوں' چھپانے کی چیز اپنی حالت ہے (میرا خیال اس کی نسبت بھی یہ ہے کہ خاص خاص لوگوں کے سامنے بمصلحت اس کو بھی ظاہر کر دے تو حرج نہیں) اپنی حالت ایک راز ہوتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ دوسروں پر اس کا ظاہر کرنا حق تعالیٰ کی غیرت کے خلاف ہے اور فن کو تو علی الاعلان

پکار پکار کر ظاہر کرنا اور شائع کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا مجھے عقیدت راسخ تو آپ سے ہی ہے۔ فرمایا مجھے اس کا انتظار ہی نہیں کہ دوسرے کسی سے اتنا عقیدہ نہ ہو جتنا مجھ سے ہو محبت احباب کا تو انتظار ہے محبت اور عقیدت الگ الگ چیزیں ہیں' خدا کا کوئی طالب ہو اور مجھ سے سو دفعہ قطع کر دے پھر میں ویسا ہی خادم ہوں میں اس کو بڑی تنگ ظرفی سمجھتا ہوں جو آج کل کے مشائخ میں ہے کہ ذرا طالب جدا ہوا تو مردود بنایا' پھر کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے کوئی ان سے پوچھے کہ تم سے بھی اپنے شیخ کے ساتھ کوئی غلطی ہوتی تھی یا معصوم تھے اور بسا اوقات طالب سے غلطی کثرت محبت کی وجہ سے ہو جاتی ہے اس کی تو قدر کرنا چاہیے' اس وقت اس کو مردود بنانا خود ان ہی کی غلطی ہے ایسا طالب تو بے بہا نعمت ہے ہر چھوٹا چھوٹا نہیں ہوتا بعض وقت حق تعالیٰ بڑے لوگوں پر چھوٹوں کی برکت سے فضل فرماتے ہیں اس وقت بڑا بننا تکبر ہے حقیقت میں بڑا وہ ہے۔

فرمایا مولوی صاحب آپ کے پاس تو عذر بھی ہے اوروں سے قطع تعلق کرنے کے لیے کہ میں پہلے سے تھانہ بھون ہی سے تعلق رکھتا ہوں۔ "ماالحب الا للحبیب الاول" (سوائے حبیب اول کے کسی اور سے محبت نہیں) بس ایک طرف ہو جائیے ہاں اتنا ضرور ہے کہ پہلے شیخ کو گو وہ کیسے ہی بے نفس ہوں اطلاع کر دیجئے تاکہ آپ کا اور ان کا دونوں کا قلب مطمئن ہو جاوے' اطلاع نہ کرنے میں آپ کو یکسوئی نہ ہوگی۔ مولوی صاحب نے عرض کیا نہیں بلکہ میرے قلب کی حالت یہ ہے کہ اطلاع کرنے میں یکسوئی نہ رہے گی' فرمایا تو اطلاع کی ضرورت نہیں کوئی گناہ تو کر ہی نہیں رہے بس ایک طرف ہو کر بنام خدا کام شروع کیجئے' آپ کو چشتیت کی تعلیم ہونا چاہیے' آپ کا ہر حال اس کا شاہد ہے' چشتیہ اور نقشبندیہ دونوں کی شان میرے مذاق میں تو اسی ایک شعر سے واضح ہوتی ہیں (رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار یہ چشتی کی حالت ہے کہ ع کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش) یہ نقشبندی کی حالت ہے کہ ہر کام میں انتظام اور تدبیر ہوتی ہے جیسے سلاطین میں ہوتی ہے۔

طالب اور مطلوب کی باہم احتیاج

مولوی صاحب نے عرض کیا حضور کی دعا سے اس وقت میرے قلب کو بہت طمانیت حاصل ہوئی مگر مشکل یہ ہے کہ سامنے آپ کے اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے اور' فرمایا یہ ضرور

ہے مگر یہ تقلب مضر نہیں پریشانی کبھی نہ ہوگی اس قسم کا تغیر ہر شخص کو پیش آتا ہے۔ مرید تو کیا شیخ کی حالت میں بھی وقت افادہ اور غیر افادہ میں فرق ہوتا ہے' مرید کو شیخ کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہی ہے شیخ کو بھی مرید کی بدولت بہت سی باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

بانگ مے آید کہ اے طالب بیا　　　جود محتاج گدایان چون گدا

(آواز آتی ہے کہ اے طالب آ سخاوت بھی گداگروں کی طرح گدائی کی خوہشتاج ہے)

دیکھئے مدرسہ میں مدرس طالب علموں کے افادہ کے لیے مقرر ہوتا ہے اور طالب علموں کو اس سے نفع پہنچتا ہے اور طالب علموں کا نفع اس پر موقوف ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مدرس کو طالب علموں سے کچھ نفع نہیں پہنچتا' آپ خود عالم ہیں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں بارہا کا تجربہ ہے کہ کوئی مضمون کتاب میں پڑھتے وقت باوجود کوشش اور مطالعہ کے اور باوجود استاد کے سمجھانے کے سمجھ میں نہ آیا اور ہمیشہ اس میں الجھن رہی اور جس وقت طالب علم پڑھنے بیٹھا' قلب میں دفعتاً آ گیا یہ طالب علم ہی کی برکت ہے یا کچھ اور فائدہ کے وقت حق تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے' طالب اور مطلوب کی باہم احتیاج کے لیے یہ شعر حافظ کا خوب ہے۔ شعر

سایہ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد
مابا او محتاج بودیم اوبما مشتاق بود

(معشوق کا سایہ اگر عاشق پر پڑ گیا تو کیا ہو گیا ہم اس کے محتاج ہیں وہ ہمارا مشتاق ہے)

اسی شعر میں مولانا کے شعر مذکور سے ادب ازید ہے اس میں طالب و مطلوب میں مساوات سی پائی جاتی ہے اور اس میں لفظ بدل دیا' طالب کے لیے احتیاج اور مطلوب کے لیے اشتیاق اطلاق کیا۔

ادب الاعتدال

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

حامدا و مصلیا

طالب کی جانچ

موضع اعظم گڑھ میں زائرین کا بہت ہجوم ہوا اور بہت سے ان میں اس بات کے طالب ہوئے کہ ہماری بستی میں تشریف لے چلئے' فرمایا وقت بہت تنگ ہے' میں خواجہ عزیز الحسن صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک مقام پر ریاست بھرت پور میں جاؤں اور ان کو لکھا جس کا دل چاہے مجھ کو منگل کے روز الٰہ آباد میں ملیں آج اتوار ہے مجھ کو پرسوں الٰہ آباد پہنچنا ضروری ہے' بیچ میں سرائے میر اور فتح پور کا بھی وعدہ کر چکا ہوں' اب اتنا وقت کسی طرح نہیں ہے کہ کہیں جاسکوں۔ فتح پور کے لیے بھی بمشکل دو گھنٹے ملے ہیں اور مقامات پر جانے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تو میں الٰہ آباد چلا جاؤں اور خواجہ صاحب سے مشورہ کروں وہ وہاں ملیں گے اگر وہ اپنے ساتھ لے جانا ملتوی کر دیں تو الٰہ آباد سے پھر لوٹ آؤں' گو مجھ کو اس میں تکلیف ہوگی مگر خیر میں اس کو گوارا کروں گا' بدنظمی نہ ہونی چاہیے لیکن اس کے لیے بھی کئی شرطیں ہیں' ایک یہ کہ میں حتمی وعدہ نہیں کرتا کہ میں لوٹ آؤں گا۔ خواجہ صاحب سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے ہوگا اس پر عمل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں خواجہ صاحب پر زور نہیں دوں گا کہ وہ اپنے ساتھ نہ لے جائیں اس واسطے مناسب

ہے کہ جس جس کو مجھے اپنے یہاں لے چلنا ہو وہ سب اپنا اپنا ایک ایک وکیل جوان کے نزدیک معتمد علیہ ہو میرے ہمراہ بھیج دیں وہ وکلاء وہاں خواجہ صاحب سے کہیں اگر خواجہ صاحب نے منظور کرلیا تو میں ان وکلاء کے ساتھ واپس آجاؤں گا اور اس میں بھی شرط یہ ہے کہ معتد بہ تعداد مقامات کی ہو جاوے ایک دو جگہ کے لیے اتنے لمبے سفر کو دہرانا نہیں ہوسکتا اس وقت لوگ مقامات کے نام لکھوادیں اگر تعداد معتد بہ ہوگئی تو خیر یہ طول گوارا کیا جاوے گا۔ لوگوں نے کہا کہ خواجہ صاحب کو تار دے دیں فرمایا تار کے قصے بہت دیکھے ہیں مشورہ طلب باتوں میں تار سے کچھ کام نہیں چلتا کیونکہ اتنا مضمون تار میں کیسے جاسکتا ہے آپ لوگ آپس میں مشورہ کر کے وکلاء منتخب کرلیں اور میرے پاس لے آویں اگر پانچ مقام بھی ہوگئے تو میں چلا آؤں گا۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد چار جگہ کے آدمیوں نے آمادگی ظاہر کی وہ چار جگہ یہ ہیں ہمی پور پوروا معروف مبارک پور بہادر گنج ان سب نے پوری آمادگی ظاہر کی لیکن جب موسے روانہ ہوئے تو اسٹیشن پر انبوہ میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کس کس کے وکیل ساتھ ہیں جب ریل میں بیٹھ گئے اور روانہ ہوگئے تو فرمایا جو جو لوگ بلانا چاہتے تھے انہوں نے اپنے اپنے وکیلوں کے بھیجنے کا کیا انتظام کیا۔ خدام نے عرض کیا ہم کو نہیں معلوم ظاہراً تو لوگ سست ہوگئے اس وجہ سے کہ ان کو پوری امید نہیں رہی فرمایا میں جب کسی کا بلایا ہوا جاتا ہوں تو اس کے آدمی کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں بس یہ کام ساتھ رہنے کا مشکل ہے صرف بلاوا دے دینا تو کچھ بات نہیں تمام راستہ کا بار سفر کا اور انتظامات کا مدعو کے سر رہتا ہے بلانے والے کی صرف زبان ہلتی ہے اور بہت سے بہت یہ کہ روپیہ خرچ کردیا جب انتظام کا بار اپنے ذمہ پڑتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ بلانا کیا چیز ہے انتظام کارے دارد۔ اس سے طلب کی بھی جانچ ہوجاتی ہے جو طالب ہوگا وہ سو بکھیڑے اپنے ذمہ لے گا اور اس میں اپنی آسائش بھی ہے وہ راستہ اور سفر کی ضروریات سے جیسا کہ داعی کا آدمی واقف ہوسکتا ہے ایسا مدعو نہیں ہوسکتا اسی سفر میں اگر بھائی اکبر علی کا آدمی گورکھپور سے ساتھ نہ ہوتا تو ڈوری گھاٹ کے اسٹیشن پر کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا جو کچھ تجویزیں ہم نے اور بھائی اکبر علی نے کی تھیں کہ سواری

وغیرہ کا انتظام پورا کر دیا تھا وہ سب درمیان میں ایک جگہ ریل نہ ملنے سے الٹ پلٹ ہوگئیں۔ اگر وہ خدمت گار نہ ہوتا تو سردی میں اور اندھیرے میں رات کو کہاں پڑتے۔ وہ واقف تھا اس نے اتنا تو کر لیا کہ دھرم شالہ میں جا ٹھہرایا' میں کہیں از خود جانے سے بڑی عار رکھتا ہوں حالانکہ بہت ہی مخلص آدمی ہو کہ اس کے یہاں جانے میں کچھ تامل نہیں کرتا اس سے شرطیں لگانے کو تکلف اور ایذا سمجھتا ہوں اور بلا خاص تعلق کے کسی کے یہاں جانے میں میں بہت ہی شرطیں لگاتا ہوں اور پوری طرح دیکھ لیتا ہوں کہ وہ دل سے بلاتا ہے یا نہیں اور ابھی کوئی دینی یا دنیاوی مفسدہ تو اس پر مرتب نہیں' پوری طرح چھان بین کر کے جب جاتا ہوں حتیٰ کہ بعض لوگ میری ان شرائط کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مزاج میں بہت خودکشی ہے مگر تعجب ہے کہ اس پر بھی ایک مہربان نے اس کو آوارہ گردی سمجھ کر اعتراض کیا۔

اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہیے

یہ ایک صاحب ہمارے مجمع کے مخالف ہیں' بڑے ناز نخروں سے سفر کرتے ہیں۔ ایک موقع پر کسی نے بلایا تو طعنہ کے طور پر کہا کہ ہم پٹواریوں کی طرح مارے مارے نہیں پھرتے اور ایک دفعہ بعض اہل بدعت نے وہابیوں کی شناخت یہ بھی چھاپی تھی کہ دور دور کی دعوتیں کھاتے ہیں' کیا مشکل ہے ایک طرف تو وہ اعتراض کہ یہ اپنے آپ کو کھینچتے ہیں اور ایک طرف یہ کہ پٹواری بنا دیا اگر معترضین کے کہنے کا خیال کیا جاوے تو زندگی محال ہے اس واسطے آدمی کو چاہیے کہ اپنا معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ صاف رکھے اور دنیا کو بکنے دے کوئی کچھ کہا کرے۔ احقر نے عرض کیا تعجب ہے کہ مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں اور تکلف کی دعوتیں چاہتے ہیں' منہ سے مانگ کر لیتے ہیں جیسے مناظرہ رام پور میں ہوا کہ قادیانی لوگ فرمائش کر کر کے بہت سا گھی اور شکر اور انڈا اور مرغی بکرے کا گوشت اور کیا کیا روزانہ لیتے تھے اور سفر خرچ میں بھی نواب صاحب سے سینکڑوں کی رقم وصول کی بخلاف ہمارے مجمع کے کہ کبھی کوئی فرمائش نہیں کی اور بہت اصرار کی بھی تو ماش کی دال کی اور سالن میں گھی کم کر دینے کی۔ فرمایا ہاں بہت جگہ دیکھا کہ یہ لوگ گھڑ گھڑ کے وصول کرتے ہیں کسی کے پانچ انڈے روز مقرر ہیں اور کسی کے ناشتے میں حلوا اور پراٹھے مقرر ہیں' کسی کی فیس بہت زیادہ مقرر ہے جو علاوہ

سفر خرچ کے وصول کی جاتی ہے غرض سیاحین میں کوئی مجمع صلحاء کا نہیں دیکھا کہیں یہ نہیں دیکھا کہ دس پانچ آدمی ایسے ہوں جن کو صالح اور دین دار کہا جا سکے کوئی شاذ و نادر اور اکیلا دین دار ہوتو ہو اور ہمارے ہاں بحمد اللہ اتنے دیندار موجود ہیں کہ مجمع کے مجمع ہو سکتے ہیں۔ ہر مجمع میں ممکن ہے کہ دس پانچ آدمی ایسے دکھائے جا سکیں جن کا صالح ہونا مسلّم ہو۔

احناف تفقہ فی الدین رکھتے ہیں

اکثر غیر مقلد لوگ اپنا نام اہلحدیث رکھتے ہیں لیکن حدیث سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا صرف الفاظ پر رہتے ہیں اور حدیث میں جو بات سمجھنے کی ہے جس کی نسبت وارد ہے: "مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ"[1] (جس شخص سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں) وہ اور چیز ہے اگر وہ صرف الفاظ کا سمجھنا ہوتا تو کفار بھی تو الفاظ سمجھتے تھے وہ بھی فقیہ ہوتے اور اہل خیر ہوتے۔ "تفقہ فی الدین" یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ دین کی حقیقت کی پوری معرفت ہو سو ایسے لوگ حنفیہ میں بکثرت ہیں۔ حضرت حاجی صاحب ایک شیخ تھے، عالم ظاہری پورے نہ تھے مگر تحقیق کی شان یہ تھی کہ ایک شخص بھوپال سے حج کرنے آئے تھے، حضرت سے بیعت ہوئے ان کے ساتھ ایک دوسرے شخص بھوپال کے تھے جو سخت غیر مقلد تھے اور ان پہلے صاحب کو بھی وہ غیر مقلد سمجھتے تھے۔ ان بھوپالی غیر مقلد صاحب نے اس سے سمجھا کہ حضرت غیر مقلد کو بھی بیعت کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ان صاحب کی معرفت حضرت حاجی صاحب سے دریافت کرایا کہ میں بھی بیعت ہونا چاہتا ہوں مگر غیر مقلد ہی رہوں گا۔ حضرت نے اس شرط کو منظور فرما لیا پھر وہ خود حاضر ہوئے اور تصریحاً پوچھا فرمایا ہاں کچھ حرج نہیں۔ بس بیعت کر لیا لیکن بیعت ہونا تھا خدا جانے کیا اثر ہوا کہ اس کے بعد اول ہی وقت نماز میں نہ آمین کہی نہ رفع یدین کیا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو حضرت چونک اٹھے اور بلا کر ان سے پوچھا کہ اگر آپ کی تحقیق اور رائے بدل گئی تب تو خیر اور اگر میری خاطر سے ایسا کیا تو میں ترک سنت کا وبال اپنے اوپر نہیں لیتا۔ یہ دیکھئے تحقیق کی شان ہے اور سنت سے ہمارے حضرات

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۲۸ کنز العمال: ۲۸۷۰۵)

کو اور خصوصاً حضرت حاجی صاحب کو سنت کے ساتھ غایت درجہ کا تعشق تھا پھر ایسے لوگوں کو متعصب کہا جائے تو کس قدر ظلم ہے ہاں متصلب ہیں، متعصب نہیں۔ تصلب اور چیز ہے اور تعصب اور چیز متصلب فی الدین اس شخص کو کہتے ہیں جو دین میں پختہ ہو اور متعصب ناحق ہٹ کرنے والے کو کہتے ہیں۔

علماء کے متعصب نہ ہونے کی مثال

علی گڑھ کالج کے بعض طلبہ نے مجھ سے کہا کہ علماء متعصب ہیں، میں نے کہا کہ ایک مثال دیتا ہوں اور آپ ہی پر فیصلہ رکھتا ہوں اس سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ سنا ہے تمہاری ماں اول رنڈی تھی پھر نکاح کر لیا، اس کے بعد تم پیدا ہوئے کیا یہ بات صحیح ہے۔ سو اول تو اس میں عیب کیا ہے کہ ایک عورت رنڈی تھی، اس نے توبہ کر لی اور نکاح کر لیا، اس کے بعد جو اولاد ہوگی وہ تو حلال کی ہوگی اس سے اس شخص کے نسب میں کچھ طعن نہیں ہوتا۔ دوسرے اس سے قطع نظر اگر یہ بات واقع ہو تب تو ایک واقعی بات کے تحقیق کرنے میں کچھ بھی حرج نہیں، اب میں پوچھتا ہوں آپ سے کہ میں فرضی صورت کو چھوڑ کر یہی صورت اختیار کرتا ہوں کہ یہ بات واقعی ہو اور ایک مجمع میں بیان کی جائے تو کیا وہ شخص ٹھنڈے دل سے اس واقعہ کو سن کر جواب دے گا یا جوش کے مارے آپے میں نہ رہے گا بلکہ اگر اس پر جوش نہ ہو تو آپ کے نزدیک یہ داخل بے غیرتی ہوگا یا نہیں اور اگر آپ انکار کریں تو ہم امتحان کر کے دکھا دیں۔ بتلایئے کہ اس کو جوش کیوں ہوگا اور یہ جوش کا ہونا آپ کے نزدیک بجا کیوں ہے اور جوش کا نہ ہونا بے غیرتی کیوں ہے۔ اگر وہ شخص واقعی بات کہتا ہے تب تو سچی بات پر غیظ آنا کیا معنے اور اگر جھوٹی بات کہتا ہے تب بھی جوش کے کچھ معنی نہیں، خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس کی ماں میں یہ عیب نہیں اور اس کہنے والے کو نرمی سے اور دل سوزی سے اور جن الفاظ کو وہ پسند کرے ان الفاظ سے سمجھا دینا چاہیے کہ بھائی یہ بات غلط ہے اور اگر نہ مانے تو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس سے کچھ تعرض نہ کرنا چاہیے تو اس پر جوش ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اپنی ماں کی عزت ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ اس کی نسبت کوئی برا لفظ سننا قطع نظر واقعیت اور غیر واقعیت سے گوارا نہیں ہوتا بس ہم کو ہماری نظر میں

دین کی عزت ماں سے زیادہ کوئی ناشائستہ لفظ دین کی نسبت سننا گوارا نہیں ہوتا اور فوراً جوش آ ہی جاتا ہے اور جوش نہ آنے کو ہم بے غیرتی سمجھتے ہیں۔ سوال کی طرح سوال کر و تب دیکھو ہم ناراض ہوتے ہیں یا نہیں، خود ہماری کتابوں ہی میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسے سوال لکھے ہوئے ہیں جن سے توحید اور رسالت اڑی جاتی ہے اور علماء نے ان کے جواب نہایت متانت سے دیئے ہیں۔ غیض وغضب کا کچھ کام نہیں، ان سوالوں میں تحقیق مدنظر ہے اور آپ لوگوں کو تحقیق مدنظر نہیں صرف استہزا بالدین اور چھیڑ چھاڑ منظور ہے سو اس کو تو ہم کبھی نہیں سن سکتے۔ یہ جواب ہے تمہارے سوال کا اور اگر اس کو بھی تعصب ہی کہتے ہو تو دوسری بات لیجئے، آپ ایسے متعصبین سے تحقیق ہی نہ کیجئے ایسے جوش کے حضرات پرانے علماء ہیں جنہوں نے کبھی ایسی بددینی کی باتیں نہ سنیں تھیں، آپ ہم سے پوچھئے ہم ایسے غیرت دار نہیں۔ وجہ یہ کہ ہم تمہاری صحبت سے اور بار بار سننے سے بے غیرت ہو گئے ہیں، ہم سے بے تکلف پوچھئے جو کچھ پوچھنا ہو۔ جن صاحب نے یہ کہا تھا کہ علماء میں تعصب ہے ان پر تو ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً میرے موافق بن گئے اور طالب علموں کو بھی سنا کہ آپس میں کہتے تھے جس کو جواب لینا ہو یہاں آ جاؤ مگر کسی کو مگر حضرت نے خود ہی سنے سنائے شبہات کو جمع کر کے ان کا حل کیا اس رسالہ کا نام "**الانتبهاه المفیده عن الاشتباهات الجدیده**" رکھ دیا یہ جامع رسالہ قابل دید ہے اس کو علم کلام جدید کہنا چاہیے اس کی نظیر پہلے کبھی نہیں ہوئی یہ توفیق نہ ہوئی کہ سوالات کرتے بلکہ ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنے شبہات آزادی کے ساتھ لکھ کر بھیج دو، یہ بھی کسی سے نہ ہوا ان لوگوں کی باتیں ہی باتیں ہیں، دوسرے کے سر الزام رکھ کر خود کام سے بچنا چاہتے ہیں۔

نرمی اور مداہنت میں فرق

غرض علماء سے بدگمانی دور ہی دور سے ہے ہمارے علماء تو ایسے کریم النفس اور شفیق ہیں کہ ان سے نفرت ہو ہی نہیں سکتی لیکن تصلب کیسے چھوڑ دیں، نرمی اور چیز ہے اور مداہنت اور چیز ہمارے علماء نرم تو بہت ہی زیادہ ہیں ہمارے علماء کو کوئی تحریر دل آزار نہیں دکھائی جا سکتی وہاں جواب ایسا ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ آ سکے۔ تحقیق کی شان یہ ہے لیکن کہیں کوئی

کلمہ بے ہودہ نہ ہوگا' بات کا جواب پورا دیں گے' کسی کی رو رعایت نہ کریں گے' ان سے مداہنت نہیں ہو سکتی۔ یہ طریقہ ان کو پسند نہیں کہ گنگا پر گئے تو گنگا داس اور جمنا پر گئے تو جمنا داس' آج کل لوگوں نے یہ شعر یاد کر لیا ہے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

(اے حافظ اگر جوڑ چاہتے ہو ہر خاص و عام سے صلح کرو' مسلمان کے ساتھ اللہ اللہ اور برہمن کے ساتھ رام رام کرو)

یہ حافظ کا شعر کہا جاتا ہے مگر یہ حافظ شیرازی کا نہیں ہے کوئی آنکھوں کا حافظ ہوگا وہ تو ہندوستان آئے بھی نہ تھے' رام رام کیا جانیں' ہمارے ان علماء سے جب کوئی ملتا ہے تو پھر کبھی نہیں کہتا کہ متشدد ہیں ہاں مخالفین کے علماء متشدد بھی ہیں اور ان کا عالم بھی بہت ہی ناتمام ہے' ایک غیر مقلد مجھ سے کہنے لگے کہ ہمارے علماء سوائے آمین اور رفع یدین کے کچھ نہیں جانتے' اسی واسطے ہم معاملات کے مسائل آپ سے پوچھا کرتے ہیں حالانکہ یہ شخص بہت ہی سخت ہیں ان کے دوسرے بھائی بھی غیر مقلد ہیں مگر وہ نرم ہیں وہ کہنے لگے ہمارا یہی دعویٰ غلط ہے کہ ہم غیر مقلد ہیں ہم تو نہ عالم ہیں نہ محدث' جب تک حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ زندہ تھے ان سے پوچھتے تھے اب آپ سے پوچھتے ہیں۔

آمین بالجہر سے متعلق حضرت حکیم الامت کا مسلک

اور فرمایا ہم ایک دفعہ گڑھی گئے (یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں) وہاں کے رئیس نے کسی تقریب میں مجمع کیا تھا اور یہ دونوں بھائی بھی آئے ہوئے تھے وہاں انہوں نے آمین پکار کر نہیں کہی مجھے اس کی قدر ہوئی۔ مولانا شیخ محمد کے زمانہ میں ایک دفعہ کیڑی کے ایک آدمی جمعہ میں آئے ہوئے تھے انہوں نے مولانا کے پیچھے آمین کہی تمام جماعت بھر میں کھلبلی مچ گئی' کسی نے کہا نکال دو' کسی نے کہا مارو۔ مولانا نے سب لوگوں کو ساکت کیا اور کہا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو اس قدر غل مچاتے ہو پھر ان صاحب کو بلا کر پوچھا جنہوں نے آمین بالجہر کہی تھی کہ جن لوگوں نے آمین زور سے نہیں کہی ان کی نماز تمہارے نزدیک ہوئی یا نہیں۔ جواب دیا نماز تو ہوگئی فرمایا پھر کیوں اتنے مجمع کو پریشان کرنا کیا ضرورت تھی۔

فرمایا حضرت والا نے ہم لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے ہم آمین بالجہر کے ایسے خلاف نہیں کہ اس کے واسطے فوجداریاں کی جائیں' قنوج کی جامع مسجد میں ایک دفعہ میرے وعظ کی خبر سن کر غیر مقلدین جمعہ میں شریک ہوئے اور آمین بھی زور سے کہی جب کسی نے کچھ نہ کہا تو دوسری رکعت میں تھوڑوں نے کہی۔

نرمی کا اثر

دیکھئے نرمی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بعد نماز میں نے وعظ کہا اور بدعات رسوم کا بیان کیا' غیر مقلدین نے کہا آج معلوم ہوا کہ ہم بھی بدعات میں مبتلا ہیں۔ آیت یہ تھی:

قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلاً

(اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیبیوں ؓ سے فرمادیجئے کہ تم اگر دنیوی زندگی کا عیش اور بہار چاہتی ہو تو آؤ تم کو کچھ دنیوی مال ومتاع دے دیں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کردوں) جس میں میں نے بیان کیا کہ قرآن شریف کے الفاظ تو بتلائے ہیں کہ بیبیوں سے کہہ دینا چاہیے کہ اگر تم دین کی پابندی نہ کروگی تو تم کو طلاق دیدیں گے۔ یہ ان کی محبت تھی دیکھئے ہم لوگوں نے آمین کے باب میں سختی نہیں کی ہمارے علماء میں تشدد ہی نہیں' قنوج ہی میں مجھ سے ایک شخص نے مولود شریف پڑھنے کی درخواست کی' میں نے کہا مجھے پڑھنے سے تو انکار نہیں ہے مگر میرا پڑھنا آپ کو پسند نہ آئے گا' وہ بولے جس طرح پڑھو گے ہم کو پسند ہے' میں نے وعدہ کرلیا' وہاں ایک غیر مقلد بیٹھے تھے صاحب فرمائش نے ان سے کہا تم بھی آنا جن کے مکانوں پر میں ٹھہرا ہوا تھا انہوں نے کہا کہ "لَاحَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہ" میں نے کہا کہ لاحول کا ہے پر پڑھی' آپ کو کیا معلوم ہے کہ میں کیسے پڑھوں گا آپ آویں اور مجلس کے کنارہ پر بیٹھیں اور کوئی بدعت ہو فوراً اٹھ جاویں۔

غیر مقلدین میں متقی بہت کم ہیں

چنانچہ بعد عصر بیان ہوا اور میں نے بطور وعظ بیان کیا وہ صاحب علیحدہ بیٹھے رہے' میں نے اس آیت کا بیان کیا:

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ. الآیۃ

(الر یہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے تا کہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں) مغرب تک بیان ہوا اور وہ برابر بیٹھے رہے اور بعد میں کہا ایسے مولود شریف سے کیا انکار ہے وہی غیر مقلد کہنے لگے کہ ہم اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں مگر ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین تک محدود ہے اور دیگر امور میں یہ حالت ہے کہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں۔ کبھی وسوسہ بھی نہیں گزرا کہ یہ حدیث کے خلاف ہے۔ فرمایا حضرت والا نے یہ حالت ہے ان لوگوں کی جو حدیث حدیث کہتے پھرتے ہیں خود ایک غیر مقلد کہتے تھے کہ ہم میں متقی کم ہیں اور حنفیہ میں خشیت اتقاء زہد وغیرہ والے کثرت سے ہیں۔ محمد آباد کے اسٹیشن پر چار پانچ آدمی ملنے کو آئے اور بہت خلوص سے ملے فرمایا اس نواح میں دو چار دن رہنا ہوتا ہے تو سرور ہوتا ہے یہاں کے لوگ بڑے مخلص جانبین سے محبت ہو تو عجیب نعمت ہے یہ حب فی اللہ ہے۔ یہی کچھ چیز ہے اور جو محبت کسی غرض سے ہوتی ہے وہ لاشے اور محض دھوکہ ہے۔ امام شافعی صاحب کا قول ہے کہ جنت کی تمنا یہ خبر سن کر ہوگئی ہے کہ وہاں احباب سے ملاقات ہوگی یہ تھے صوفی اور فقیہ۔

تصوف اور فقہ کے معنی

اب لوگوں نے تصوف اور فقہ دونوں کے معنے بدل دیئے ہیں اور دونوں کو متنافیین قرار دیا ہے حالانکہ ان میں تنافی نہیں کیونکہ تصوف کے معنے ہیں **تعمیر الظاہر و الباطن** ظاہر کی تعمیر اعمال سے اور باطن کے اخلاق سے اور فقہ کی امام صاحب نے تعریف کی ہے **معرفت النفس مالھا و ما علیھا** یہ عام ہے۔ اعمال ظاہر و باطنی سب کو تو تصوف اور فقہ میں منافات کہاں ہے پہلے لوگ فقہ اور تصوف کے جامع ہوتے تھے یہ بلا آج کل ہی پھیلی ہے کہ دونوں علیحدہ سمجھ کر دونوں کو خراب کیا حالانکہ ان دونوں کا ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحبت کے لیے اس شخص کو اختیار کرو جو محدث بھی ہو اور فقیہ بھی صوفی بھی اعتدال اسی سے ہوتا ہے یہ قول ان کا قول جمیل میں ہے۔

حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید حنفی تھے

شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان ماشاء اللہ ان اوصاف کا جامع ہے جن میں مولانا اسماعیل صاحب بھی ہیں، بعض لوگ مولانا کو غیر مقلد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ وہ سید صاحب کے قافلے کے ایک شخص سے ملے ہیں ان سے پوچھا تھا کہ مولانا غیر مقلد تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم کو معلوم نہیں لیکن سید صاحب کے تمام قافلہ میں یہ مشہور تھا کہ غیر مقلد چھوٹے رافضی ہوتے ہیں اس سے سمجھ لو کہ اس قافلہ میں کوئی غیر مقلد ہو سکتا ہے۔ ایک حکایت اور فرمائی سند یاد نہیں کسی نے مولانا سے مسئلہ پوچھا، فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک یوں ہے اس نے کہا آپ اپنی تحقیق فرمائیے فرمایا میں کیا کہتا ہوں امام صاحب کے سامنے، مولانا کے غیر مقلد مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا نے بعض جاہل غسالی مقلدین کے مقابلہ میں بعض مسائل خاص عنوان سے تعبیر کرائے اور ایک بار ان کے مقابلہ میں آمین زور سے کہہ دی کیونکہ غلو اس وقت ایسا تھا کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے زور سے آمین کہہ دی تھی تو اس کو مسجد کے اونچے فرش پر سے گرا دیا تھا، مولانا کو اس پر بہت جوش ہوا اس کتاب میں ہے کہ آپ نے بیس مرتبہ آمین کہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا ان کو سمجھائیے، فرمایا وہ خود عالم ہیں اور تیز ہیں کہنے سے ضد بڑھ جاوے گی، خاموش رہو۔ مولانا نے ایک رسالہ بھی رفع یدین کے اثبات میں لکھا ہے لیکن غیر مقلد ہرگز نہ تھے۔ ایک حکایت مولوی فخر الحسن صاحب بیان کرتے تھے اس سے بھی مولانا کے حنفی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا کے ایک بیٹے محمد عمر نام مجذوب تھے اور بہت بھولے لیکن بہت ذہین چنانچہ ایک شخص ان کے سامنے کنز لے گیا کہ اس کا سبق پڑھا دیجئے، کہا میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں مگر جب وہ طالب علم پڑھنے بیٹھا تو بہت اچھی طرح سے پڑھا دی، حتیٰ کہ تھوڑا تھوڑا پڑھ کر اس نے کتاب بند کی تو کہا بھائی دس ورق تو پڑھو اور بھولے ایسے تھے کہ ایک بار مولوی محبوب علی صاحب کے وعظ میں پہنچے، مجمع بہت تھا مگر واعظ صاحب کی

آواز پست تھی ان کو آواز نہ آئی تو گھر لوٹ کر گئے اور کہا کہ دعا کریں گے کہ اس واعظ کی آواز بڑھ جاوے اور دعا مانگی پھر فوراً آدمی بھیجا' دیکھنے کے لیے بتلاؤ آواز کچھ بڑھی یا نہیں۔ سو یہ صاحبزادے ایک دفعہ جامع مسجد کے حوض کے پاس کو گزرے وہاں غیر مقلدین میں مذاکرہ حدیث ہو رہا تھا' یہ بھی بیٹھ گئے' ہمراہیوں نے عرض کیا حضرت کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں' فرمایا بلا سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بیان ہو رہا ہے۔ بیان کرنے والے نے ایک مقام میں امام صاحب پر کچھ طعن کیا' انہوں نے ایک دھول رسید کی اور کہا چلو یہاں بے ایمان ہیں' ان کی وجاہت بہت تھی کوئی بول نہ سکا' سو اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غیر مقلد نہ تھے۔ اگر غیر مقلد ہوتے تو ان کا بیٹا ایسا کیوں ہوتا' واللہ اعلم جیسے ہمارے مجمع کو بھی تو بعض لوگ غیر مقلد کہتے ہیں اور غیر مقلد ہم کو مشرک کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مجمع میں بعض مقلدین کی طرح تقلید جائز نہیں حتیٰ کہ اگر امام صاحب کی دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہ ہو اور حدیث معارض موجود ہو تو قول امام کو چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے "مااسکر کثیر فقلیله"[1] حرام میں ہوا ہے کہ امام صاحب نے قدر غیر مسکر کو جائز کہا ہے کہ اور حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے یہاں امام صاحب کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں مگر اس کے لیے بڑے متبحر کی ضرورت ہے' کسی مسئلہ کی نسبت یہ کہنا بڑی مشکل ہے کہ اس میں دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہیں ہے اس واسطے کہ کہیں احتجاج بعبارت النص ہوتا ہے اور کہیں باشارۃ النص ہوتا ہے اور یہ سب احتجاج بالحدیث ہے۔

عمل بالحدیث کا مفہوم

البتہ "مااسکر کثیرہ فقلیله حرام" کے خلاف واقعی کوئی دلیل سوائے قیاس کے نہیں ہے۔ آثار صحابہ سو وہ حدیث کے مقابل نہیں ہو سکتے' فرمایا ایک صاحب کہتے تھے کہ غیر مقلدین جو عمل بالحدیث کا دعویٰ کرتے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ بعض احادیث مراد ہیں یا کل اگر بعض مراد ہیں تو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں اور اگر کل مراد ہیں تو وہ بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ تعارض کے وقت دو حدیثوں میں سے ایک کو ضروری چھوڑنا پڑتا ہے۔

---

[1] (سنن ابی داؤد:۳۶۸۱' سنن الترمذی :۱۸۶۵)

اہل حق کو سب وشتم کرنے کا انجام

فرمایا جو لوگ اہل حق کو سب وشتم کرتے ہیں ان کے چہروں پر نور علم نہیں پایا جاتا بلکہ خالص کفار اتنے مسوخ پائے جاتے جتنے یہ لوگ ہیں۔ اس کی وجہ میں نے بطور لطیفہ کے کہا تھا کہ کفر فعل باطن ہے اس کا اثر چھپا ہوا رہتا ہے اور سب وشتم فعل ظاہر ہے اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ انگریزی خوانوں پر نور ایمان نہ سہی مگر شان تو ہوتی ہے ان میں وہ بھی نہیں خدا بچاوے۔ شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد

(جب اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ داری اور رسوائی چاہتے ہیں تو اس کا میلان نیک لوگوں کے طعن میں پیدا کر دیتے ہیں)

دیگر

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس　　　کم زند درعیب معیوبان نفس

(اللہ تعالیٰ کو جب کسی کی عیب پوشی منظور ہوتی ہے تو وہ شخص عیب دار لوگوں کے عیب میں بھی کلام نہیں کرتے)

ادب الترک

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

حامداومصلیا

ترک اسباب میں تعجیل مناسب نہیں

خواجہ صاحب نے پوچھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ توکل کروں اور سب تعلقات چھوڑ کر اللہ اللہ کروں، ہنس کر فرمایا جلدی نہ کیجئے جب سب اولاد کی شادی بیاہ ہو چکیں اور آمد بھی بند ہو جاوے اس وقت مناسب ہے اور تعلقات والے کو ترک اسباب کرنا مشکل ہے۔ ہفتے میں دو ہفتہ میں اللہ اللہ کرنے سے جی اکتا جاتا ہے یہ مباحات ہی کی برکت ہے کہ اشغال مختلف ہونے سے نشاط بحال ہو جاتا ہے۔ میں اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ (کہنے کی بات تو ہے نہیں مگر اس وقت سب اپنے ہی ہیں) میں نے بھی ایک دفعہ ترک تعلقات کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وساوس میں مبتلا ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ مرئی تو ہے نہیں محض خیال سے دفعتاً پر ہونا قلب کا مشکل ہے اور تعلقات سے قلب خالی کیا گیا اور پر ہوا نہیں، خالی قلب میں شیطان کو دخل کا موقع مل گیا اور وساوس پیدا ہوئے، سمجھ میں آیا کہ یہ ٹھیک نہیں، ذکر شغل اطاعت میں مشغول رہے اور مباحات بالکلیہ نہ چھوڑے، سفر کرنا، چلنا پھرنا احباب سے ملنا خط و کتابت یہ سب اشغال تھوڑے رکھے یہی حکمت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادعیہ مختلفہ کی تعلیم فرماتے ہیں چلنے کی اور اٹھنے کی اور سوار ہونے کی اور جاگنے کی اور کھانے کی اور پینے کی کہ ایک شغل سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ البتہ اگر مغلوب العشق ترک کرے تو مضائقہ نہیں مگر

غلبہ عشق غیر اختیاری چیز ہے اپنے ارادہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا' ارادہ والے کے لیے یہی ترک ہے کہ انضباط اوقات کرے ایک وقت طاعت کے لیے ہو تو ایک وقت مباحات کے لیے بھی ہو' وقت کو ضائع نہ کرے' غیر مفید یا مضر کام میں صرف نہ کرے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر منشی صاحب ایک بزرگ سے بیعت ہوئے اور ترک تعلقات کر دیا' ملنا' سفر کرنا' خط و کتابت سب چھوڑ دیا' ضربیں ایسی لگاتے کہ محلّہ بھر تنگ آ گیا سب کوستے تھے کہ یہ مر جاوے تو اچھا ہو ان کے دماغ میں یبوست مفرط ہو گئی اور کوئی کیفیت اور مزہ بھی ذکر کا حاصل نہ ہوا' پیر صاحب کو لکھا جواب ندارد' مجھے لکھا میں نے جواب دیا کہ تفصیلی مشورہ تو بعد میں دوں گا۔ فوری علاج یہ ہے کہ جن اشغال میں آپ رہتے ہیں سب ایک دم چھوڑ دیجئے' لوگوں سے ملئے' ہدایا لیجئے' دیجئے' تفریح ہوا خوری کے لیے اول ہی دن میں سب پریشانی جاتی رہی۔ پھر مفصل مشورہ دیا گیا کہ بالکلیہ ترک مباحات کیجئے' تقلیل کر دیجئے اور بہتر یہ ہے کہ یہاں چند روز کے لیے چلے آیئے میں آپ کو حالات دیکھ کر انضباط اوقات کی صورتیں بتا دوں گا چنانچہ وہ آئے میں نے بہت تھوڑا سا ذکر بتا دیا اور مختلف کاموں کے لیے اوقات مقرر کر دیئے بس شگفتہ ہو گئے' پھر اہل محلّہ دعا دیتے تھے کہ جس نے ان کو ضربیں چھوڑائی ہیں اس کا خدا بھلا کرے' اب ان کو اپنا حال لکھنے کے لیے یہ الفاظ کافی ہوتے ہیں کہ الحمدللہ میری حالت اچھی ہے لوگوں کو مقصود کا ہی پتہ نہیں' غیر مقصود سمجھ کر عمر بھر خبط میں مبتلا رہتے' مقصود کام کرنا ہے نہ ثمرات نہ حالات عرض کیا گیا سخت سخت مجاہدہ سے فائدہ تو بہت جلدی ہوتا ہوگا' فرمایا اگر ایسا ہوتا تو اکھاڑہ کے پہلوان اور چکی پینے والے بڑے ولی ہوتے کیونکہ محنت سخت کرتے ہیں محنت باقاعدہ کی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک تالا بند ہو گیا تھا اس پر لوگوں نے بہت زور لگائے مگر نہ کھلا' میں نے کنجی سے آہستہ سے کھولا فوراً کھل گیا' تالے کے ساتھ کشتی لڑنے سے کیا فائدہ' تالا طریقہ سے کھلتا ہے ایسے ہی اصلاح کے لیے اور وصول الی اللہ کے لیے یہی طریقہ ہے اور وہ اتباع سنت ہے یہ ہمارے واسطے اس لیے مقرر ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طریقہ جانتے تھے ہمیں کوئی ضرورت غور و فکر اختراع و ایجاد کی نہیں' آنکھ میچ کر پیچھے چلے جاویں' اب سنت کو دیکھئے حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آدمیوں کو خواب میں دیکھا کہ دریا کا سفر کر رہے ہیں' حدیث کا لفظ یہ ہے "ملوک علی الاسرۃ" بادشاہوں کی وضع سے تخت پر بیٹھے جا رہے ہیں یہ بادشاہ ہی تھے

جنہوں نے جہاد کیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ مال دین کے لیے مضر نہیں جبکہ اس کے ساتھ اتباع ہو۔ حاصل یہ کہ مال قبیح لعینہ نہیں بلکہ مفاسد کی وجہ سے قبیح ہو جاتا ہے ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی طبیعت ہی ایسی ہو کہ اتباع اور مال دونوں جمع نہ ہو سکیں تو اس کو ترک مال ہی کا مشورہ دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ بہت غلو ترک میں مناسب نہیں' توسط اور اعتدال چاہیے سب کو ترک اسباب کی تعلیم بھی نہ دینی چاہیے ہر شخص کی طبیعت اور حالت مختلف ہوتی ہے اس واسطے ترک کے درجات بھی مختلف بنانے چاہئیں۔ ساری دنیا اگر ایک سی ہو جاوے تو تارکین تو تارکین اسباب بھی پھر تارک نہ رہیں کیونکہ ضرورتیں ان کی پوری نہ ہوں اور مشغولی اختیار کرنی پڑے' ان کا اطمینان بھی ان بے اطمینانیوں کی وجہ سے ہے ایک بزرگ کا قول ہے کہ شیطان ہر شخص کی موجودہ حالت کو بے وقعت بتاتا ہے اور اس سے اپنا کام خوب بناتا ہے اہل توکل سے تو کہتا ہے کہ اس حالت میں یہ خرابی ہے کہ اپنا بوجھ دوسروں پر ہے یہ نامردی ہے۔

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی　　　طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پروبال

(باز کی طرح ہو کہ شکار کرو اور لقمہ دو' بے پروبال کی طرح طفیل خوار مت ہو)

ان سے توکل چھوڑا کر اسباب میں گھسا دیتا ہے اور اہل تعلقات سے کہتا ہے تمہاری بھی کیا حالت ہے' دن بھر تو تو میں میں رہتے ہو' کوئی وقت بھی یاد خدا کا نہیں' فلاں شخص کیسا تارک اسباب ہے تم کیا نہیں کر سکتے یہاں تک کہ ان سے تعلقات کو چھڑا کر ہی چھوڑتا ہے اور ان میں اتنی ہمت ہوتی نہیں کہ ترک اسباب کے بعد مطمئن رہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پریشان ہو جاتے ہیں اور بعد چندے اس سے پشیمانی ہوتی ہے اور یہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے' لطف یہ ہے کہ اگر کوئی ترک اسباب کی ہمت کرے بھی تو اس حالت پر بھی قیام نہیں رہنے دیتا' اس کو بھی پھر بے وقت ثابت کرتا ہے' یہ شیطان کا ایسا مکر ہے کہ ہر جگہ چل ہی جاتا ہے اور اس مکر کو پہچاننا آسان کام نہیں' بہت ہی باریک نظر کی ضرورت ہے' چاہیے کہ اپنی طرف سے حالت کے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اول کسی بڑے مبصر سے ضرور رائے لے لے اسی واسطے شیطان ایسے بزرگوں سے بہت گھبراتا ہے کیونکہ وہ اس کے مدت کے مکر ذرا میں توڑ دیتے ہیں۔

ترک تعلقات کی حقیقت

عرض کیا گیا کہ بلا ترک تعلقات اصلاح کیسے ہو۔ فرمایا ترک ضروری بے شک ہے مگر ترک کی حقیقت تقلیل تعلقات ہے یعنی فضول تعلقات کو اور مضر تعلقات کو چھوڑ دینا نہ مطلقاً تارک بن جانا اس کے مبصر تو حضرت حاجی صاحب تھے۔ تصوف بالکل مردہ ہو گیا تھا' حضرت حاجی صاحب نے اس کو زندہ کیا اور حقائق بالکل محو ہو چکی تھیں ان کو تازہ کر دیا' تصوف رسم کا نام رہ گیا تھا اول تو جعلسازیاں بہت اور سچے لوگوں میں بھی صرف ڈھچر رہ گیا تھا۔ حضرت نے اس کو بالکل زندہ کر دیا۔ حضرت کا الہامی طریقہ سب کے کام کا ہے۔ حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر ہر شخص کو حظ آتا اور امیدیں بڑھتی تھیں اور امنگیں پیدا ہوتی تھیں کہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ عمدہ ترکیب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تھوڑی جائیداد خرید لے جو خرچ کے لیے کافی ہو بس پھر اللہ اللہ کیا کرے' اس طرح ذکر بڑے اطمینان سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا جائیداد سے بھی اطمینان نہیں ہو سکتا اس میں بھی بکھیڑے ہیں۔

العفۃ

حب غیر اللہ سے بچنے کے بارے میں تھانہ بھون بر مکان حضرت مولانا صاحب ۸ رجب ۱۳۳۱ ہجری بعد عصر ایک گھنٹہ دس منٹ بیٹھ کر ارشاد فرمایا جسے مولانا عبداللہ صاحب نے قلمبند کیا۔ سامعین کی تعداد ۶۰ تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلاً لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا.

(الفجر آیت نمبر ۱۹)

ترجمہ: (اورتم میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے تم لوگ بہت ہی محبت رکھتے ہو)

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے بعض نافرمان بندوں کی ایک شکایت فرمائی ہے اس کی تعیین تو ترجمہ سے ہوگی لیکن اول یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مجھ کو اس وقت کوئی وسیع مضمون بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس لیے کہ وقت کم ہے اس لیے ایک ایسا ضروری مضمون مختصر اختیار کیا ہے کہ جس میں اصل ہے اکثر خرابیوں کی۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم لوگ میراث کھا جاتے ہو اور اس کی وجہ ارشاد فرمائی کہ تم مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو، مال دیکھ کر رال ٹپک جاتی ہے، پھر اپنے پرائے میں تمیز نہیں رہتی، یہ حاصل ہے آیت کا۔ اس آیت کو سن کر سامعین کو خیال ہوا ہوگا کہ میراث کا شاید بیان ہو اس لیے عرض کیا جاتا ہے کہ میراث کا بیان نہیں، اگرچہ ہے وہ بھی ایک ضروری مضمون لیکن مجھے اس وقت اس آیت سے اس سے بھی زیادہ ضروری ایک مضمون مستنبط کرنا ہے۔

دوشکایات

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو شکایتیں فرمائی ہیں ایک یہ کہ پرایا حق کھا جاتے ہو، دوسرے مال سے محبت رکھتے ہو، یہ دونوں جدا جدا مضمون نہیں بلکہ ثانی اول کے لیے علت

ہے یعنی حق تعالیٰ کو میراث کھا جانے کی وجہ بیان فرمانا بھی مقصود ہے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ تم کو مال سے بہت محبت ہے اکل میراث کا مذموم ہونا گویا دو حیثیتوں سے بیان فرمایا کہ یہ فعل خود بھی برا ہے اور اس کا منشاء جس سے یہ پیدا ہوا ہے وہ بھی برا ہے جیسے کسی کی مذمت کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ تم بھی نالائق ہو اور تمہارا باپ بھی نالائق تھا اس میں بلاغت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس جب موقع شکایت میں وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ فرمایا تو جس کی طبیعت میں ذرا بھی سلامتی ہو وہ خود سمجھ لے گا کہ یہ فعل برا ہے۔ نفس مذمومیت تو اسی سے سمجھ میں آ گئی لیکن حق تعالیٰ نے اس پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اس کا سبب بھی بتایا کہ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا اور وہ سبب ایسا ہے کہ وہ خود بھی گناہ ہے تو اس سے اس کا مذموم ہونا اور زیادہ بوجہ ابلغ واضح ہو گیا' پس ایک حکمت تو علت بیان کرنے سے یہ تھی' دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مقام میں نظر صرف پرایا مال کھا جانے ہی پر متصور نہ رہے بلکہ اصل علت پر بھی نظر ہو جاوے تا کہ اس سے اس کے علاوہ جتنی شاخیں متفرع ہوتی ہیں سب پیش نظر ہو جاویں اور حق تعالیٰ کے نزدیک سب کا مذموم ہونا واضح ہو جاوے۔

گناہوں کی دو قسمیں

تیسری ایک اور حکمت اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ظاہر نظر میں بھی گناہ ہیں اور اکثر لوگ ان کو ہی گناہ سمجھتے ہیں۔ جیسے چوری' زنا' قتل' ناحق ظلم' پرایا مال کھا جانا' شراب پینا وغیرہ۔ دوسرے وہ گناہ کہ لوگ ان کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ اس طرف کبھی ان کا ذہن جاتا ہے کہ یہ گناہ ہیں مثلاً مال کا لالچ ہونا خدا کے سوا کسی سے محبت ہونا' اللہ کی یاد سے غافل ہونا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب کبھی اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں تو ظلم' چوری' چغلی' غیبت وغیرہ تو یاد آتے ہیں مگر یہ ہرگز یاد نہیں آتا کہ ہمارے دل میں لالچ ہے' ہماری تمام عمر غفلت میں گزر گئی اور تمام عمر اس کوشش میں گزر گئی کہ ہم بڑے بن کر رہیں' ناک اونچی ہو ان کو وہی لوگ گناہ سمجھتے ہیں جو جاننے والے ہیں اور جاننے والوں سے میری مراد وہ ہیں جو علم دین کامل رکھتے ہیں نہ صرف حرف شناس یا مدعی جیسے بعضے جاہل یا اکثر عورتیں جو کچھ حرف شناس ہو جاتی ہیں وہ

اپنے کو عالم اور محقق سمجھنے لگتی ہیں حالانکہ ان کا مبلغ علم صرف یہ ہے کہ نور نامہ پڑھ لیا' وفات نامہ' معجزہ آل نبیؐ قصہ ماہ رمضان پڑھ لیا بس اپنے کو عالم سمجھ لیا۔

درحقیقت عالم کون ہے

یادرکھو علم اور شے ہے علم وہ ہے جس کا دل پر اثر ہو جاوے۔ چند مسائل اگر یاد کر لیے کہ نماز فرض ہے' روزہ فرض ہے اس سے عالم نہیں ہوتا۔ اگر چہ اصطلاحاً بھی عالم کہلاوے' مگر وہی ہے جو علم کے ساتھ بصیرت فکر' آخرت خشیت بھی رکھتا ہو پس ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ جس طرح سرقہ غصب زنا سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ایسے ہی غفلت سے اور اسی طرح یہ اس دھن میں رہنے سے بھی کہ میری عزت میں بٹہ نہ لگے' چار آدمیوں میں میرا نام ہلکا نہ ہو' مخلوق میں میری شہرت ہو' یہ امور بھی اللہ کے نزدیک ناپسند ہیں اور یہ دل کے گناہ ہیں۔ پس تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ (میراث کا مال کھاتے ہو) تو ہاتھ منہ کا گناہ ہے جس کے گناہ ہونے کو سب جانتے ہیں اور وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ (تم مال سے محبت رکھتے ہو) دل کا گناہ ہے جس سے یہ ظاہری گناہ متفرع ہوا۔

غیر اللہ سے انتہائی محبت کی شکایت

اور دیکھئے رحمت حق تعالیٰ کی کہ شکایت صرف حب مال کی نہیں فرمائی بلکہ اس کو مقید فرمایا ہے۔ حُبًّا جَمًّا (اشد محبت) سے مطلب یہ ہے کہ نفس حب مال کی ہم شکایت نہیں کرتے بلکہ شکایت اس بات کی ہے کہ مال کی بہت زیادہ محبت رکھتے ہو' ان ہی رعایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام تو آدمی کا نہیں ہے' آدمی اپنے کلام میں خواہ کتنی ہی رعایت کرے مگر ہر پہلو پر اس کی نظر نہیں رہتی جس ایک پہلو کو لیتا ہے اس میں حد سے بڑھ جاتا ہے' مثلاً ہم لوگ غصہ میں کسی کی توہین یا کسی کا نقص یا ملامت کریں گے تو حد اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اگر اس وقت حد پر رہنے کی کوئی تدبیر بھی کرنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا یا ہمت نہیں ہوتی بخلاف کلام باری تعالیٰ کے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم لوگ تو مغلوب ہیں طبیعت کے اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہیں' دیکھئے ملامت فرما رہے ہیں لیکن

اس میں بھی کیا رحمت ہے کہ نفس حب پر ملامت نہیں' اگر نفس حب مال پر شکایت ہوتی تو مخاطبین سخت سوچ اور فکر میں پڑ جاتے اس لیے کہ ایسا کون ہے جس کو مال سے تعلق نہیں اس لیے یہ فکر ہو جاتی کہ بس جی ہم تو بالکل ہی مردود ہیں چنانچہ بعضے سالک جہل یا غلبہ حال سے یا ناواقف مشائخ کے ہاتھ میں پھنس جانے سے بھی سمجھ بیٹھے کہ غیر اللہ سے کسی درجہ کا بھی تعلق رکھنا مذموم ہے۔ بس ان کی یہ حالت ہوئی کہ بیوی کو چھوڑ دیا' مال کو لٹا دیا اور تماشا ہے کہ ان کے ناواقف مشائخ اپنے مریدوں کی اس حالت پر ناز کرتے ہیں' سو یہ لوگ خود ہی اس قابل ہیں کہ ان کی اصلاح کی جاوے' خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اچھی کس کی تربیت ہوگی تو سن لیجئے ایک صحابی دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے اور شب کو قیام بہت کرتے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نصیحت فرمائی کہ تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے' کمزور ہو جاؤ گے' آنکھ کا بھی حق ہے' مہمان کا بھی حق ہے' خدا تعالیٰ کا بھی حق ادا کرو اور دوسرے حقوق بھی ادا کرو' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تربیت دیکھئے کہ دشمنوں کو خطاب ہو رہا ہے اور خطاب میں اتنی رعایت کہ اگر حب مال کی شکایت ہوگی تو اس سے تنگی ہوگی کہ اس کو ہم کیسے دل سے نکال سکتے ہیں اس لیے قید جسم سے اس کو مقید فرما رہے کہ شکایت صرف اس بات کی ہے کہ مال کی محبت تم کو زیادہ کیوں ہے اور یہی مذموم ہے' باقی حب مال مطلقاً مذموم نہیں اور اگر مال سے مطلقاً محبت رکھنا مذموم ہوتا تو "نعم المال الصالح للرجل الصالح"[1] (نیک آدمی کی کمائی اچھا مال ہے) اور یوں نہ فرماتے: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے) جس میں من تبعیضیہ بھی ہے اور جس میں تحبون بھی ہے اگر سارے مال کا خرچ کر دینا ضروری ہوتا تو یوں نہ ارشاد ہوتا "افضل الصدقة عن ظهر غنى"[2] (بہترین صدقہ چھپا کر دینا ہے) پس معلوم ہوا کہ ملک مال یا حب مال کی شکایت نہیں ہے بلکہ کوئی اور شے ہے جو مبنی شکایت کا ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے مقابلے

---

[1] (مسند احمد ۴: ۱۹۷' اتحاف السادة المتقين ۸: ۱۴۹)

[2] (الصحيح للبخارى ۷: ۸۱' الصحيح لمسلم' الزكوة: ۹۵)

میں کسی شے کی زیادہ محبت ہو۔ پس غیر اللہ سے اتنی محبت کرنے کی شکایت ہے دوسرے مقام پر بھی اس کی حد بیان فرمائی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

(اور بعض لوگ وہ بھی ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے (رکھنا) ضروری ہے کہ جیسی محبت خدا سے ہونا چاہیے ایسی محبت دوسروں سے کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مطلقاً محبت محل شکایت نہیں ہے بلکہ ایسی محبت جو خدا کی سی ہو جس کے آثار یہ ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے غافل کردے' معصیت پر جری کردے' یادرکھو غیر اللہ سے ایسا تعلق محبت کا رکھنا سخت مرض اور سم قاتل اور معالجہ کے قابل ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس پر حق تعالیٰ کے یہاں کچھ بھی سزا نہ ہو صرف سامنے کھڑا کر کے اتنا ہی پوچھ لیں کہ ظالم میری محبت کا تو دعویٰ اور پھر میرے غیر سے ایسا تعلق تو اس وقت کی شرمندگی اور ندامت غالب ہو کہ وہ دوزخ کے عذاب سے بھی بڑھ کر ہو۔

حق تعالیٰ ہی کے واسطے کی محبت

ہاں جو محبت خود حق تعالیٰ ہی کے واسطے بایں معنی کہ اس کی محبت کی طرف موصل ہو جائے جیسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت یا شیخ کی محبت یا جس محبت کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے جسے اپنے اہل اور اولاد کی محبت یہ مستثنیٰ ہے اس لیے کہ یہ محبتیں عین خدا تعالیٰ کی محبت ہے اور پرائی عورت یا پرائے مرد یا پرائے لڑکے کی محبت یہ منہی عنہ ہیں۔ اسی طرح جو شے دنیا کی اپنے پاس نہیں ہے اس پر نظر ڈالنا اور اس کے نہ ہونے سے افسوس کرنا اور اس کی دھن لگالینا یہ سب ممنوع ہے۔ حق تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں: "لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَابِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ" (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان چیزوں کی طرف جن کے ساتھ ہم نے ان کفار کی جماعتوں کو متمتع کیا ہے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے۔)

برادری کی رسومات

پس اے بیبیو تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ کس کے جھومر کو دیکھو یا کسی کے کڑوں چھڑوں پر نظر ڈالو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان قرب ایسی تھی کہ اگر تمام دنیا کے خزائن بھی آپ

کے سامنے موجود ہوتے تب بھی ذرہ برابر آپ کے مراتب قرب میں فرق نہ آتا اس لیے اگر آپ دنیا قبول بھی فرماتے تب بھی آپ کو مضر نہ ہوتی مگر آپ نے قبول نہ فرمائی تو ہم تو جو کہ دن رات معاصی میں غرق ہیں ہم کو کیسے اجازت ہوگی کہ دنیا کی حرص کریں اور جب کہ دیکھنا جائز نہیں تو دکھانا بھی کہاں جائز ہوگا۔ اس لیے کہ دکھلانے سے بھی حرص پیدا ہوتی ہے اب تم اپنی برادری کی رسوم کو دیکھو کہ تمام رسوم کا مغز یہی دیکھنا دکھانا ہے۔ بتلاؤ کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ منع کریں اور تم اس کو تفاخراً کرو یہ شریعت کا مقابلہ ہے یا نہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کو تم گناہ ہی نہیں سمجھتیں اور حب مال ومتاع کو دیکھنے کی ممانعت ہے تو اجنبی مرد یا اجنبی عورت کو دیکھنا تو اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ مال کے دیکھنے سے تو کبھی حرص پیدا ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور پرائے مرد یا عورت کو دیکھنے سے تو حرص کا پیدا ہونا لازم ہے اور یہ تو ضروری ہے کہ جب غیر کی طرف کوئی دیکھتا ہے تو اس وقت اپنے دل کو ٹٹول لے کہ حق تعالیٰ کی محبت تو دل میں اتنی نہیں ہوتی۔

غیر اللہ کی محبت انتہائی مذموم ہے

سو افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ اور اس کے سامنے ہر وقت موجود اور پھر غیر پر نظریں تو ہر نافرمانی بری ہے ہی لیکن غیر اللہ سے محبت کرنا تو سب سے بڑھ کر ناپسند ہے اور حق تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے کہ میرے چاہنے والے اور میرے محبّ غیر پر نظر رکھیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

"ان سعدا لغیور و انا اغیر منه واللّٰه اغیر منی ومن غیرته حرم الفواحش ماظهر منها وما بطن"[1]

شریعت کے خلاف جو امر ہے اس پر عموماً اور غیر اللہ سے تعلق ناجائز رکھنے پر خصوصاً حق تعالیٰ کی غیرت کو جوش آتا ہے جیسے کسی مرد کو اپنی بی بی کے پاس اجنبی مرد کو دیکھ کر جوش آتا ہے وہ کیا مسلمان ہے جو خدا کی محبت کا دعویٰ کرے اور دوسری طرف نگاہ ڈالے مگر الحمدللہ اس بدنگاہی اور تعلقات کے امراض سے عورتیں بیشتر پاک ہیں اور یہ سب، پردہ کی

---

[1] (الدر المنثور ۵: ۲۴، المغنی عن حمل الاسفار ۳: ۱۶۴)

بدولت ہے جس کی آج کل بیخ کنی کی جارہی ہے اور جب باوجود ایسے پردہ کے بھی بعض عورتیں نہیں چوکتیں گو اس قدر فتنہ میں مبتلا نہیں ہیں جس قدر کہ مرد ہیں لیکن تاہم ان میں بھی کچھ کچھ خرابی ہے ہی چنانچہ مردوں کو یہ بھی ضرور جھانکتی تاکتی ہیں اور نیز مردوں کو ایسے موقع بھی دے دیتی ہیں کہ وہ ان کو دیکھ لیتے ہیں تو پردہ نہ رہنے میں تو کیا حشر ہوگا اور یاد رکھو حق تعالیٰ کو اس پر بھی غیرت آتی ہے کہ تم کو کوئی دیکھے جیسے سید کو اس سے غیرت آتی ہے کہ اس کی لونڈی کو کوئی دیکھے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کو تلوار ماروں' اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے کہ تم کو کوئی دیکھے اس لیے کہ تم سب اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہو اسی لیے حدیث میں آیا ہے: "لعن اللّٰه الناظر و المنظور الیه"[1] کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے دیکھنے والے پر اور جس کی طرف دیکھا ہے اس پر یعنی جبکہ منظور الیہ دیکھنے سے راضی ہو یا خود دکھاوے اور یہ وعید تو صرف دیکھنے دکھانے پر ہے اور اگر بولنا چالنا بھی ہو تو وہ بہت ہی غضب اور جوش کی بات ہے اور اگر اس سے آگے بھی نوبت پہنچ گئی ہو تو پھر اس کے لیے تو جہنم ہی تیار ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے دور سے اس کی روک تھام کی ہے۔ چنانچہ مردوں کو تو یہ حکم فرمایا: "قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں) اور عورتوں کے لیے بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا: "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ" یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہوگا اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍۭ بِزِيْنَةٍ.

(یعنی جو عورتیں بوڑھی ہیں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھ دیں جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دے بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں لیکن اس حالت میں بھی اپنے موقع زینت کو ظاہر نہ کریں مثلاً گردن' کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا

---

[1] (مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۲۵' کنز العمال: ۱۹۱۲۲)

ہے) اور آگے ارشاد ہے: "وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ" (یعنی وہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بھی بچیں تو ان کے لیے زیادہ بہتر ہے) پس جب بوڑھیوں تک کے لیے یہ حکم ہے۔

پردہ اہتمام کی ضرورت

تو اے لڑکیو اور اے جوان عورتو تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے محابا آ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہ ہوا نہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو بعضے تو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں، بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا، اگر کچھ عربی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا، کسی اپنے جیسے جاہل کے مضمون سے استدلال کر کے یہ بھی بول اٹھے کہ پردہ ضروری نہیں۔ سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے ایک خط دیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن او پر گزرا ہے پھر جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرا دیں تو کون سا پیر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی، خواہ کوئی خالو ہو یا پھوپھا، دادا لگتا ہو یا چچا اگر محرم نہ ہو وہ اجنبی ہے، بڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پروا نہیں، ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر، اگر کہو کہ دوسرا پاک ہے تو توبہ تو بہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجود یہ کہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا، اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک اور کون نہیں ہے۔

فریب نفس

انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں: "وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَارَحِمَ رَبِّیْ." (یعنی میں

اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہے ہی مگر جس پر میرا رب رحمت فرمادے کہ وہ مستثنیٰ ہے) اب بتائیے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے مجھ کو براوسوسہ نہیں آتا ہے اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکہ بھی ہوا ہے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کو وسوسہ نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکی ہوگیا ہے' اس لیے انہوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے خواہ وہ فتنہ قلب ہی کا ہو اور یہ کارگزاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ یہ شیطان پڑھا ہوا جن ہے ہر شخص کو اس کے طرز سے بہکاتا ہے جب اس نے دیکھا کہ اگر میں براوسوسہ اس کے قلب میں ڈالوں گا تو بے کار ہے اس لیے کہ یہ میرا کہنا کیوں مانے گا تو وسوسہ ڈالنا ہی چھوڑ دیا' یہ شخص اب بے فکر ہوگیا کہ میں تو پاک ہوگیا مجھ کو کسی کو دیکھنا پاس بیٹھنا مضر نہیں یہ سمجھ کر اختلاط میں تساہل کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ جان کو ایک روگ لگ جاتا ہے اور ساری عمر بھی اسی سے خلاصی نہیں ہوتی۔ پس اے بیبیو اور اے مردو تم اجنبی سے اختلاط کرنے میں بالفرض اگر کوئی ناپاکی بھی نہ دیکھو تب بھی اس سے بچو' کسی وقت اپنے نفس پر مطمئن نہ ہو' یہ شیطان کی ترکیبیں ہیں اور شیطان اسی واسطے تو محقق سے گھبراتا ہے کہ وہ اس کے سب اترے پترے کھول کر رکھ دیتا ہے اور محقق پر اس کو اس قدر غصہ آتا ہے کہ اگر اس کا قابو چلے تو اس کو ہلاک کردے لیکن قابو نہیں ہے اس لیے کہ فرشتے حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ فرشتوں کا ایک لشکر مقرر فرمادیا ہے کہ وہ بندوں کی حفاظت کرتے ہیں ورنہ شیطان تو انسان کی آخرت کا جیسا دشمن ہے اسی طرح دنیا کا بھی دشمن ہے لیکن اس سے زیادہ دشمن نفس ہے جو کسی وقت اس سے جدا ہی نہیں ہوتا' اس سے کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہیے خواہ تم کو وہ نفس ولی ہی نظر آدے مگر پھر بھی اس سے اطمینان نہ ہونا چاہیے کہ اس کی یہ ساری ولایت مجبوری اور بے سروسامانی کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

نفس اژدہاست او کے مردہ است   ازغم بے آلتی افسردہ است

(نفس تو ناگ ہی ہے وہ بھلا کب مردہ ہوتا ہے ہاں بے اوزار ہونے پر بعض اوقات افسردہ ہو جاتا ہے)

مولانا نے اس مقام پر ایک حکایت لکھی ہے کہ شدت سرما میں ایک مارگیر کا کسی پہاڑ پر گزر ہوا' دیکھا کہ ایک اژدھا پڑا ہے اور بالکل بے حس وحرکت ہے' ہلا جلا کر دیکھا تو بالکل کچھ بھی حرکت نہیں' سمجھا کہ مرا ہوا ہے یہ خیال باندھا کہ اس کو شہر میں لے چلو' میرا کمال ظاہر ہوگا۔ چنانچہ اس کو لایا اور ڈینگیں مارنے لگا کہ میں نے اس کو یوں مارا اور اس طرح قتل کیا' لوگ اس کی بہادری کی تعریف کرنے لگے' یہ قصہ صبح کے وقت کا ہے رفتہ رفتہ آفتاب اونچا ہوا اور اس کو گرمی پہنچی اس نے کروٹ بدلی اب تو سب کے ہوش پران ہوئے' سب سے اول تو یہ مارگیر صاحب ہی بھاگے' اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں نفس اژدھا ست یعنی اے شخص تو جو مغرور ہے کہ میرا نفس راہ پر آ گیا ہے سو یہ یاد رکھ اس کی مثال اژدھا کی سی ہے کہ جس طرح سردی کی وجہ سے افسردہ تھا اور فی الواقع زندہ تھا' اسی طرح تیرا نفس ہے جو گناہ کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے نیک نظر آتا ہے اگر ابھی گناہ کا سامان میسر ہو جاوے تب اس کو دیکھنا چاہیے پس یاد رکھو پاک کوئی نہیں جس کو اللہ تعالیٰ پاک کریں وہ پاک ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول تدبیر یہ بتلائی کہ نگاہ نیچی رکھو' اگر بضرورت تم کو کسی غیر کے سامنے آنا پڑے گا تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ' یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھل پھول کی یہی ہے جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سینکڑوں بیماریوں کا منشا ہو جاتا ہے اسی طرح نظر بھی ہے اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئندہ امن اٹھ گیا' اسی واسطے اول اسی کو روکا ہے۔

پردہ کی ضرورت واہمیت

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے زیادہ تو کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔ میں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ ابن اُم مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں وہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے' ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیٹھی تھیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ' انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ تو اندھے ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''افعمیا وان انتما لستما تبصرانہ''[1] (یعنی کیا تم بھی اندھی ہو' اس کو دیکھتی

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۷۷۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۱۶)

نہیں ہو) دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المومنین دوسری طرف نابینا صحابی بھلا یہاں کونسے وسوسہ کا احتمال ہوسکتا ہے مگر پھر بھی پردہ کا کس درجہ اہتمام کرایا۔ پس تم کو تو غیر مرد کے سامنے آنا کیسے جائز ہوگا۔ آج کل تو عورتیں بارات اور دولہا کی زیارت کو خانہ کعبہ کی زیارت سمجھتی ہی۔ چنانچہ آپس میں اس کی گفتگو ہوتی ہے کہ دولہا زیادہ خوبصورت ہے یا دلہن، سخت افسوس ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اتنے بڑے پاک صحابی کے سامنے جو کہ اندھے بھی تھے آنے کی اجازت نہ ہو اور آج عورتوں کو دولہا کو دیکھنا جائز ہو جاوے اور کوئی عورت یوں نہیں کہہ سکتی کہ ہمارے دل میں تو برائی نہیں ہے ہم تو برے جی سے نہیں دیکھتیں تو کیا تم کہہ سکتی ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل میں (نعوذ باللہ) برائی تھی اگر کہو کہ کوئی مصلحت ہوگی جس کی وجہ سے پردہ کا حکم فرمایا، پس وہی مصلحت یہاں بھی ہے بلکہ یہاں بطریق اولیٰ ہے۔ شریعت نے تو یہاں تک احتیاط کی ہے کہ نامحرم مردہ کو بھی دیکھنا ناجائز کر دیا ہے۔ بظاہر یہ خیال آیا ہوگا کہ مردہ دیکھنے میں کیا رکھا ہے سو یہ مت کہو کبھی اس سے بھی روگ پیدا ہو جاتا ہے اور اگر روگ لگ گیا یعنی اس کا خیال بندھ گیا تو دل ناپاک ہو گیا اور حاصل کچھ نہیں، گناہ بےلذت اسی کا نام ہے، ہاں خاوند کو اتنی اجازت ہے کہ مردہ بیوی کو دیکھ لے لیکن ہاتھ لگانا جائز نہیں اور بیوی کو جائز ہے کہ شوہر مردہ کو ہاتھ لگا دے۔ اب ذرا ان سب احکام کو پیش نظر رکھ کر اپنے برتاؤ دیکھو کہ غیر مردوں سے بے تکلف باتیں کرتی ہو یہ کب جائز ہوگا بلکہ غیر مرد کو سلام کرنا جائز نہیں اس لیے کہ سلام میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے فوراً محبت ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ جو دو بھائی مسلمان آپس میں لڑیں تو تین دن کے بعد آپس میں بول لیں اور بہتر وہ ہے جس کی طرف سے ابتداء بالسلام ہو اور ملاقات کے وقت بھی اسی واسطے سلام کا حکم ہے کہ آپس میں محبت بڑھے۔ پس فضول کلام تو دور کی چیز ہے سلام کی بھی اجازت نہیں۔

اجنبی مرد و عورت کے جھوٹا کھانے کا حکم

اس سے بڑھ کر اور لیجئے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اجنبی مرد کا جھوٹا عورت کو اور اجنبی عورت کا جھوٹا مرد کو کھانا مکروہ ہے اس لیے کہ خیال ہوگا کہ اس میں سے فلاں شخص نے کھایا ہے' پھر استدلال کیا جاوے گا کہ بڑے سلیقہ سے کھایا ہے۔ مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ بڑا نازک مزاج ہے اور نیز جس جگہ اس کا ہاتھ لگا ہے وہاں سے کھانے میں التذاذ ہوگا اور لیجئے اُمہات المومنین کہ جن سے نکاح ابداً حرام ہے ان کو حکم ہے کہ نرم لہجہ سے بات مت کرو بلکہ کڑوے لہجہ سے بات کرو تاکہ جس شخص کے دل میں روگ ہے وہ طمع نہ کرے۔ بیبیو آخر یہ قرآن و حدیث و احکام کس واسطے ہیں' تمہارے ہی تو عمل کے لیے ہیں جب تم عمل نہ کرو گی تو اور کون کرے گا۔

الحاصل یہ جملہ احکام اس لیے ہیں کہ غیر اللہ کی محبت دل میں نہ پیدا ہو جاوے' غرض نہ دیکھنے کی اجازت ہے اور نہ دکھلانے کی مگر بعضے باوجود پردہ کے نام کے پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ وہ مثل بے پردگی ہی کے ہیں۔ سقہ کو حکم ہوتا ہے کہ اندھیری منہ پر ڈال کر چلا آ اس کی آنکھوں پر تو اندھیری پیچھے پڑے گی' تمہاری عقلوں پر پہلے پڑ گئی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اندھیری ڈالنے سے اس کو نظر نہیں آتا تو گھڑے اس کو کیسے نظر آ گئے کہ سیدھا وہیں پہنچتا ہے تو جس طرح گھڑوں کو دیکھتا ہے اگر کسی بی بی کو بھی دیکھ لے تو کیا مشکل ہے بیبیو پردہ تو ایسی چیز ہے کہ اگر شریعت سے بھی اس کا حکم نہ ہوتا تب بھی خود غیرت اور حمیت کا اقتضا تھا کہ پردہ کیا جاوے مگر یہ سب متعلق حیا کے ہے سو اب تو ایسی بے حیائی شائع ہوئی ہے کہ پہلے جو دنیا داروں میں حیا تھی وہ اب دینداروں میں بھی نہیں ہے' عورتوں میں ذرا رکاوٹ نہیں رہی' اسی طرح مردوں کو بھی شکایت ہے بلکہ مردوں کی شکایت عورتوں سے زائد ہے اس لیے کہ عورتیں تو بہت بچی ہوئی ہیں مردوں میں بہت کم عفیف نکلیں گے اور یاد رکھو کہ جس طرح یہ تعلقات شرعاً مذموم ہیں اسی طرح طریق محبت سے بھی مذموم ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کی محبت کے ساتھ غیر پر نظر نہیں ہو سکتی' اگر غیر پر نظر ہو تو وہ کاذب اور مدعی ہے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عورت جا رہی تھی ایک مرد اس کے پیچھے ہو لیا' اس عورت

نے پوچھا کہ تم میرے ساتھ کیوں آتے ہو، کہا مجھے تجھ سے محبت ہے اس عورت نے کہا کہ میری بہن مجھ سے زیادہ حسین ہے میرے پیچھے آ رہی ہے وہ مرد اس طرف چلنے لگا، اس عورت نے ایک دھول رسید کی اور یہ کہا:

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　　پس چرا بر غیر افگندی نظر
در بیان دعوے خود صادقی　　　این بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا کہ اے بیوقوف تو اگر عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے تو پھر غیر پر نظر کیوں کرتا ہے، اے بے ہنر کیا یہ ہی تیرے عشق کا دعویٰ ہے)

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ بہت بڑے عارف گزرے ہیں اول بادشاہ تھے، بادشاہی چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی اور وطن چھوڑ دیا تھا، جب گھر سے گئے تھے تو بی بی کو امید تھی چنانچہ لڑکا پیدا ہوا جب وہ سیانا ہوا اس نے سنا کہ میرے باپ اس طرح چلے گئے اب مکہ معظمہ میں ہیں چنانچہ یہ لڑکا وہاں پہنچا حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ طواف کر رہے تھے جب اس لڑکے کو دیکھا تو محبت کا جوش ہوا، پتہ نشان پوچھنے سے معلوم ہوا کہ میرا ہی بیٹا ہے اور اس نے بھی جانا کہ میرا باپ ہے، جھک کر سلام کیا، حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا کہ بیٹا تیرا مذہب کیا ہے کہا مسلمان ہوں اور زیادہ خوش ہوئے اور سینہ سے لگالیا، اسی وقت الہام ہوا کہ اے ابراہیم دو محبتیں ایک دل میں جمع کرتے ہو۔

حب حق ہو دل میں یا حب پسر
جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

اے ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ اسی منہ سے ہماری محبت کا دم بھرتے ہو اسی وقت دعا کی اے اللہ اس کو اٹھا لے چنانچہ گردہ میں درد ہوا اور وہ لڑکا جاں بحق ہو گیا۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ وہ لڑکا حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہ اور توجہ سے ولی کامل ہو گیا تھا پس جبکہ بیٹے کی اتنی محبت جائز نہیں کہ جو حق سے غافل کر دے تو اجنبی سے جس کا منشا محض خواہش نفسانی ہو محبت کرنا کیسے جائز ہو گا۔

عذاب جان

بعض عورتوں اور نیز مردوں کو دیکھا ہے کہ ان کو اولاد کی بے انتہا محبت ہوتی ہے ایک بیگم تھیں ان کے بہت سے بچے تھے، شب کو سب کو اپنے پاس سلاتی تھیں، اب اتنی بڑی

چار پائی تو کہاں سے آوے' فرش پر سوتی' بیچ میں خود ہوتی تھیں اور چاروں طرف بچے اور رات کو کئی کئی مرتبہ ہاتھ سے دیکھتی تھیں کہ کوئی کم تو نہیں ہو گیا' تو یہ تو یہ ایسی محبت بھی عذاب جان ہے۔ایسی ہی محبت کے بارے میں تو ارشاد ہے جو کفار میں ہوتی تھی:

وَلاَ تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلآ اَوۡلاَدُهُمۡ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ کَافِرُوۡنَ.

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان کے مال اور اولاد پسند نہ آنے چاہئیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس مال اور اولاد سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دینا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کی جانیں اسی حالت میں نکل جاویں اور وہ کفر کرتے رہیں (نعوذ باللہ منہا) واقعی دنیا دار سخت تکلیف میں ہیں اگر راحت ہے تو بس اللہ والوں کو ہے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ والوں کو اولاد اور مال سے تعلق نہیں ہوتا یا یہ کہ وہ اپنے اہل وعیال کا حق ادا نہیں کرتے۔ان سے زیادہ محبت کرنے والا اور حقوق کو ادا کرنے والا تو کوئی بھی نہیں ہے ہاں حق تعالیٰ کی محبت اور اس کے حقوق پر مال اور اولاد کی محبت کو غلبہ نہیں ہوتا اور اس کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جبکہ دنیا اور دین میں باہم تزاحم ہو کہ وہ اس وقت دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور دین کو اختیار کرتے ہیں۔حدیث میں وارد ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ گھر میں ملے جلے رہتے مگر جب اذان ہوتی تو آپ اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ گویا ہم کو پہچانتے بھی نہیں۔پس ان کو حق تعالیٰ کی ایسی محبت ہوتی ہے کہ اس سے وہ ہر وقت چین میں رہتے ہیں۔ایک دفعہ جب وہ اللہ کا نام لیتے ہیں تو رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں ان کے سکون اور چین اور اطمینان طاری ہو جاتا ہے اسی واسطے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ہم کو ایسی دولت میسر ہے کہ اگر ملوک دنیا کو اس کی اطلاع ہو جاوے تو ہم پر تلواریں لے کر آ چڑھیں۔

شریعت میں اعتدال کی تعلیم

غرض شکایت اس بات کی ہے کہ محبت کثیر کیوں ہے خواہ وہ محبت مال کی ہو یا اولاد کی ہو یا بیوی کی ہو' شریعت ہر شے میں اعتدال کی تعلیم کرتی ہے۔شریعت کا مقصود یہ نہیں کہ سارا مال

خیرات کر کے اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرلو بلکہ مقصود یہ ہے کہ اعتدال کی رعایت رکھو نہ اتنی محبت ہو کہ آخرت سے غافل کردے اور نہ اتنی بے تعلقی ہو کہ حقوق ادا کرنے میں کوتاہی ہونے لگے کہ اہل وعیال بھوکے مر رہے ہیں اور یہ اپنے ذکر و شغل میں لگ رہے ہیں اور جہت افراط کا نام جبکہ مال میں ہو حرص مذموم ہے اور جب شہوت میں ہو تو وہ فجور ہے اور جو ضرورت سے بھی کم ہو خمود ہے اور ان کے درمیان عفت ہے۔ غرض ہر شے کی رغبت کا اعتدال عفت کہلاتا ہے۔ شریعت کو بھی عفت مطلوب ہے، بفضلہٖ تعالیٰ عفت کے متعلق ضروری مضمون سب آگیا ہے اور اس کی رعایت بہت کم لوگوں کو ہے کہ اکثر تو افراط میں مبتلا ہیں اور بعض جو دین داری میں آدیں گے وہ تفریط کے درجہ میں آجاتے ہیں۔ ایک عالم اس میں مبتلا ہے حتیٰ کہ بہت سے مشائخ کو بھی اس میں ابتلاء ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اعتدال کی توفیق عطا فرمادیں اور افراط و تفریط سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

حقیقت احسان

دینی و دنیوی منافع کے متعلق بمقام جامع مسجد کان پور ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۳ ہجری بروز جمعۃ المبارک ارشاد فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حامداً و مصلیاً و مسلماً امابعد واضح ہو کہ حضرت زبدۃ العارفین عمدۃ الواعظین مقتدانا مرشدنا مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو جو وعظ کان پور میں قلمبند ہوئے ہیں۔ من جملہ ان کے یہ ایک بہت بڑا معرکہ کا وعظ ہے جو اکثر دینی اور دنیوی نصائح و منافع پر مشتمل ہے اور اس کا نام مواعظ اشرفیہ قرار پایا ہے۔ جو جو صاحب اس سے منتفع ہوں اس میں تمام سعی کرنے والوں کے لیے دعائے خیر فرماتے رہیں۔

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَاللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ.[1]

ترجمہ: (ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو (یقیناً) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)

حدیث جبرائیل علیہ السلام

یہ ایک حدیث شریف کا ٹکڑا ہے اور جواب ہے ایک سوال کا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر کیا تھا جس کا پورا قصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک موجود تھے، ناگاہ ہم پر ایک ایسا شخص ظاہر ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت کالے تھے، اس پر سفر کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس

---

[1] (الصحیح للبخاری ۶: ۱۴۴، کنز العمال: ۵۲۴۹)

کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھڑ کر باادب بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال اسلامیہ کو ذکر فرمایا کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ جاننا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی تصدیق کرنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان شریف کے روزے رکھنا اور استطاعت ہونے پر بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔

یہ سن کر اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلامیہ کو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا اور قیامت کے دن پر ایمان لانا اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لانا۔ اس شخص نے اس کو بھی سن کر کہا سچ ارشاد فرماتے ہیں۔

پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ "اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ"[1] یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر نہیں دیکھتے ہو تم اس کو پس وہ بتحقیق تم کو دیکھتا ہے۔

اس سوال کے علاوہ اس شخص نے اور سوال بھی کیے تھے جو پوری حدیث میں مذکور ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے جواب بخوبی ارشاد فرمائے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اس شخص کے چلے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عمر تم جانتے بھی ہو کہ یہ سوال کرنے والے کون تھے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللّٰہ و رسولہ اعلم ادب کی وجہ سے صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کہہ دیا کرتے تھے "اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فانہ جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم" (یعنی یہ سوال کرنے والے جبرئیل علیہ السلام تھے، تمہارے پاس اس لیے آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھلا دیں)

---

[1] (الصحیح للبخاری ۶: ۱۴۴، کنز العمال: ۵۲۴۹)

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تشریف آوری کا سبب

وجہ اس آنے کی یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا تھا لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ امور دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک تو وہ جو پیش آئیں یا واقع ہوں ان کا پوچھنا تو ضروری ہے اس سے ممانعت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ محض فرضی صورتیں نکال نکال کر احتیاطاً پوچھ رکھنا' اگرچہ ابھی نہ ہوئی ہوں' جیسے اب بھی ایک تو عام لوگ ہیں ان کو تو یہ چاہیے کہ جب کوئی امر پیش آوے اس وقت دریافت کر لیں یا ایسا کوئی امر جس کا واقع ہونا غالب ہو تو وہ دریافت کر لیں۔ یہ نہیں کہ فرضی بعید الوقوع صورتیں دریافت کر کر کے پریشان کریں۔ البتہ طلباء جن کا کام ہے مسائل کی تحقیق کرنا وہ اگر دریافت کریں تو مضائقہ نہیں اور بعض لوگوں کی جو یہ عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ مولویوں کو دق کرنے کے لیے ایسی باتیں پوچھا کرتے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں' یہ سب بیکار وفضول ہے۔

ممانعت سوالات کے اسباب

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جو رسول سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا تھا اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ ایسی فرضی باتیں دریافت کرنا خلاف ادب تھا۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضروری بات خود ہی بیان فرما دیا کرتے تھے' آپ کا ارشاد ہے: "انما بعثت معلما"[1] (مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) یہ تو آپ کا فرض منصبی ہی تھا اور خود آپ اعلیٰ درجہ کی شفقت رکھتے تھے۔ ضرورتوں کو سمجھتے تھے آپ بغیر پوچھے بتلا دیا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں سوالات کرتے رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس طرح اگر کوئی طبیب حاذق شفیق ہو اس نے نبض دیکھ لی' ضرورت امور دریافت کر کے تشخیص کر لی' نسخہ لکھ دیا' پرہیز بتلا دیا۔ سارے ضروری امور سے خود ہی غایت شفقت کے باعث سے آگاہ کر دیا تو پھر ایسے شخص سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔

تیسری یہ بھی مصلحت ہو سکتی ہے کہ بعض منافقین گھڑ گھڑ کر صورتیں پوچھا کرتے تھے اور غرض اس سے محض دق کرنا ہوتا تھا' اس لیے مسلمانوں کو بھی منع کر دیا گیا تا کہ منافقین کو آڑ نہ ملے۔ چنانچہ خود مجھ سے ایک شخص نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ دو شخص چلے جاتے تھے اور ان کے ہمراہ ایک عورت تھی' ایک شخص اس کا خاوند تھا دوسرا اس کا بھائی' اتفاق سے

---

[1] (سنن ابن ماجہ: ۲۲۹' کنز العمال: ۲۸۷۵۱)

چوروں نے دونوں کو قتل کر ڈالا' سرتن سے جدا ہو گیا' وہ رونے لگی' اتفاق سے ایک درویش کامل کا ادھر سے گزر ہوا' وہ واقعہ دریافت کرنے کے بعد اس عورت سے کہا کہ دونوں کے سر دھڑ سے لگا دے' اس نے خاوند کے دھڑ کے ساتھ بھائی کا سر اور خاوند کا سر بھائی کے دھڑ کے ساتھ لگا دیا' انہوں نے دعا کی دونوں زندہ ہو گئے تو بتلاؤ کہ وہ عورت کس کو ملے گی؟ میں نے کہہ دیا کہ جناب مجھے نہیں معلوم' ایسی باتوں کے پوچھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم کہیں گے ہم نے ایسی بات پوچھی کہ اس کا جواب عالم سے بھی نہیں بن آیا یا ہم ایسے بڑے ہیں ایسے ذہین ہیں اور بس۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بعض بات آسان ہوتی ہے اور پوچھنے کی بدولت دشوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب حج فرض ہوا تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ "افی کل عام یا رسول الله صلی الله علیه وسلم" (کیا ہر سال میں ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ نے کچھ دیر سکوت فرمایا۔ پھر ارشاد کیا کہ اگر میں نعم (ہاں) کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم لوگوں سے نہ ہو سکتا' مصیبت میں پڑ جاتے اور آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "ذرونی ماترکتکم"[1] (یعنی مجھ کو چھوڑے رکھو جو مناسب سمجھوں گا اس سے تم کو آگاہ کر دیا کروں گا تم کھود کھود کر نہ پوچھا کرو) یہ وہ مصلحتیں تھیں جو ممانعت سوال کا باعث تھیں اور اس وقت میرے خیال میں آئیں ممکن ہے کہ اور بھی مصلحتیں ہوں۔

بہرحال ممانعت سوال کی وجہ سے صحابہؓ دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ بعض امور ان کے خیال میں آتے ہوں گے لیکن اس میں تردد ہو جاتا ہو گا کہ نا معلوم یہ باتیں ضروری ہیں یا نہیں' ان کا پوچھنا بے ادبی تو نہیں ہے اس لیے ڈر کے مارے نہ پوچھ سکتے تھے۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے جو حاصل کرنے کے قابل ہے کہ جو دل میں کھٹکے اسے ترک کر دیا جاوے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا "دع مایریبک الی مالا یریبک"[2] (یعنی جس چیز سے تمہیں کھٹکا ہو اسے چھوڑ کر ایسی چیز اختیار ہو جس سے کھٹکا نہ ہو) پس خدا تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ پوچھیں گے تو صحابہؓ کو بہت سی دین کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

---

[1] (الصحیح لمسلم' الفضائل ب:۳۷' سنن ابن ماجه: ۲)

[2] (سنن الترمذی: ۲۵۱۸' مشکوٰة المصابیح: ۲۷۷۳)

احسان کا مفہوم

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت اس لیے احسان کے بیان کو اختیار کیا ہے کہ اس کی بڑی ضرورت ہے' لوگ اس سے بالکل غافل ہو رہے ہیں۔ احسان کے متعارف معنی جو اردو میں مشہور ہیں وہ یہاں مراد نہیں۔ یہ عربی لفظ ہے اس کے معنی ہیں اچھا کرنا اور یہاں مراد ہے عبادت کو اچھا کرنا۔ اب دیکھئے اول تو لوگ عبادت ہی سے بھاگتے ہیں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے' دنیوی کاموں میں دن رات لگے رہتے ہیں' ذرا ذرا سی باتوں کے لیے مشقت اٹھاتے ہیں۔ خصوصاً اگر تھوڑی سی دنیاوی امید ہوتی ہے تو بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے لیکن عبادت میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا طلبی میں سرگرم ہیں۔

مسئلہ ترقی دنیا

اس پر طرہ یہ ہے کہ اس کی (یعنی دنیا طلبی کی) اور ترغیب دی جاتی ہے' جلسے ہوتے ہیں' کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور کوشش ہے کہ خوب مال و دولت کی حرص بڑھ جاوے' ہوا و ہوس میں ترقی ہو' دن رات ترقی ترقی کی پکار ہو رہی ہے' ہوا و ہوس کا نام بدل کر ترقی رکھ دیا ہے۔ آخر اس سے مطلب کیا ہے یہی نا کہ مال خوب حاصل کیا جاوے' مکان بھی نہایت عالی شان ہو' کپڑے بھی نہایت قیمتی ہوں' اسباب بھی بیش بہا ہو' غرضیکہ دنیاوی عیش و سامان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاوے' چاہے دین رہے یا جائے لیکن یہ بھی معلوم رہے کہ ترقی کا مسئلہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں جس کا نہایت معتبر اور سچا واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالا خانہ پر تشریف رکھتے تھے وہاں صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی آپ ؐ اس پر لیٹے ہوئے تھے' جسم شریف پر چٹائی کے نشان بن گئے تھے اور سرہانے کی جانب کچھ کچے چمڑے لٹک رہے تھے' پائنتی کی جانب کچھ ببول کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں تا کہ ان چمڑوں کو ان سے دباغت دے لیا جاوے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حالت کو دیکھ کر رونے لگے' آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور عرض کرنے لگے یا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیصر اور کسریٰ وغیرہ جو شرک

اور کفر میں مبتلا ہیں خدا کی عبادت نہیں کرتے وہ تو چین و آرام سے گزاریں اور آپؐ اس تنگی کی حالت بسر کریں آپؐ دعا فرمائیے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی اُمت کو وسعت عنایت کریں۔

یہ حضرت عمرؓ کا ادب تھا کہ اُمت کی وسعت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا "**افی شک انت یا ابن الخطاب**"[1] (کیا اے عمرؓ ابن خطاب تم اب تک شک ہی میں پڑے ہوئے ہو) "**اولئک عجلت لھم طیباتھم فی الحیوۃ الدنیا**" (ان کو لذیذ چیزیں دنیا میں جلدی سے مل گئی ہیں) مطلب یہ ہے کہ تمام آرام و آسائش کفار کو دنیا ہی میں مل گیا ہے' آخرت میں وہ محروم رہیں گے۔ اب ہم لوگوں کے لیے خدائے تعالیٰ نے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کے افلاس اور تنگ دستی کی شکایت کی تھی اور چاہا تھا کہ دعا کر دی جائے اور فراغت اور وسعت ہو جائے' مال و دولت با فراط مل جائے' خوب ہی آسائش و آرام سے گزرنے لگے' دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کی درخواست کی تھی اور چاہا تھا کہ جیسے کفار کو مال و دولت میں ترقی حاصل ہے اسی طرح مسلمان بھی ترقی کریں۔ آپؐ نے فیصلہ فرما دیا کہ ان کو یہاں مل گیا ہے ہم کو قیامت میں ملے گا۔ ایک یہ بات لوگ بہت کہا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں ترقی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دوسری قومیں بھی ترقی یافتہ نہ تھیں' اب ضرورت ہے۔ ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا اس زمانہ میں کسی نے ترقی نہ کی تھی' قیصر اور کسریٰ کی عیش پرستیاں اور عیش ونشاط کے سامان دیکھئے' تاریخ پڑھئے۔ مال و دولت میں عیش میں آرام میں تزک و احتشام میں کیا تھا جو ان کے پاس نہ تھا' عمدہ سے عمدہ سامان عشرت مہیا تھے اور مسلمانوں کے پاس وہ سامان اور اسباب نہ تھا۔ پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا تو اب کیا باقی رہ گیا بلکہ اگر غور کیا جائے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو افراط دنیا سے کچھ ضرر بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ قلب نہایت قوی رکھتے تھے۔ خدا کی اطاعت فرمانبرداری ان کے دلوں میں رگ و ریشوں میں گھسی ہوئی تھی' دل و جان سے احکام شرعیہ کی تعمیل پر آمادہ اور سرگرم رہتے تھے' خدا کے خوف سے ہر وقت ترساں و لرزاں رہا کرتے تھے۔

---

[1] (مسند احمد ۱ : ۳۴' کنز العمال : ۳۲۶۳)

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو سانپ کے پکڑنے اور اس کے زہر کے اثر نہ کرنے کا منتر یاد کرا دیا گیا ہو تو وہ سانپ کو بے کھٹکے پکڑ سکتا ہے۔ اگر چہ سانپ اس کے ہاتھ میں ہو' مگر وہ ہر طرح سے مطمئن رہتا ہے' دنیا اگر چہ سانپ کے مثل تھی لیکن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس کا منتر یاد تھا' یعنی ذکر اللہ' خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کو دنیا سے کیا ضرر ہو سکتا تھا بخلاف ہم لوگوں کے کہ منتر تو یاد نہیں اور سانپ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہلاکت' جہاں ذرا اس نے ڈسا اور خاتمہ ہوا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی وہ حالت تھی کہ اس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دیانت' حق پرستی' قوت ایمان ایسے تمام اخلاق وصفات موافقین کیا مخالفین کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں۔ ذرا ان کی حالت دیکھئے خلافت کا تو زمانہ اور کپڑے پیوند لگے پہنے ہوئے چکنا سالن تک نہ کھاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی دعوت کی تھی اور گوشت پکا رکھا تھا جس میں گھی بھی کسی قدر ڈالا ہوا تھا' کھانا کھانے کے وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا: میاں تم نے تو ایک سالن کے ساتھ دوسرا سالن بھی جمع کر دیا ہے یعنی ایک تو گھی اس سے بھی روٹی کھائی جا سکتی ہے دوسرا گوشت کہ اس سے بھی روٹی کھا سکتے ہیں' اس قدر اسراف اور تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے اس میں مقدار معین سے زیادہ صرف نہیں کیا ہے' جس قدر خرچ لے کر گوشت خریدنے نکلا تھا اسی قدر میں بوجہ معمولی گوشت ہونے کے تھوڑے کا گوشت لے لیا اور باقی کا گھی خرید لیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات صحیح ہے مگر میرے نزدیک غیر مناسب ہے۔ القصہ وہ کھانا آپ نے نہیں کھایا' چھپر رہنے کو تھا' کوئی بڑا محل نہ تھا' دربان نہ تھے' پہرہ چوکی نہ تھا' اپنے کام کو خود کر لیا کرتے تھے' راتوں کو گشت لگاتے تھے' لوگوں کی حالت دریافت کرتے تھے' ضعفاء اور مساکین کی خبر لیتے تھے' پھر بھی آپ کی کیفیت اور حالت کو دیکھئے بغور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا صاحب اسرار لقب ہے اس وجہ سے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

منافقین کے نام بتلا دیئے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے قسم دے دے کر پوچھا کرتے تھے کہ سچ بتلانا کہیں میرا نام تو ان لوگوں میں نہیں ہے۔ جب تقویٰ اور خشیت کی یہ حالت ہو تو پھر اگر ایسے لوگوں کے پاس دنیا ہوتی تو ان کو کیا ضرر ہو سکتا تھا۔

طوفان بے تمیزی

اب بتلایئے کہ اس زمانہ کے مناسب کیوں ترقی نہ تھی اور اس زمانہ کے مناسب کیوں ہے؟ کیا اس زمانہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی؟ اکاسرہ اور قیاصرہ کے پاس کس چیز کی کمی تھی اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ضرر کا احتمال بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے اور تمام چیزوں میں بھی یہی عذر کیا کرتے تھے' نماز کی نسبت کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ضرورت تھی جب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے کیونکہ بت پرستی حال ہی میں چھوڑی تھی اس لیے ضرورت تھی کہ خدا کی عبادت کریں تا کہ بتوں کا خیال دل سے نکل جائے' روزہ رمضان کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں غصہ وغیرہ کا غلبہ تھا' قوت کا زور تھا' اس لیے ضرورت تھی کہ روزہ رکھیں تا کہ ضعف آ جائے وہ سختی جاتی رہے' اب خود ہی لوگ ضعیف اور مہذب ہو رہے ہیں' اب کیا ضرورت ہے۔ رہا حج چونکہ وہ تجارت کا ذریعہ تھا' تجارت کے لیے لوگ جمع ہوا کرتے تھے' حج کی بھی بیخ لگا دی۔ رہ گئی زکوٰۃ سودہ تو ان کی ترقی کے بالکل خلاف ہے۔ تصویروں کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے لوگ بت پرستی کے عادی ہو رہے تھے' اس کو اچھا سمجھتے تھے' اسلام لانے کے بعد پہلا خیال کچھ نہ کچھ دل میں بسا ہوا تھا' اگر تصویر وغیرہ رکھتے تو خیال سابق میں زیادتی ہوتی اور بت پرستی کا ذریعہ ہو جاتا اب کیا ضرورت ہے۔ اب تو بعض بت پرست قومیں بھی اس کی قباحت کو تسلیم کرتی جاتی ہیں اور مسلمانوں میں تو پشتہا پشت سے بت پرستی کا نام بھی نہیں' اب تصویر سے کیا حرج ہے۔

غرض طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے جو کچھ جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اسلام ہی کی ضرورت نہیں' چلو چھٹی ہوئی' دعویٰ تو اسلام کا اور اس کے تمام احکامات سے انکار' ہر ہر چیز کے ساتھ پھیر پھار کر دین سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ صاف

صاف انکار کرنا تو ذرا مشکل ہوتا ہے کہ لوگ برا کہیں گے۔ اگرچہ بعض نے ہمت کر کے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مذہب کی مانع ترقی ہے۔ ایک کمیٹی لکھنؤ میں ہوئی تھی' ترقی کے ذرائع اور موانع سوچنے کے متعلق۔ وہاں ایک صاحب نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے ایک صاحب نے وہیں خوب ہی جواب دیا اور کہا واقعی یہی بات ہے لیکن مذہب کی طرح قانون بھی مانع ترقی ہے جب مذہب سے دستبردار ہو تو قانون کو بھی چھوڑ دو' چوری ڈکیتی کی جائے تو بہت سا مال جمع ہو سکتا ہے۔ اگر موقع ہو اور کسی کے قتل سے مال ہاتھ آتا ہو تو اس سے دریغ کرنے کی کیا وجہ؟ غصب کو بھی جی چاہتا ہوگا' پھر کون مانع ہے یہی نا کہ قانون ان امور کے مرتکب ہونے والے کو سزا ہوتی ہے۔ ذرا خلاف قانون کریں تو خبر لی جائے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر مذہب سے دستبردار ہوتے تھے تو قانون کو بھی چھوڑ دیتے اس کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ غضب ہے حکام ظاہری کے قانون کا تو اتنا خوف اور حاکم حقیقی اور تمام جہان کے بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ دلیری اور گستاخی' عجب اندھیر ہو رہا ہے۔ دنیا میں انہماک ہے ایسی حالت میں عبادت کی بھلا کہاں نوبت آ سکتی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو توفیق ہوئی بھی تو محض صورت عبادت کی ہوتی ہے معنی عبادت کے بالکل نہیں ہوتے۔ معنی سے یہ عبادت محض معراء ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بادام تو ہو اور اس میں مغز نہ ہو' صرف پوست ہی پوست ہو یا جیسے دیوالی کی مورتیں اور تصویریں ہوتی ہیں کہ یہ کمہار ہے' یہ لوہار وغیرہ ہے سب ہی کچھ ہے لیکن اصلیت نہیں۔ نام کو آدمی لیکن آدمیت نہیں' نام تو ہاتھی ہے اور کام کچھ نہیں کر سکتا' کسی چیز کو لادنا تو درکنار وہ خود خریدنے اور بنانے والے پر لدا لدا پھرتا ہے۔ اگر کوئی حاکم کسی سے کہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اور کوئی شخص آدمی کی تصویر پیش کر دے کہ حضور اس کو نوکری میں قبول فرماویں تو کیا وہ حاکم اس بیوقوف نادان سے ناراض نہ ہوگا اور اس کی بیہودہ حرکت کو سخت بے ادبی اور گستاخی نہ سمجھے گا' سزا نہ دے گا؟ تو پھر بڑے غضب کی بات ہے کہ ہم خدا کے سامنے اس نام کے آدمی یعنی صورت آدمی کے مثل صورت عبادت کو بے خوف وخطر پیش کریں اور گستاخی کا ذرا خیال بھی نہ آئے' عبادت بے جان تو پیش کریں اور شرماویں نہیں۔

عبادت کی روح

اب سمجھنا چاہیے کہ عبادت کی روح اور جان کیا ہے' اس کی حقیقت اور صورت میں کیا فرق ہے' کون سی چیز ہے جس کے ہونے سے صورت عبادت اصلی عبادت ہو جاتی ہے' اس کا کیا درجہ ہے۔ پس اس حدیث سے دیکھئے عبادت کے اچھا کرنے کی حقیقت بتلائی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اچھا ہونے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں۔ یعنی اس میں کوئی نقصان نہ ہو کوئی کسر نہ رہے' جیسی چاہیے ویسی ہی ہو۔ غرض ہر چیز کا اچھا ہونا اس کے مناسب جدا طریق سے ہوتا ہے۔ مثلاً اچھی روٹی وہ ہوگی جس کا مادہ بھی اچھا صورت بھی اچھی ہو' جو اس کا ثمرہ ہے وہ بھی اچھا ہو۔ اسی طرح یوں کہا کرتے ہیں کہ فلاں طالب علم امتحان میں اچھا رہا' یعنی اس کی تقریر بھی اچھی تھی' تحریر بھی' طرز بیان بھی خوب صاف تھا' مطلب واضح تھا' حشو و زوائد سے کلام مبرا تھا' یعنی تمام ضروریات مجتمع تھیں' کوئی حالت ایسی نہ تھی جس کی کمی رہ گئی ہو' اسی پر قیاس کر کے عبادت کے اچھا ہونے کے معنی بھی سمجھئے کہ جتنے امور کی عبادت میں ضرورت ہے جو جو چیزیں واجب الاجتماع ہیں سب کی سب اس میں پائی جاویں' کسی چیز کی کسر نہ رہے۔

عبادت کی صورت اور حقیقت

یہ تو اجمالاً تھا' اب اس کی تفصیل کہ وہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے عبادت اچھی ہوتی ہے' شرائع میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت اور نقل عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یعنی فقہاء نے جو ضبط کر دیا ہے قیام' رکوع' سجدہ' قعدہ' قومہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے اور جو فقہ کا موضوع تھا اس کے موافق انہوں نے لکھا ہے لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ تمام امور جن کا عبادت سے تعلق ہے اس میں منحصر ہیں۔ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اور کچھ بھی ہے۔ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی معنی شرع کا بھی اعتبار ہے۔ اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں' تصوف کو علیحدہ اور الگ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جاوے۔ یہ علیحدگی ایسی ہے جیسی فقہ مشہور میں کتاب الزکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ الگ الگ کتابیں ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ کے مسائل کتاب الزکوٰۃ میں نہیں ملیں گے اور نہ کتاب

الزکوٰۃ کے کتاب الصلوٰۃ میں۔اس سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کتاب الصلوٰۃ فقہ میں داخل نہیں۔اسی طرح کتاب التصوف بھی فقہ ہے۔اگر چہ اس کی کتابیں الگ ہیں اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔اس طرح توحید اخلاص یا کبر تواضع' عجب وغیرہ اخلاق حمیدہ اور رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔عموماً لوگ نماز میں قیام' رکوع وغیرہ ہی کو عبادت کی حقیقت سمجھتے ہیں اور اسی میں عبادت کو محصور جانتے ہیں' عوام تو عوام طالب علموں کی بھی شکایت ہے۔ہم لوگوں کی خود حالت قابل افسوس ہے' اہل علم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے' میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں۔بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ ہم ساری کتابیں پوری کرلیں' ہدایہ بھی' صدرا بھی' شمس بازغہ بھی' لیکن عمل کرنے کی ذرا بھی پروا نہیں' قوت عملیہ اس درجہ ضعیف ہو رہی ہے اس درجہ اس میں خلل آ گیا ہے اس قدر مختل ہو رہی ہے جس کا حساب نہیں۔ایسی ایسی خفیف حرکات کرتے ہیں جس سے افسوس ہوتا ہے۔بہت سے معاصی ہیں کہ ان میں شب و روز مبتلا ہیں اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا' کسی کی چیز بلا اجازت اٹھالی اور جہاں چاہا ڈال دی' کسی کی کتاب بلا اجازت لے لی اور ایسی جگہ رکھ دی کہ اس کو نہیں ملتی وہ پریشان ہو رہا ہے' کسی سے کسی اچھے کام کا وعدہ کیا اور اس کے پورا کرنے کی اصلاً فکر نہیں' اس طرح سینکڑوں قصے ہیں کہاں تک بیان کیے جاویں۔

ضرورت عمل

لیکن باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی ان کے علم و فضل میں شک نہیں ہوتا حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں۔یوں تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے' بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے' تفسیر میں وہ ماہر' حدیث میں وہ واقف' فقہ میں وہ کامل' کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتا' اگر زیادہ نہ جانتا ہوتا تو علماء کو بہکا کیسے سکتا؟ جب کوئی شخص کسی فن میں ماہر ہوتا ہے جب ہی تو وہ اپنے سے کم جاننے والے کو دھوکا دے سکتا ہے۔اس میں (یعنی شیطان میں) اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے ایسا علم جو عمل کے لیے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے۔اس حدیث میں "لیجاری به

العلماء اولیماری به السفهاء[۱] (تا کہ فخر کریں ساتھ اس کے علماء اور مناظرہ اور جھگڑا کریں ساتھ اس کے سفہاء) وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ایسے غافل ہو رہے ہیں کہ اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے، بعض گو لوگ قصداً گناہ نہیں کرتے لیکن بے پروائی کی وجہ سے ان سے گناہ ہو جاتے ہیں وہ بھی شکایت کے قابل ہیں۔ اگر کوئی ملازم سرکاری بے پروائی کرے اور کام خراب کر دے تو کیا اس سے باز پرس نہ ہوگی؟ لوگوں نے عبادت کا ست نکال لیا ہے۔ مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لیے اور نماز ادا ہوگئی، خصوصاً اہل علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام، قعود کے اور بھی کچھ ہے اور وہ ضرورت بھی ہے۔ جس قرآن میں "قَدْاَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ" (تحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں) ہے اسی میں خَاشِعُوْنَ بھی آیا ہے جب صَلٰوتِهِمْ (اپنی نماز) کے لفظ سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں تو کیا وجہ خَاشِعُوْن (خشوع کرنے والے ہیں) سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح اور مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ خشوع بھی ویسا ہی ہے جیسے قیام و رکوع وغیرہ۔ اس غلطی کو دفع کرنا نہایت ضروری ہے کہ ایک کو تو ضروری سمجھیں اور دوسرے کو نہ سمجھیں حالانکہ دونوں حکم یکساں ضروری ہیں۔ یہ خشوع ہی ہے جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے احسان اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

ضرورت احسان

احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں، اول احسان کا ضروری ہونا، دوسرے احسان کی حقیقت، تیسرے تحصیل طریق احسان، اجمالاً اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ احسان خشوع سے حاصل ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا قَدْاَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْن (تحقیق مسلمانوں نے فلاح پائی) سے معلوم ہو چکا ہے اب اس کا ضروری ہونا سنئے۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ.

ترجمہ: (کیا ایمان والوں کے لیے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی

---

[۱] (سنن ابن ماجہ: ۲۵۳، حلیۃ الاولیاء ۷: ۹۶)

نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاویں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) ان پر زمانہ گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پس ان کے دل سخت ہو گئے)

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آ گئیں۔ دیکھو عبادت میں خشوع نہ ہونے پر کیسی وعید ہے۔ شکایت کی ہے اور یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے کہ ایسے نہ بنو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بری چیز ہے جس کے باعث سے کفار کے ساتھ آدمی مشابہ ہو جاتا ہے اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے۔ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (پس ان کے دل سخت ہو گئے) قساوت قلب نہایت بری چیز ہے۔ قساوت کی نسبت قرآن شریف میں ہے: "فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ" (یعنی تباہی اور ہلاکت ہے ان کو جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں، وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے، ان سب نصوص سے ثابت ہوا کہ قساوت بری چیز ہے اور خشوع ضروری ہے لیکن خرابی یہ ہو رہی ہے کہ لوگ خشوع کی حقیقت نہیں سمجھتے اسی وجہ سے اس کی فکر بھی نہیں کرتے جو شخص کسی چیز سے واقف نہ ہوگا وہ اس کو حاصل کیا کرے گا۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خشوع کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آوے، ایسی مدہوشی ہو جاوے کہ تیر برچھا کچھ ہی لگے اس کی خبر نہ ہو، پس انسان جماد کی طرح بن جاوے، آدمیت سے گزر جاوے، کوئی پوچھے یہ معنی کہاں لکھے ہیں اور کسی نے لکھے ہیں اس کا کچھ جواب نہیں اور واقعی کہیں بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں۔ یہ شبہ کم فہم اور غیر شفیق واعظوں کی بدولت پڑا ہے۔

علوم باطنی کی تحصیل کی ضرورت

انہوں نے ایسی حکایتیں بیان کیں جن سے دھوکہ میں پڑ گئے، پڑھے لکھے آدمی بھی اس سے ناواقف ہیں اور کیوں نہ ہوں ان کے درس میں کوئی تصوف کی کتاب تو ہے نہیں لیکن عام لوگوں کے سنانے کے لیے موجود ہو گئے۔ امراض قلبی اور امراض باطنی کے علاج کرنے پر آمادہ ہیں، وعظ و نصیحت کرنے پر مستعد حالانکہ خود نہیں سمجھتے تو ایسے شخص کی مثال

ہے جس نے نہ طب پڑھی نہ مطب کیا اور علاج کرنے لگا۔ علاج کے لیے پہلے طب پڑھنا ضروری ہے اور پھر مطب کرنا بھی لازمی ہے۔ بغیر اس کے قابلیت علاج نہیں آ سکتی ایسے ہی مدارس کی نسبت کسی نے کہا ہے:

ایھا القوم الذی فی المدرسة　　　کل ما حصلتموہ وسوسه

علم نبود غیر علم عاشقی　　　مابقی تلبیس ابلیس شقی

(یعنی اے قوم جو کچھ تم نے مدرسہ علم (لفظی) حاصل کیا وہ وسوسہ تھا، علم عاشقی کے علاوہ جو بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے)

جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے ویسے ہی ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور امام غزالیؒ کی اربعین اور شیخ شہاب الدینؒ سہروردی کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری ہے یہ تو گویا طب پڑھنا ہے اور اس کا مطب یہ ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو، یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑو)

کیسی ناانصافی کی بات ہے کہ جب دس برس علم ظاہری کی تحصیل میں صرف کیے تو دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو، اس کے اخلاق، عادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ شہوت کے وقت میں وہ کیسی حالت میں رہتا ہے، خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے، اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت ہوئی تھی، ہم بھی ویسا ہی کریں گے اس کے اخلاق و عادات پیش نظر ہو جائیں گے یہ اس کا مطلب ہوا۔ چنانچہ کہا ہے:

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　　تاراہ بیں نباشی کے راہ بر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ صاحب خبر ہو جائے، جب تک راہ میں (راستہ دیکھنے والا) نہ ہوگا راہ بر (راستہ دکھلانے والا) کیسے ہو سکتا ہے، اس لیے حقائق کے مدرسہ میں ادیب عشق کے سامنے کوشش کر کہ ایک نہ ایک روز باپ (یعنی مصلح) بن جائے گا)

ساری خرابی کی جڑ

ساری خرابی انہیں ناعاقبت اندیش واعظوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ایسی ایسی حکایتیں بیان کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عمل کرنا بہت ہی دشوار ہے اور جو کچھ کرتے ہیں ایسی حکایتوں کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مثلاً طلب حلال کے متعلق یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حلال روزی کی طلب میں نکلے' ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جس کے پاس حلال روزی کی خبر لگی تھی اس نے جواب دیا کہ تھی تو میرے پاس لیکن چند روز سے حلال نہیں رہی۔ اتفاق سے میرا بیل دوسرے کے کھیت میں چلا گیا' دوسرے کھیت کی مٹی اس کے پیر میں لگ کر میرے کھیت میں آ گری اس لیے اب روزی حلال نہیں رہی۔ محض مستبعد بات ہے اول تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے بیل کھیت ہی میں ہمیشہ رہا کریں' باہر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئے اور اگر ہو بھی تو اس سے کہیں حرمت آتی ہے اور تمام امور سے قطع نظر کر کے اگر اس کی کوئی توجیہ بھی ہو تو اس بزرگ کی خاص حالت ہوگی عام تکلیف تو نہیں دی جا سکتی۔

اب ظاہر ہے کہ اس حکایت کو سن کر یہ خیال پیدا ہوگا کہ حلال روزی تو ممکن نہیں اس لیے پھر خوب دل کھول کر حرام ہی کمایا جاوے' جس طرح ملے' چوری سے' دغا بازی سے' رشوت سے' سود سے سب لینا چاہیے اور اس طرح تباہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی باتیں بیان کرنے سے ان کی غرض ہوتی ہے کہ وعظ میں ذرا رنگ آ جاوے۔ نئی بات ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پسند آئے' خوب واہ واہ ہو۔

شریعت میں ایسی تنگی نہیں

شریعت میں ہرگز ایسی تنگی نہیں ہے ایسی تنگی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک بخیل صاحب کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ بے چراغ بڑھائے ہوئے نماز پڑھنے کو مسجد میں چل کھڑے ہوئے' راستے میں یاد آیا کہ یہ فضول خرچی ہے' لوٹ کر چراغ گل کرنے آئے' لونڈی نے پوچھا خیر تو ہے' حضور کیسے لوٹ آئے؟ اتنی فضول خرچی ہوئی کہ آپ کے یہاں تک لوٹ کر آنے میں جوتہ گھس گیا ہوگا' بڑے خوش ہوئے اور جواب دیا کہ چراغ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا اس کے بجھانے کو آیا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی گل کر دیا

تھا۔ وہ بولے شاباش کہ تو بڑی محتاط ہے اور تجھے فکر ہے کہ کوئی فضول خرچی نہ ہوحتیٰ کہ میرے جوتا گھسنے کا بھی خیال ہے لیکن سمجھ لے کہ میں نے لوٹتے وقت جوتا اتار کر بغل میں دبالیا تھا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" شریعت ایسی مہمل باتوں سے پاک ہے۔ ایسی تنگی اس میں کہاں؟ بلکہ جب حلال صورتیں بکثرت بتلائی جائیں گی توفیق عمل کی ہوگی' حلال روزی کی فکر کریں گے سمجھ لو کہ ہدایہ وکنز وغیرہ میں جو جو چیزیں حلال لکھی ہیں وہ بلاشبہ حلال ہیں اس میں ذرا شک نہیں۔ بات کیا ہے کہ اہل باطن جو مغلوب الحال تھے یہ ان کی حکایتیں ہیں' عوام کے سامنے ان کو بیان کر دیا' یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ ایک شخص کو پیچش کا عارضہ تھا' حکیم صاحب نے ان کے لیے وہی خشکہ تجویز فرمایا اور ایک شخص کو ضعف دماغ تھا' اس کے لیے مقوی چیزیں گوشت' یخنی' دودھ' قورمہ تجویز کیا۔ اب اگر پیچش والا سن کر اس پر عمل کرنے لگے تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا' مرے گا۔

اسی طرح جو حالات بیان کیے تھے سچ تھے لیکن یہ کس کے تھے اہل باطن کے لیے' یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات بیان کر ہی دی جائے' لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی خشوع ہے اور یہی بڑا کمال ہے کہ تیر بھی لگے تو خبر نہ ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز کو ذرا طویل کروں لیکن کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔

اب بتلائیے کہ یہ کمال کی حالت ہے یا وہ' تیر کی خبر نہ ہونا بھی ایک حالت ہے جسے استغراق ومحویت کہتے ہیں لیکن وہ خشوع نہیں ہے۔ نماز کے معنی اگر کوئی بیان کرے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نہ کھانا تو یہ غلط ہے اگرچہ نماز بھی کوئی چیز ہے لیکن یہ نماز نہیں ہے اسی طرح یہ حالت ہے تو ضرور لیکن یہ خشوع نہیں ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ ایک مرتبہ مقدمہ پیش ہوا' مدعا علیہ نے گواہی پر جرح کی کہ نماز نہیں پڑھتا' اس نے کہا کہ واہ صاحب میں تو حج بھی کر آیا ہوں۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ اچھا بتلا زمزم کیا چیز ہے اور عرفات کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ زمزم ایک بوڑھا آدمی ہے اور عرفات ایک باغ ہے جس میں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا ہے۔ قاضی نے کہا کہ کیا غلط کہتا ہے فضول بکتا ہے

ہم نے خود حج کیا ہے زمزم ایک کنویں کا نام ہے اور عرفات ایک جنگل ہے۔ اس نے کہا جب میں گیا تھا اس وقت تو یہی تھا آپ کے جانے کے وقت بدل گیا ہوگا۔

خشوع کے معنی

خشوع کے معنی یہ کہنا کہ کچھ خبر نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے کاذب نے کنویں اور عرفات کی حقیقت بیان کی تھی۔ ہاں اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ بھی ایک حالت ہے۔ جیسے عرفات و زمزم کا وجود واقعی تھا' گو جو وہ کہتا تھا نہ تھا' گو بعض لوگ سرے سے اس حالت کا بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ امر خلاف فطرت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اس طرح کہ اس کو تیر لگنے کی خبر نہ ہو' اس منکر کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی مادر زاد عنین لذت جماع کا انکار کرے یا کوئی مادر زاد اندھا کہے کہ لوگ جس کو دیکھنا کہتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں ہے حالانکہ ایسے واقعات ثابت ہوئے ہیں۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ حدیث شریف کا بیان کر رہے تھے ان کی آستین میں کہیں سے کمبخت ایک بچھو گھس گیا تھا' وہ ڈنک مارتا تھا جس کے صدمہ سے ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا لیکن اف نہیں کرتے تھے اور برابر حدیث شریف کا بیان کرتے رہے۔ حتیٰ کہ گیارہ بار اس نے نیش زنی کی جب گھر آ کر کرتا اتار اتو کرتے میں خادم نے بچھو کو دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نے اس وقت کیوں نہیں اظہار فرمایا' جواب دیا کہ مجھے شرم آئی کہ حدیث شریف کے وقت دوسری طرف توجہ متوجہ ہوں۔

لیکن باوجود اس کے خشوع کے یہ معنی نہیں کہ دوسرا خیال نہ آوے جو شخص خشوع کی حقیقت نہ سمجھے گا سخت غلطی میں مبتلا ہوگا' سمجھے گا کہ دوسرا خیال تو رک سکتا نہیں اور بندہ خشوع کا ہے مکلف اس لیے "لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) میں شک کرنے لگے۔ ایسی حکایتوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

خشوع کی حقیقت

اب چاہیے کہ خشوع کی حقیقت کو خوب سمجھ لیجئے۔ پہلے لغت کے موافق اس کے معنی بیان کیے جاتے ہیں پھر شریعت سے اس کی تائید کردی جائے گی۔ اس سے معلوم ہو جائے گا

کہ خشوع کیا چیز ہے، خشوع کے معنی ہیں دب جانا پست ہوجانا، یعنی سکون جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنَّکَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ.

(یعنی من جملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب) تو زمین کو دیکھ رہا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے)

چونکہ اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (دبی اور ابھری) کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اہتزاز اور ابھرنے میں حرکت ہے تو خاشعۃ کے معنی سکون اور پستی والی کے ہوں گے اور مقابلہ سے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، خود لغت شاہد ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شے کا حرکت وسکون جداگانہ ہوتا ہے اگر کہا جائے کہ ہاتھ چل رہا ہے تو اس کے معنی ہلنے جلنے اور نقل مکانی کے ہوں گے اور اگر کہا جائے کہ فلانے کی طبیعت خوب چلتی ہے تو یہاں یہ معنی نہیں مراد ہوں گے بلکہ یہاں اور معنی ہوں گے یعنی فکر کرنا اور سوچنا۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنئے کہ خداتعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی چیزیں عنایت فرمائی ہیں ظاہر اور باطن یا یوں کہو کہ جوارح اور قلب۔ پس کمال خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ جوارح بھی ساکن رہیں اور قلب بھی لیکن دونوں کا سکون جدا جدا ہے۔ جوارح کا سکون تو یہ ہے کہ ادھر ادھر دیکھے نہیں، ہاتھ پیر نہ ہلائے اور اس کے مقابلات کا نام حرکت ہوگا، تصور کرنا، یعنی سوچنا اور سکون اس کا عدم ہے اور ظاہر ہے کہ فکر کرنا اور سوچنا فعل اختیاری ہے اور قدرت اور اختیار ضدین سے متعلق ہوتا ہے۔ پس جب یہ حرکت اختیاری ہے تو اس کے مقابل سکون بھی یعنی سوچنا اختیار ہوگا اور آدمی اختیاری ہی چیزوں میں مکلف ہوتا ہے لہٰذا خشوع کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے اختیار سے دوسرا خیال نہ لانا یہ نہیں کہ دوسرے خیال کا دل میں نہ آنا، یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ خیال کا آنا تو اختیار نہیں ہے اور خیال کا لانا اختیاری ہے۔

صریح ایمان

پس خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ اپنے اختیار سے دوسرے خیالات دل میں نہ لاوے۔ رہا اگر کوئی خیال بلا اختیار آ دے تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا کہ میرے دل میں ایسے ایسے خیالات آتے

ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا ان سے آسان معلوم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اوجدتموہ قالو انعم قال ذالک صریح الایمان''[۱] یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم نے اس کو پایا ہے' یعنی کیا ایسے خیالات تمہیں آتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو صریح ایمان ہے اور کیوں نہ ہو چور تو وہیں آتا ہے جہاں مال و متاع ہو۔ اسی طرح شیطان وہیں آتا ہے جہاں متاع ایمان ہو۔ مولانا رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

دیو آید سوئے انساں بہر شر　　　پیش تو ناید کہ از دیوے بتر

(شیطان تو انسان کی طرف شر کے لیے آتا ہے تیرے پاس نہ آئے گا کہ شیطان سے بدتر ہے)

شیطان بڑا استاد ہے اپنا وقت فضول ضائع نہیں کرتا جو خود شیطان بن گیا ہے اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا' ہاں جس میں کچھ ایمان باقی ہے اسی کی فکر میں رہتا ہے' اپنی دھن کا پکا ہے' ایمان داروں ہی کے پیچھے پڑا رہتا ہے' ہم لوگوں کو تو اس سے خاص صفت میں سبق حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایک چور نہایت نامی تھا' ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا' آخر ایک مرتبہ سولی دے دی گئی' حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے پیر چوم لیے' لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی استقامت قابل تعریف ہے۔ اگر ہم خدا کی اطاعت میں ایسی استقامت کریں تو ہمارے مدارج کا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے۔ اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے اور وسوسہ اور خیالات کی کچھ پروانہ کرنا چاہیے' بڑے بڑے خیالات جن پر عمل نہ ہو مگر طبیعت منقبض ہو' الجھے' بزرگوں ہی کو آتے ہیں' فاسقوں کو ایسے خیالات نہیں آتے اور ان وساوس سے پریشانی کا باعث یہی ہے کہ کسی طبیب قلب کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو کہہ دیتا کہ اگر وسوسے آتے ہیں تو آنے دو کچھ پروانہ کرو' قلب کی حالت تو شاہی سڑک کی سی ہے کہ اس پر حاکم' رئیس اور ادنیٰ' چمار دونوں گزرتے چلے جاتے ہیں۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　　درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مخلوط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

---

[۱] (مسند احمد ۲: ۳۷۹' کنز العمال: ۱۷۱۵)

وساوس شیطان کا علاج

شیطان کی حالت کتے کی سی ہے' کتا بھونکا کرے اور التفات نہ کیا جائے تو آپ چپ ہوجاتا ہے اور اگر اس کی طرف متوجہ ہوکر اس کو دفع کرنا چاہے تو اور زیادہ غصہ کر کر کے بھونکتا ہے۔ اسی طرح وساوس شیطانی کی طرف التفات ہی نہ کرے کیونکہ شیطان سے جو دبتا ہے اور اس کا خیال رکھتا ہے اس کے سامنے آموجود ہوتا ہے' وسوسے پر جو غمگین ہوگا وہ سخت پریشان ہوگا بلکہ جب وسوسہ آئے تو اور خوش ہونا چاہیے کہ الحمدللہ دولت ایمان موجود ہے اگر آدمی میں قوت توکل اور اعتماد علی اللہ (اللہ پر بھروسہ) کی صفت ہو تو ایک شیطان کیا اگر لاکھ شیطان ہوں تو کچھ نہیں بنا سکتے۔ ہاں قصداً خیال کا لانا بے شک منافی خشوع اور حضور قلب کے ہے۔

خشوع اور حضور قلب اختیاری ہے

اب اس تقریر سے ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ خشوع اور حضور قلب اختیاری ہے اور نہایت آسان ہے لیکن تاہم جب تک طریق نہ معلوم ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاوے کامیابی نہیں ہوسکتی' کپڑا سینا آسان ہے ہر شخص جانتا ہے کہ کیسے کپڑا سیتے ہیں لیکن سینا جب ہی آسکتا ہے کہ کسی درزی سے طریق سیکھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح حضور قلب کا حال ہے۔ اس طریقے کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ مسئلہ عقلی ہے "النفس لاتتوجه الى شيئين في آن واحد" (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا) یعنی پوری توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوا کرتی ہے۔ ایک آن میں اگر دو چیزیں خیال میں ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں یا دو چیزیں نظر آتی ہوں تو توجہ کامل دونوں میں سے کسی کی طرف بھی نہیں جس چیز کو آدمی گھورتا ہے اسی کی طرف دیکھنے میں توجہ ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ طریقہ یہی ہے کہ ایک خیال رکھیں تو دوسرے خیالات خود دفع ہوجائیں گے اور کوئی خیال نہ آئے گا کیونکہ اگر یہ کوشش کی جاوے کہ ایک ایک کر کے خیالات دفع کیے جاویں تو سخت دشواری پیش آئے گی اور دفع ہوجانا ناممکن ہوجائے گا کیونکہ اول تو دیکھی ہوئی چیزیں انسان کی بکثرت ہیں۔ پھر علاوہ اس کے انسانی متفکرہ یا متخیلہ ان کو ترتیب دے کر بے تعداد فرضی صورتیں اختراع کیا کرتی ہے۔ مثلاً آپ نے دوسر

کا آدمی کبھی نہیں دیکھا ہوگا لیکن یہ قوت متفکرہ ایک دھڑ اور دوسر کو جوڑ کر خیالی صورت بنا کر سامنے کھڑا کر دیتی ہے اور انسان کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ دوسر کا آدمی ایسا ہو سکتا ہے۔

خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو

بہر حال ایک ایک خیال کو دفع کرنا بہت دشوار اور بڑی ہی مصیبت ہے کبھی بھول کر بھی خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ کسی نیک چیز کی طرف دھیان لگا دو' اس دھیان کے باندھتے ہی سارے خیالات خود بخود ہٹ جائیں گے۔ بعض سالکین نے ناواقفی کے باعث ہجوم وساوس سے پریشان ہو کر خودکشی کر لی ہے یہ کیوں' اس لیے کہ یا تو ان کو شیخ نہیں ملا یا شیخ کی تعلیم کی قدر نہیں کی۔ شیخ جس پر یہ امور گزرے ہوتے ہیں جانتا ہے اور بتلا سکتا ہے ایسی پریشانی کی حالت کو قبض کہتے ہیں۔ اس میں عبادت میں بھی مزہ نہیں آتا اور جی گھٹتا ہے اور جی گھٹنے کی وجہ یہ۔ ہے کہ لذت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کی عجیب حالت ہے' عبادت بھی ایسی کرنا چاہتے ہیں جس میں حظ نفسانی ملے' عبادت بھی چاہتے ہیں تو مزیدار حالانکہ مزہ مطلوب نہیں ہے بلکہ تعبد مطلوب ہے۔ البتہ مزے سے عبادت سہل ہو جاتی ہے۔ غرض طالب کی یہ حالت ہونا چاہیے:

خوشا وقت شوریدگان غمش　　　اگر ریش بینند و گر مرہمش

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں)

گدایانے از بادشاہی نفور　　　بامیدش اندر گدائی صبور

(ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے)

دمادم شراب الم در کشند　　　اگر تلخ و بینند دم در کشند

(ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)

اگر مرد عشقی کم خویش گیر　　　وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

(اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں آپ کو فنا کر ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر)

مترس از محبت کہ خاکت کند　　　کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

(مت ڈر کہ محبت تجھ کو خاک کر دے گی اس لیے کہ اگر تجھ کو ہلاک کرے گی تو بقائے جاودانی تجھ کو عطا کرے گی)

هرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

(جس کو عشق سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کو لذت قرب علی وجہ الکمال حاصل ہو جاتی ہے اس لیے اس کو مردہ نہ کہنا چاہیے)

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش
برجفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک گر بدام افتد تحمل بایدش

(باغبان کو اگر صحبت گل کی خواہش ہے تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہیے' اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ وزاری مت کر' سمجھدار پرند جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل چاہیے)

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس زبون وسوسہ باشی دلا گر طرب را بازدانی از بلا

(پس برا وسوسہ ہوا اے دل اگر خوشی کو بلا سے جدا جانے

ہمت والوں کا تو یہ قول ہے:

روز ہا گر رفت گورو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے اگر گئے بلا سے' عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے)

تم لذت کی کچھ فکر نہ کرو' کام کیے جاؤ' لذت نہ آئے بلا سے نہ آئے۔

حضور قلب کا طریق کلی طور پر تو معلوم ہو گیا اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی شے ہے جس میں دل لگایا جائے اس کے دو طریق ہیں۔ ایک تو مشہور ہے جو لوگوں نے "ان تعبداللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"[۱] (اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے) سے سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک یہ سمجھنا صحیح نہیں اور اس کا بیان آگے آوے گا۔

نماز میں ذکراللہ کی طرف متوجہ ہونے کی صورت

دوسرا طریق (جو استاد رحمتہ اللہ علیہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتلایا تھا اور الحمدللہ کہ ایک حدیث سے بھی میری سمجھ میں آ گیا اور تجربہ بھی اس کے مفید ہونے پر شاہد ہے) یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس طرح کہ "مقبلاً علیھا بقلبہ" یعنی حال یہ ہو کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے' اب نماز دیکھنا چاہیے کہ نام کس کا ہے' سو اس میں بعضی چیزیں تو مختلف ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے مبتدی کو یکسوئی حاصل ہونا ذرا تکلیف ہے۔ اس لیے دیکھنا چاہیے کہ اس میں ایسی کون سی چیز ہے جو نماز میں برابر ہوتی رہتی ہے سو وہ ذکر اللہ ہے کہ ابتداء سے انتہا تک پایا جاتا ہے۔

تو اب نماز میں متوجہ ہونے کی صورت اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ذکراللہ کی طرف برابر توجہ رہے یعنی جو کچھ پڑھا جاوے سوچ سوچ کر پڑھا جائے۔ پہلے سوچ لو پھر زبان سے نکالو یہ نہیں کہ ریل گاڑی ہے جہاں ڈرائیور نے کل چلائے دی اور گاڑی اڑی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اسٹیشن آ گیا اور ڈرائیور نے روکی تو تھمی۔ اس طرح سے اپنے اندر کی ریل گاڑی کو اگر ہم چلائیں گے تو اڑے گی' اس کا کیا نتیجہ ہوگا کہ سارے قوائے محمودہ کے مسافر پاش پاش ہو جائیں گے اور زمین باطل میں ہلچل پڑ جائے گی۔ دنیاوی ریل کے اڑنے کا حال تو اسی وقت آنکھ سے نظر آ جاتا ہے ہماری اندرونی ریل کے اڑنے کا حال قیامت میں کھلے گا۔

بہر حال چاہیے کہ ہر ہر لفظ سوچ سوچ کر پڑھو۔ اگرچہ اس میں دو چار دن مشقت معلوم ہو گی جی گھبرائے گا کیونکہ جی روکنا پڑے گا لیکن جہاں ہم کو اپنے دنیاوی ذرا ذرا سے

---

[۱] (الصحیح للبخاری ۶ : ۱۴۴ ' کنز العمال : ۵۲۴۹)

کاموں میں مشقت نہیں ملتی تو خدا کو چاہتے ہو کہ بے مشقت ہی مل جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے قربان جائیے کیسے کیسے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اتنے بڑے بڑے دشوار کلام کو آسان کر کے بتلا دیا اور کیوں نہ ہو "**علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی ربی فاحسن تادیبی**"[1] (اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تعلیم دی پس بہترین ہے میری تعلیم اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ادب سکھایا پس بہترین ہے میری تادیب)

یہ خدا کی تعلیم ہے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اگر چہ ایک اللہ کے بندے (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے)

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے مجھے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں)

حدیث میں حقیقت احسان کا بیان

اس کے علاوہ ایک مشہور طریق حضور قلب کا وہ ہے جو حدیث "ان تعبدالله كانك تراه" سے لوگوں نے سمجھا ہے یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پس گویا دو طریق متقابل ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں اول تو لفظوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ سوال حقیقت احسان سے ہے نہ طریق تحصیل احسان سے ہے۔ چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت بتلائی ہے نہ کہ طریق۔ چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی سے سوال و جواب کا ہونا اس کا اور بھی موید ہے۔ دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصور رویت حق حضور قلب کے لیے عموماً اور خصوصاً مبتدی کے لیے بالکل ناکافی ہے کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا دفع کرتا ہے اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے۔ البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسر ہو جاتا ہے اور طریقہ عام ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر

[1] (كشف الخفاء للعجلونی ۱: ۷۲، کنز العمال: ۳۱۸۹۵)

مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان) سے طریق ہی قرار دیا جاوے تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا کیونکہ ''کانک تراہ'' کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہوتو بے شک وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ سو یہ مضمون جملہ اولیٰ کے ساتھ جمع ہو رہا ہے یہ نہیں کہا کہ اگر تم ایسی عبادت نہ کرسکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ بہر حال یہ طریق الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے۔ پس اس حدیث میں حقیقت احسان کا بیان ہے' طریق مذکور نہیں۔ رہا حدیث کے معنی کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اسوقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا اور احتیاط رکھے گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے اور اگر کہیں خود حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے' اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے کام کو خوب اچھی طرح انجام دے گا۔ چنانچہ طالب علموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ استاد کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو ظرافت اور ہنسی کی باتوں میں بھی باک نہیں ہوتا' دل کھول کر ایک دوسرے سے بولتے ہیں' کہیں پیر پھیلائے ہیں' کہیں کوئی شعر پڑھ رہے ہیں اور جہاں کسی نے دیکھ لیا کہ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں فوراً مؤدب ہو کر بیٹھ گئے اور خاموشی اختیار کر لی اور کہیں اپنی نظر استاد پر پڑ گئی تب تو ادب کا ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ خدا کی ایسے حسن وخوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو اس وقت تمہاری عبادت کس طرح کی ہوتی' اب بھی اسی حالت کے مشابہ تمہاری عبادت ہونا چاہیے) اس لیے کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہوتو کیا ہوا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے (یہ اس لیے بڑھایا کہ پہلے جملے سے یہ سوال ہوسکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے' اس کا جواب اس سے مفہوم ہو گیا کہ دیکھنے والے کی تحسین کے لیے حق تعالیٰ کی رویت کا تعلق بھی کافی ہے) غرض ''فان لم تکن تراہ'' (پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے) میں فائے تعقیب نہ لی جائے بلکہ فائے علت قرار دی جائے' یہاں تک تو آپ کو خشوع کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ طریقہ سے بھی واقفیت حاصل ہو چکی۔

خشوع مستحب اور خشوع واجب

اب خاتمہ کے طور پر ایک امر اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس خشوع کے پیدا کرنے کا وقت کون سا ہے' آیا ہر وقت خشوع ہی کے اہتمام میں رہیں یا اس کا کوئی خاص وقت ہے تو اب سنئے کہ ایک خشوع تو مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے۔ مستحب تو یہ ہے کہ ہر وقت یہی حالت استحضار کی قلب پر غالب رہے لیکن یہ ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ صرف اسی کو جائز ہے جس کی ایسی حالت نہ ہو کہ نہ تو خود اس کی ضروریات میں مخل ہو نہ کسی دوسرے کی حق تلفی کا باعث ہو ورنہ تباہی کی نوبت آ جائے گی۔ مستحب کے لیے واجبات ترک ہونے لگیں گے' بجائے ثواب کے الٹا وبال ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کسی کی بی بی آٹے کے لیے پیسے دے کہ آٹا لے آؤ' بچے بھوکے ہو رہے ہیں اور وہ لگے رہیں خشوع حاصل میں جس کی وجہ سے بچے بھوکے مریں' تو ایسا خشوع موجب قرب نہیں ہو سکتا' خدا سے دوری کا باعث ہوگا۔ حکایت ہے کہ ایک ولایتی صاحب کسی مسجد میں ٹھہرے تھے۔ جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ایک مسافر جو وہاں سو رہا تھا' خراٹے لے رہا ہے' آپ نے اس کو کئی دفعہ تو اٹھا اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا کہ تم کس طرح سوتے ہو ہمارے خشوع میں خلل پڑتا ہے' وہ بے چارہ تھکا ہوا تھا پھر سو گیا' آپ کو جو غصہ آیا نکال چھرا اس کا کام تمام کر دیا' اچھا خشوع حاصل کیا کہ بے چارے کی جان ہی لے ڈالی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنی بی بی بچوں کو تباہ کر رکھا ہے اور غلطی میں مبتلا ہیں۔ دائمی حضور قلب اور خشوع کے پیچھے حق تلفیاں کرتے ہیں۔ یہ امر نہایت نازیبا ہے یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی کہ کسی نے نوکر سے کہا کہ ہم بھوکے ہیں' کھانا لاؤ' وہ بجائے کھانے کے دوڑ کر برف سے ٹھنڈا کر کے پانی لے آیا اور اسی پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں جناب پانی ہی پیجئے بہت ٹھنڈا ہے' کھانا نہ کھائیے تو ایسے نوکر سے مالک خوش ہوگا یا ناراض۔ جیسے ایک اور صاحب کا نوکر تھا اس سے مانگا خلال وہ اٹھا لایا بانس' مانگا لحاف وہ اٹھا لایا گھوڑے کا چارجامہ اور اصرار کرتا ہے کہ لو اسی کو اوڑھ لو' یہ گستاخی ہے یا نہیں' یہ ساری خرابیاں خود رائی کی ہیں' خود رائی بھی بڑی مضر شے ہے۔

فکر خود و رائے خود درعالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اسی طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

مناسب تو یہ ہے کہ ایسا ہو جائے:

چوں قلم در پنجہ تقلیب رب

(یہاں تو جو حکم ہوُہ ہی کرو یہی کمال ہے) مثلاً اگر کسی کو پاخانہ زور سے لگا ہوا اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو برا ہے۔ چاہیے کہ پہلے فارغ ہو جائے پھر نماز پڑھے۔ اگر کوئی اصرار کرے اور کہنے لگے کہ صاحب نماز پڑھنا تو عبادت ہے اور پیشاب پاخانہ تو نجاست کا کام ہے میں تو نماز ہی پڑھوں گا تو وہ بیجا کرتا ہے اس طرح نماز کا بھی ستیاناس کرے گا۔

خلاصہ یہ کہ اس مرتبہ خشوع کا اہتمام اس کے لیے ہے جس سے اس کے باعث نہ تو کسی کا حق تلف ہو نہ دین کا ضرر ہو اور نہ کسی کو دنیا کا ضرر پہنچے۔ دین کے ضرر کی صورت یہ ہے کہ کوئی طالب علم ہے کہ رات کو تو خشوع پیدا کرتا رہے مطالعہ دیکھا نہیں صبح کو جب سبق پڑھنے بیٹھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر بے دلی سے پڑھ پڑھ کر کتابیں تمام کیں نہ کچھ آیا نہ گیا۔ علم دین ایسی ضروری چیز سے محروم رہے بلکہ ناقص سے لوگوں کا مقتدا بن کر تباہ کرنا شروع کیا۔ دنیا کا ضرر یہ کہ بال بچے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی ہونے لگی۔ اسی طرح ترک اسباب ظاہری اگرچہ مستحب ہے لیکن اسی کے لیے جس کی وجہ سے اہل و عیال کے حقوق کے ادا کرنے میں کمی نہ ہونے پائے ورنہ نہیں لیکن ہاں جسے کسی کی فکر نہ ہو اور وہ بھی اس مرتبہ کی تحصیل سے غافل ہے تو بڑا ظالم ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارے میں ہے:

ہر آن کو غافل از حق یکزمان است
دراں دم کافر است اما نہان است

(جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں کافر ہے لیکن نہاں ہے)

حضوری گرہمی خواہی از و غافل مشو حافظ
متی ماتلق .... دع الدنیا و اھملھا

(اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو بلکہ اس کی طرف متوجہ رہو اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو یعنی اس کی عبادت میں مشغول ہو تو دنیا اور مافیہا کی طرف التفات مت کرو)

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرہ یاری گیرند

(میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں)

جملہ اوراق و کتب در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام اوراق و کتابیں آگ میں جلا دو اور سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن کرو)

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا
تو زغنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بچمن درا

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کو پھاڑ کر تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرو)

آسمانہا ست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہاست کوہہائے بلند و صحرا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان جو آسمان دنیا میں کارفرما ہیں، روح کی راہ میں نشیب و فراز اور بلند پہاڑ و صحرا ہیں)

بردل سالک ہزاروں غم بود گرز باغ دل خلا لے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے)

بہتیرے لوگ ہیں کہ ان کو خدا نے اطمینان دیا ہے، جائیداد کی آمدنی چلی آرہی ہے، گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں پڑتا، پھر بھی دن رات فضول مضمون میں مبتلا رہتے ہیں، کہیں یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جاپان اور روس میں لڑائی ہو رہی ہے کہیں جاپان کو ڈگری دلا رہے ہیں، کہیں روس کو فکر پڑی ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ گویا ان کے سامنے روس و جاپان کا مقدمہ پیش ہوگا اور فیصلہ کی ان سے درخواست کی جائے گی۔

دن رات ایسی ہی لایعنی باتوں میں مصروف ہیں، یہ اطمینان رکھیں ان کے پاس یہ مقدمہ نہیں پیش ہونے کا، ہاں اپنے اندر کے روس و جاپان کی فکر کریں۔ اس کی بے شک ان سے باز پرس ہوگی کہ تم نے قوتوں کو جا سے صرف کیا ہے یا بے جا؟

ایسے شخص کو تو چاہیے تھا کہ حب الٰہی میں غرق ہو کر ان مقربین میں سے ہو جاتا جن کے ساتھ خصوصیت کے معاملات ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ تھے انہوں نے پاؤں پھیلا دیئے تھے ان پر عتاب ہوا۔

مقربوں کے احکام ہی دوسرے ہو جاتے ہیں جو باتیں عام لوگوں کو جائز ہوتی ہیں ان کے لیے بے ادبی میں داخل ہیں۔

مقرباں را بیش بود حیرانی

(مقربین کے لیے حیرانی بہت ہوتی ہے)

اور گو اس میں مشقت شدید ہے لیکن قرب کے ساتھ اگر مشقت بھی اٹھانا پڑے تو کیا۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

(جس جگہ محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ گہرا کنواں کیوں ہو)

چہ خوش وقتے و خرم روز گارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

حاصل یہ کہ ایک تو وہ تھا جو فارغ محض تھا اور ایک وہ ہے جس کے متعلق اور بھی خدمتیں ہیں۔ اہل وعیال کا نان ونفقہ واجب ہے درس وتدریس میں مشغول ہے وعظ ونصیحت سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے اس کی طرف لوگوں کی حاجت ہے ایسے شخص کو ایسا اہتمام خشوع کہ ہر وقت اسی میں رہے ناجائز ہے۔ اس کے ذمے خشوع واجب حاصل کرنا ہے اس پر واجب ہے کہ عبادت کے وقت خشوع خاص پیدا کرے کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ جب تک کسی عبادت میں مشغول ہے دنیا کا کوئی کام تو کر ہی نہیں سکتا۔ پھر فائدہ کیا ہوا کہ اس نے اپنا وقت مفت پریشان کیا۔ اس لیے یہ مرتبہ ہر شخص پر واجب ہے اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کیا ہی انتظام ہے کہ نہ ہر شخص کو صوفی مستغرق بنادیا اور نہ غفلت کی اجازت عنایت ہوئی۔

خلاصہ وعظ

سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تو مقدمہ بیان ہوا جس میں عوام وخواص سب ہی کی شکایت تھی کہ خشوع کیوں حاصل نہیں کرتے' اس کے بعد مقصود کا بیان ہوا' وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اول حقیقت' دوسرے فرضیت خشوع' تیسرے طریق خشوع' اس کے بعد خاتمہ مذکورہ ہوا جس میں درجات خشوع کا ذکر ہوا۔

اب خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ توفیق عنایت فرمائے خشوع سے بہرہ ور اور کامیاب بنائے۔ (آمین ثم امین)

رجاء الغیوب

المعروف

صبح اُمید

امید کے صحیح معنی کے متعلق

کاٹھہ ضلع میرٹھ شیخ محمد حسن صاحب کے زنانہ مکان پر ۳ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ بوقت صبح ۲ گھنٹے ۳۵ منٹ کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا

حضرت حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رحمہ اللہ (مقیم میرٹھ محلہ کرم علی) نے قلمبند فرمایا

سامعین میں مردوں کی تعداد ۴۰ باقی مستورات تھیں۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اما بعد. فَقَدْقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی. اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ.

ترجمہ: جولوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی تاکہ ان کو ان کے اجرتیں پوری دیں اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے۔ (سورۃ الفاطر۔۳۰)

مضمون آیت کی اہمیت

اس آیت میں حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ[1] نے بندوں کی ایک بڑی غلطی کو بیان فرمایا ہے اس میں ابتلاء عام ہے۔ عوام تو کیا پڑھے لکھے بھی اس میں مبتلا ہیں یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس وقت یہی آیت ذہن میں آئی۔ اس میں نہایت ضروری مضمون ہے یوں

---

[1] (جن کی شان اونچی اور جن کے احسانات سب پر عام ہیں)

تو دینی مضامین سب ہی ضروری ہیں لیکن ضرورت' ضرورت میں فرق ہوتا ہے۔ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کی طرف سے ذہول[1] ہے ان کے یاد دلانے کی خاص ضرورت ہوتی ہے لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری وہ مضامین ہیں جن میں غلطی بھی واقع ہو۔ چنانچہ یہ مضمون اسی قبیل[2] سے ہے۔ اس واسطے بہت زیادہ ضروری ہوا۔

میں پہلے اس غلطی کو بیان کروں گا اس کے بعد طریق تصحیح کی تعیین کروں گا' پھر اس طریق کی تحصیل[3] کا طریقہ بتاؤں گا اور سب اجمالاً اس آیت کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا۔ حاصل ترجمہ کا یہ ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پڑھتے ہیں اور نماز درست رکھتے ہیں اور مال کو ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ان کو ایک تجارت کی امید ہے جو کبھی خسارہ نہ دے گی۔ تجارت سے مراد ظاہر ہے کہ تجارت آخرت ہے۔ آگے اس کے نتیجہ کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ ان کو ان کے اجر پورے پورے دیں گے بلکہ اپنی طرف سے اور زیادہ دیں گے کیونکہ حق تعالیٰ غفور اور شکور ہیں۔

لِيُوَفِّيَهُمْ میں لام عاقبت ہے جیسے مشہور مثال ہے "سَرَقَ لِيَقْطَعَ" یعنی فلاں نے چوری کی تا کہ ہاتھ کاٹا جائے۔ یہ معنی نہیں کہ اس غرض سے چوری کی بلکہ لام عاقبت ہے یعنی چوری کا انجام قطع ہے اسی طرح اجور کا پورا پورا ملنا اور نفع زائد ہونا' یہ انجام ہے اس تجارت کا خواہ اس تجارت میں اس انجام کا قصد بھی نہ ہو البتہ خود تجارت کا قصد ضرور شرط ہے' خواہ من حیث التجارۃ نہ ہو من حیث العمل ہی ہو۔ یہ حاصل ترجمہ ہے اس آیت کا اس کو سن کر معلوم ہو گیا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک تجارت کی امید کا طریقہ بتلایا ہے یعنی تجارت آخرت کے نفع کی امید کا طریقہ بتلایا ہے کہ کب امید رکھنا چاہیے۔

آخرت کی کامیابی کی امید کب رکھنی چاہیے

آیت سے صاف نکلتا ہے کہ اس امید کا مستحق وہ شخص ہے جو کہ ان اعمال مذکورہ کو ادا کرے کہ تلاوت کتاب اللہ کرے یعنی کتاب اللہ پڑھے۔ پڑھنا صرف الفاظ کے ادا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ معنی یہ ہیں کہ الفاظ ادا کرنے کے ساتھ کتاب اللہ کا علم بھی حاصل کرے جیسے محاورات میں کہتے ہیں کہ ہم نے قانون پڑھا ہے اس کے معنی یہ کوئی نہیں سمجھتا

---

[1] غفلت [2] قسم [3] حاصل کرنے کا

کہ قانون کے الفاظ زبان سے ادا کیے ہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے قانون کا علم حاصل کیا ہے۔ اسی طرح قرآن بھی چونکہ قانونی کتاب ہے اور قانون بھی قانون الٰہی تو اس کے پڑھنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کا علم حاصل کیا جائے۔ محض الفاظ کا ادا کرنا مراد نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے الفاظ کا ادا کرنا موجب ثواب نہیں۔ گو عقل کا یہی فتویٰ تھا کہ تلاوت قرآن پر بدوں علم وفہم[1] کے ثواب نہ ہوتا کیونکہ قانونی کتاب کے الفاظ یاد کر لینا عرفاً و عقلاً مقصود نہیں بلکہ اس کا سمجھنا اور اس کے موافق عمل کرنا مقصود ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس فتویٔ عقلی کے خلاف محض تلاوت الفاظ پر بھی ثواب رکھا ہے اور یہ ان کی رحمت و عنایت ہے مگر بقرینۂ سیاق وسباق[2] یہاں صرف تلاوت مراد نہیں ہے بلکہ علم کتاب مراد ہے۔

قرینہ[3] یہ ہے کہ یہاں تلاوت کے ساتھ اعمال کا بھی ذکر ہے اور عمل کا ترتب علم ہی پر ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں تلاوت سے مراد علم کتاب ہے جیسا ابھی مذکور ہوا کہ علم عمل ہی پر مرتب ہوا کرتا ہے۔ محض تلاوت پر مرتب نہیں ہوتا۔ چنانچہ آگے عمل ہی کا ذکر ہے یعنی ''اور نماز کی پابندی کرے'' مراد جملہ عبادات جسمانی ہیں جن میں نماز زیادہ مہتم بالشان ہے۔ تخصیص ذکر بوجہ اہتمام کے ہے حصر مراد نہیں[4] ''اور مال خرچ کرے'' اس میں جملہ عبادات مالیہ آ گئیں اور جن لوگوں نے اس کی تفسیر زکوٰۃ سے کی ہے ان کی مراد زکوٰۃ کا مہتم بالشان ہونا جیسا کہ اوپر ذکر صلوٰۃ کا منشا بھی مہتم بالشان ہونا ہے ایسے شخص کو امید رکھنی چاہیے ایک تجارت کی جو کبھی خسارہ نہیں دے گی اور اس پر پورا پورا اجر ملے گا مع انعام کے۔ ترجمہ سے آیت کا ماحصل سمجھ آ گیا ہوگا اور تھوڑے غور سے اس غلطی کا بھی علم ہو گیا ہوگا جس میں آج کل عام ابتلاء ہے۔

امید کے معنی میں ایک غلطی

حاصل اس غلطی کا یہ ہے کہ آپ نے عام طور سے ہر شخص کی زبانی یہ کلمہ سنا ہوگا اور یہ بات فی نفسہٖ صحیح بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا چاہیے یہ امر عقائد میں داخل ہے اور امید نہ رکھنے والا کافر ہے مگر اس کو سمجھنے میں مسلمانوں نے اتنی بڑی غلطی کر رکھی ہے کہ اس کے نتیجہ کو

---

[1] سمجھ [2] آگے پیچھے کی علامت سے [3] علامت [4] نماز کو خاص طور سے ذکر کیا گیا کیونکہ نماز اہم عبادت ہے مگر صرف نماز مراد نہیں بلکہ ساری جسمانی عبادات مراد ہیں

دیکھ کر میں تو یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کا بیڑا ہو گیا ہے۔ اس مضمون کا غلط مطلب ذہن میں آنے سے ایک دلیری ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کو نہ فسق[1] کی پرواہ ہی نہ رشوت سے احتراز رہا، نہ ظلم سے باک[2] رہا۔ اول تو ان اعمال پر تنبہ[3] ہی نہیں، لوگ یہی نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی برا کام کر رہے ہیں اور اگر تنبہ بھی ہوا تو کچھ پرواہ ہی نہیں۔ سب کام کرتے ہیں اور جو کبھی گناہ کا خیال آ گیا یا کسی خیر خواہ نے ٹوک دیا تو جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔ میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا تم کو کہاں سے معلوم ہوا۔ یقیناً یہی کہا جائے گا کہ قرآن سے۔ میں کہوں گا کہ جس آیت قرآن سے اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا ثابت ہے اس میں کوئی قید بھی ہے یا نہیں کہ کس کے واسطے غفور رحیم ہیں۔ اگر اس میں عموم کلی ہے تو بس کفار بھی سہل چھوٹے، وہ بھی کفر وغیرہ جو چاہیں کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ مسلمان اس کے جواب میں ضرور یہی کہے گا کہ کفار کے لیے غفور رحیم نہیں۔ دیکھئے اتنی قید تو لگی یہ قید بھی قرآن ہی سے لگی میں کہتا ہوں اور بھی قیدیں ہیں مطلق گنہگاروں کے لیے یہ بشارت درجہ مزعومہ[4] میں نہیں ورنہ اعمال کی تو اساس ہی منہدم[5] ہو جائے۔

امید کے صحیح طریق کی عقلی دلیل

نیز کوئی موقع مجھے دکھلایا بھی تو جائے جہاں مؤمنین کے لیے بلا کسی قید کے اس کا حکم ہے اس کے طول[6] کا موقع نہیں سب لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں جس آیت میں یہ لفظ غفور رحیم پاویں اس کے سیاق وسباق کو پورا دیکھیں۔ اگر معنی نہ سمجھتے ہوں تو ترجمہ کو دیکھیں، ان کو کچھ قیود ضرور ملیں گی۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ غلطی صرف شرعی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے۔ قرآن کی قیود سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو ذرا سے تامل وغور[7] سے عقلاً یہ غلطی رفع ہو سکتی ہے۔

چنانچہ دیکھئے سب جانتے ہیں کہ ملازمت سے پہلے امیدواری کی ضرورت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ امیدواری میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ امید کا اعتقاد جما کر بیٹھ جائیں بلکہ امیدواری کا کام کرتے ہیں اور اتنا ہی وقت صرف کرتے ہیں جتنا ملازم صرف کرتا ہے اور نخرے اس سے زیادہ اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس کا عرصہ بعد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملازمت ملتی ہے، پھر اس

---

[1] گناہ [2] ڈر [3] کی طرف توجہ [4] اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی لوگ سمجھتے ہیں [5] بنیاد ہی ختم ہو جائے
[6] لمبی بات [7] غور وفکر

ملازمت پر اجر ملنا متوقع ہوتا ہے گویا امیدواری ملنے کے لیے بھی کچھ خدمت کی ضرورت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ امیدوار اجر بننے کے لیے کچھ قواعد کی ضرورت اور کوشش درکار ہے۔ نری امید جس کو تمنا کہتے ہیں کسی شمار میں نہیں' اگر کوئی اس تمنا میں رہے کہ گورنمنٹ مجھ کو ایک عہدہ دے دے اور باضابطہ امیدواری یا کوشش نہ کرے تو خود سمجھ لیجئے کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔

افسوس ہے کہ انسانی گورنمنٹ سے امید رکھنے کے لیے تو کچھ قواعد اور شرائط اور پابندیوں کی اور جان کا ہی کی ضرورت ہو جس کا نہ حق اتنا عظیم ہے نہ اس سے اتنا عظیم اجر ملے گا اور احکم الحاکمین سے امید رکھنے کے لیے کسی قاعدہ اور شرط کی ضرورت نہ ہو اور نہ کسی قسم کی جان کا ہی[1] اور محنت کی قید ہو جس کا حق بھی عظیم اور اس سے اجر بھی عظیم ملے گا۔ اس بات میں ایسی بے حسی بلکہ فساد حس ہوا ہے کہ جب کسی سے کہا جائے کہ امیدوار بننے کے لیے بھی کچھ قواعد ہیں اور کچھ محنت کی ضرورت ہے تو کہتے ہیں واہ صاحب! جب محنت کر کے کچھ حاصل ہوا تو بخشش کیا ہوئی مگر افسوس ہے کہ دنیا کے کاموں میں امیدواری کے یہ معنی کسی نے بھی نہ سمجھے۔ دیکھئے ہم امیدواروں سے پوچھتے ہیں کہ آج کل آپ کس شغل میں ہیں تو وہ بہت قدر شناسی کے ساتھ کہتے ہیں میں امیدوار ہو گیا فلاں فلاں صاحب نے بڑی مہربانی اور کوشش کی اور مجھ کو امیدواروں میں داخل کر دیا۔ اگرچہ یہ امیدواری بہت ہی معمولی ہو اور اس کے بعد کوئی ڈپٹی کلکٹری نہ ہی ملے مگر پھر بھی ان کوشش کرنے والوں کے اور گورنمنٹ کے بڑے ممنون ہوتے ہیں' کہتے ہیں بڑی مہربان گورنمنٹ ہے سب کی سن لیتی ہے حالانکہ ابھی ہزاروں نخرے اٹھائیں گے' کام سیکھیں گے' بہت سی ذمہ داریاں مول لیں گے' ان سب کے بعد اگر ملازمت پر پہنچ گئے تو خیر ورنہ کوئی غلطی ہو گئی یا عمر زیادہ ہو گئی یا اور کوئی مانع پیش آ گیا تو چلئے رخصت' ایک بندے کی ملازمت کی امید میں اتنے بکھیڑے کرنے پڑتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ایسے سستے ہیں کہ ان سے امید لگانے کے لیے کسی قاعدہ کی ضرورت نہیں۔

جس درجہ کا مقصود ہو ویسی ہی کوشش ہونی چاہیے

عجیب بات ہے عقل تو کہتی ہے کہ جس درجہ کا مقصود ہو ویسی ہی کوشش ہونی چاہیے۔ نائب تحصیلداری کے لیے جس کوشش کی ضرورت ہے صدر اعلیٰ ہونے کے لیے اسی نسبت

---

[1] جان مارنے

سے زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ مزدور دو آنہ کمانا چاہے تو چار پیسہ سے دو چند محنت کرنا پڑے گی، معلوم ہوا کہ عمل کی کمی زیادتی، مقصود کی کمی زیادتی کے اندازہ پر ہوا کرتی ہے کوئی ٹھیکہ لیتا ہے تو کام زیادہ اور جلد ہونے کی غرض سے وقت مقرر سے زیادہ خارج وقت میں بھی کام کرتا ہے اس کی بھی بنا[1] وہی ہے کہ جتنا اجر زیادہ چاہیے کام بھی زیادہ کرنا چاہیے۔ اب دنیاوی اجر اور اخروی اجر کو ملا کر دیکھئے جو فرق دونوں میں ہو وہی دونوں کی کوشش میں ہونا چاہیے۔

سو دونوں میں ظاہر ہے کہ مقدار کا بھی فرق ہے اور باقی اور فانی ہونے کا بھی فرق ہے جس کے لحاظ سے دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی پھر دونوں کی طلب میں بھی یہی نسبت ہونی چاہیے بس اس قیاس پر عقل کا مقتضا[2] تو یہ ہے کہ امید آخرت کے لیے عمر بھر کی سعی[3] بھی کافی نہ ہو مگر کیا کیجئے کہ نفس کی تعلیم کے ساتھ ہم نے عقلیات کی بحث کرنا ہی چھوڑ دی۔ البتہ سارے سبقوں میں ایک امید کا سبق یاد کر لیا۔

ایک ڈپٹی اور درویش کی حکایت

ایک ڈپٹی کلکٹر نے ایک درویش سے کہا کہ وصول الی اللہ کا کوئی سہل طریقہ بتا دیجئے۔ درویش نے دوسری باتوں میں لگا لیا کہ گھر میں خیریت ہے، بال بچے اچھے ہیں، آج کل آپ کی کیا تنخواہ ہے، کیسے گزرتی ہے، مقدمات کی کیا حالت ہے؟ غرض ادھر ادھر کی باتوں میں ان کو لگا کر اور بات ٹال کر پوچھا کہ کیوں ڈپٹی صاحب اول آپ کی کتنی تنخواہ ہوئی تھی اور اس تنخواہ سے پہلے کیا کیا کوشش کی تھی پھر کیونکر ترقی ہوئی اور اب آپ کا کیا درجہ ہے؟ ڈپٹی صاحب نے بڑی رغبت اور شوق سے سارا کچا چٹھا کہہ سنایا اور اپنی کارگزاریاں ظاہر کیں اور کہا کہ سب سے پہلے کم درجہ کی تنخواہ ہوئی تھی اور درجہ سوئم کے اختیارات تھے۔ پھر فلاں فلاں کوششوں سے تنخواہ میں ترقی ہوئی، اختیارات میں بھی اضافہ ہوا، فلاں فلاں کار گزاری سے بہت نیک نامی ہوئی اور درجہ اول کے اختیارات حاصل ہوئے۔ اب پچپن سال میں یہ پنشن ہوئی ہے۔ درویش نے کہا کہ قاعدہ یہ ہے کہ ادنیٰ سے ترقی کر کے اعلیٰ کی طلب ہوتی ہے اب آپ کو خدا طلبی کا جو خیال ہوا تو اسی وجہ سے ہوا ہوگا کہ خدا طلبی کو ڈپٹی کلکٹری

---

[1] بنیاد [2] تقاضا [3] کوشش

سے اعلیٰ سمجھا ہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا جی ہاں خدا طلبی سے اعلیٰ اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ درویش نے کہا کہ ڈپٹی صاحب آپ ڈپٹی کلکٹری پر تو جس کو آپ خدا طلبی سے ادنیٰ تسلیم کرتے ہیں اتنی طویل مدت میں پہنچے حیا نہیں آئی کہ خدا طلبی میں سہولت اور عجلت ڈھونڈتے ہیں، دیکھئے کیسا اچھا جواب ہے اور واقعی اور سچی تحقیق ہے ہمارے حاجی صاحب کا مصرع ہے ع

متاع جان جاناں، جان دینے پر بھی سستی ہے

واقعی غور کر کے دیکھیں تو اس مصرع میں مبالغہ ذرا بھی نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ کی قیمت جان ہوسکتی ہے؟ جان ہے کیا چیز مگر بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کچھ نخرے نہیں کیے جاتے ہیں اور ادنیٰ سے طالب کی سعی بھی ضائع نہیں فرماتے بلکہ یوں کہیے کہ بلا سعی مل جاتے ہیں اس واسطے ہم کو قدر نہیں رہی جیسے آفتاب کی روشنی کہ دن بھر ہمارے اوپر خود بخود پڑتی رہتی ہے، ہمیں اس کی خوشامدیں نہیں کرنا پڑتیں اس واسطے ہم کو اس کی ذرا بھی قدر نہیں بلکہ بعض دفعہ اس سے بھاگتے ہیں۔ آفتاب کی قدر جب معلوم ہوتی کہ دنیا میں اندھیرا ہوتا پھر ایک دفعہ آفتاب بطور تماشا کے نکال دیا جاتا تو یہ حالت ہوتی کہ دنیا کی نظریں اسی طرف رہتیں اور لوگ اس کے عاشق ہو جاتے۔

اب بھی دیکھ لیجئے اگر ہفتہ بھر ابر رہتا ہے تو لوگ سورج کے دیکھنے کو ترس جاتے ہیں اور تمنائیں کرتے ہیں اور ذرا سا بھی کھل گیا کہتے ہیں شکر ہے آج کرن تو دیکھ پڑی۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اپنے انوار اور عطایا کو ایسا عام کیا ہے کہ لوگوں کو اس کی قدر نہیں رہی۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا   زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے سستی کے مارے تو نے مجھے ہلکا سمجھا ہے جبھی تو نے مجھے بہت سستا خرید لیا ہے)

حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدرت اس وقت ہوتی ہے جبکہ ایک ذرا سی نعمت کو روک دیں۔ یہی ابر ہے کہ برستا ہے اور لوگ اس سے بھاگتے ہیں اور جب ابر کو روک دیتے ہیں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا پڑتا ہے اور ایک قطرہ پانی کا کہیں سے بھی نہیں آسکتا جبکہ خدا تعالیٰ کی ایسی نعمتیں بے بہا اور بے بدل ہیں اور یہ نعمتیں وہ ہیں جو دنیوی کہلاتی ہیں جن کو فرمایا "مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ"[1] (دنیا کا تمتع چند روزہ ہے) سو جو نعمتیں حق تعالیٰ کی اعلیٰ درجہ کی

---

[1] سورۃ النساء ۷۷

ہیں اوراس سے میری مراد بہشتی نعمتیں ہیں بلکہ وہ نعمتیں مراد ہیں جو دنیا ہی میں موجود ہیں اور بہشت تو ان کی ایک صورت ہے جو ایک خاص وقت میں ظاہر ہو جائے گی وہ نعمت معرفت حق[1] اور قرب حق اور رضائے حق ہے جس کو خود فرمایا ہے: ''وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ''[2] (اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑی چیز ہے) جس کے واسطے مختصر لفظ وصول الی اللہ یا خدا شناسی[3] سو یہ نعمت جبکہ دنیا و مافیہا[4] سے بھی بڑھ کر ہے تو جتنی محنت کہ تمام دنیا کی طلب میں ہو اس سے زیادہ اس کے لیے ہونی چاہیے اور ڈپٹی کلکٹری تو بیچاری دنیا کی ایک ذرا سی فرد ہے اس کے لیے اتنی محنتیں اور امیدواریاں کی گئیں تو خدا طلبی کے لیے کتنی چاہیں ذرا تو انصاف چاہیے جس طرح ڈپٹی کلکٹر کی امیدواری کی گئی تھی اسی طرح یہاں کیوں نہیں ہوتی ۔ میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ڈپٹی کلکٹری کی طلب بلکہ دنیا کی طلب اور خدا تعالیٰ کی طلب میں تو کوئی نسبت اور کوئی توازن ہی نہیں اس کو اس کے ساتھ ذکر کرنا ہی بیجا سا ہے۔

مقتضائے عقل[5] تو یہ تھا کہ اس تفاوت[6] کے ہوتے ہوئے خدارسی[7] امیدواروں سے کبھی بھی حاصل نہ ہو سکے مگر خیر حق تعالیٰ نے اپنی رسائی[8] کو ایسا آسان کر دیا کہ ہم حق تعالیٰ کی رسائی کو اور دنیا کے حصول کو کسی درجہ میں قیاس تو کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں امیدواری کی ضرورت ہے ویسے وہاں بھی ضرورت ہے گو دونوں امیدواروں میں مشاکلت صوری[9] ہی ہے مگر اتنا تو سمجھ آ گیا کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے باقی کام بنانا حق تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن کم سے کم وہ صورت تو امیدواری کی ہونا چاہیے جو دنیا کی طلب کے لیے یہاں اس صورت کو کیوں بدل دیا مگر دنیا کے معاملہ میں تو یہ صورت سب کو یاد ہے اور حق تعالیٰ کے معاملہ میں صرف یہ یاد رہ گیا ہے کہ امید رکھنا چاہیے۔

طفیلی شاعر کی حکایت

کسی نے طفیلی شاعر سے پوچھا جس کو کھانے کا بہت شوق تھا کہ احکام قرآن میں سے تمہیں سب سے زیادہ کیا حکم پسند ہے؟ اور دعاؤں میں کونسی دعا؟ کہا مجھے احکام میں تو

---

۱ اللہ تعالیٰ کی معرفت یعنی پہچان اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا ۲ سورۃ التوبہ ۷۲ ۳ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور خدا تعالیٰ کو پہچاننا ہے ۴ دنیا اور دنیا کی سب چیزیں ۵ عقل کا تقاضا ۶ فرق ۷ خدا تک پہنچنا ۸ اپنے تک پہنچنے کو ۹ ظاہری طور پر ایک جیسی

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا"[1] پسند ہے اور دعاؤں میں سے "رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ"[2] (اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے۔ یہی حالت ہماری ہے کہ تمام تعلیمات قرآن میں سے امید کی تعلیم پسند آ گئی مگر اس اختراع[3] سے ہمارا کیا ہوتا ہے اس سے احکام الٰہی کی حقیقت تو نہیں بدل سکتی جب حقائق منکشف ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ کن غلطیوں میں عمر گزر گئی جس وقت ایک گناہ پر بھی جواب طلب کیا جائے گا کہ یہ کیوں کیا تو یہ جواب کہ آپ سے رحمت کی امید تھی کسی چھوٹے سے گناہ کے لیے بھی کافی نہ ہوگا۔

صاحبو! کیا ضرورت ہے کہ اس ناکافی جواب کی نوبت آوے۔ دارالاعمال ہی میں اس غلطی کو کیوں نہ رفع کر لیجئے یہ تو لفظ امید کے استعمال میں غلطی کا بیان ہوا۔

بعض دیندار حضرات کی ایک غلطی

ایک غلطی میں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو امید کے موقع کو جانتے ہیں اعمال صالحہ کرتے ہیں اور معاصی سے بھی بچتے ہیں۔ مطلب یہ کہ طلب کے صحیح طریق پر پڑے ہوئے ہیں لیکن اس غلطی میں وہ بھی مبتلا ہیں کہ طلب خدا کے زمانہ کا اندازہ کرنے میں دنیا کی طلب پر بھی تو اس کو قیاس نہیں کر لیتے یعنی یہ نہیں سوچتے کہ مقصود دنیا کے حصول میں کتنا زمانہ صرف ہوتا ہے تو مقصود دینی جو اس سے بدرجہا اعز[4] ہے اس کے حصول کے لیے تو اس سے زیادہ زمانہ اگر صرف ہو تو خوشی سے صرف کرنا چاہیے دیکھئے آدمی دنیوی تعلیم میں محنت کرتا ہے اور برسوں جان مارنے کے بعد کسی امتحان میں پاس ہو جاتا ہے اور اب نوکری کی طلب کے قابل ہوتا ہے امیدواری کرتا ہے اور کبھی کامیاب ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں پاس ہونے سے کئے[5] دن بعد نوکری مل جاتی ہے دیکھا ہوگا کہ برسیں لگتی ہیں یہ کسی کو نہیں دیکھا کہ پاس ہوتے ہی اگلے دن نوکری مل جائے۔ اگر کسی محکمہ میں ایسا ہے بھی تو وہ نوکری درحقیقت امیدواری ہی ہوتی ہے جو قابل شمار نہیں اس کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ بطور وظیفہ کے ہے نوکری قابل شمار جب ہی سمجھی جاتی ہے جب کام سیکھ لے پھر کیا کسی کو آپ نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ پاس ہونے کے بعد چار دن میں اگر نوکری نہ مل گئی ہو تو

---

[1] کھاؤ اور پیو (سورۃ الاعراف) [2] سورۃ المائدہ ۱۱۴ [3] من گھڑت بات [4] عزت والا [5] کتنے

شکایت کرتا پھرتا ہو بلکہ پاس ہونے کے بعد صرف امیدواری کیلئے بھی ایک معتد بہ[1] وقت سوچ لیا جاتا ہے کہ اتنے عرصہ میں اگر نوکری مل جائے تو کچھ شکایت کا موقع نہیں اس سے پہلے ملنا تو خرق عادت[2] سمجھا جاتا ہے اور اس سے تاخیر البتہ اکثر ہو جاتی ہے لیکن بددلی پھر بھی نہیں ہوتی اور حاکم سے خفا ہو کر پھر بھی نہیں رہتے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی طلب میں اس برتاؤ کا عشر عشیر بھی کہیں ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ شیخ کامل نہیں ملتا

بہتیرے[3] تو ایسے بھی ہیں کہ طلب بھی نہیں کرتے بلکہ یہ شکایت ان کی زبان پر ہے کہ ہم طالب خدا کہیں مگر کوئی رہبر شیخ کامل ہم کو نہیں ملتا حالانکہ کبھی شیخ کی تلاش میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلے اتنا بھی نہیں کیا کہ جیسے اسکول میں جا کر جگہ کی تحقیق کر کے بھرتی ہوا کرتے ہیں کسی شیخ کی خبر سن کر بطور امتحان ہی اس کے پاس گئے ہوتے' معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہے کہ کوئی شیخ کامل نہیں ملتا' کیا شیخ ان کے دروازے پر آ کر ان کو گھسیٹ کر لے جائیں' اول تو ایسا ہو نہیں سکتا اور اگر کوئی شیخ بالفرض ایسا کرے تو ان ہی کا اعتراض پہلے یہ ہوگا کہ یہ کامل کہاں سے آیا' کامل ہوتے تو گھر بیٹھتے نہ بکتے۔ تماشا ہے کہ شیخ کی تلاش میں گھر سے نہ نکلیں اور اگر شیخ گھر پر آوے تو وہ شیخ نہیں اس کا کیا مطلب ہے سوائے اس کے کہ شیخ کی ضرورت نہیں۔

صاحبو! یہ یاد رکھئے کہ ایک معمولی کیمیاگر بھی جس کو چار پیسہ کی کیمیا آتی ہو کسی کے در پر نہیں جاتا بلکہ اچھے اچھے اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ منہ بھی نہیں لگاتا' شیخ تو بڑی چیز ہے وہ تمہیں گھر بیٹھے بدوں تلاش کیے اور خاک چھانے کیونکر مل جائے گا۔ کیمیاگر کا منتہائے کمال یہ ہے کہ سونا چاندی بنا دے یا بنانا بتا دے اور سونا چاندی کیا چیز ہے وہی مٹی کے اجزاء ہیں جو تھوڑے دن میں مٹی میں مل جائیں گے۔ جب اس کے استغناء کی یہ حالت ہے تو اس کے استغناء کی تو کیا حالت ہوگی جو خدا تک پہنچاتا ہے اور ناچیز کو چیز اور نجس کو طاہر[4] اور ظلمانی کو نورانی اور فانی کو باقی بنا تا ہے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(مٹی کو جہان پاک سے کیا نسبت)

---

[1] اچھا خاصہ [2] عام عادت کے برخلاف [3] بہت سے لوگ [4] ناپاک کو پاک

وہ تو دنیا بھر کے خود کیمیا گروں کو بھی منہ نہیں لگائے گا اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ وہ متکبر ہوتا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ اس کو تکبر کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی کیونکہ وہ شیخ ہوا کیسے ہے؟ عبودیت[1] حاصل کرنے اور تکبر کو مٹانے ہی سے تو ہوا ہے اس کا تو پہلا قدم یہی ہے کہ اپنے آپ کو خاک سے بھی کمتر سمجھتا ہے مگر بات یہ ہے کہ تکبر اور چیز ہے اور استغناء اور چیز استغناء کے معنی ہیں غیر اللہ کی طرف اپنی حاجت نہ لے جانا اور تکبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ کامل اپنے آپ کو بھنگی چمار سے کبھی بڑا نہیں سمجھتا لیکن اپنی حاجت کو کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے پاس بھی نہیں لے جاتا کیونکہ ان کی نظر میں ایک کے سوا کوئی بڑا نہیں' اس کی نظر میں صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے اور وہ اس کو کافی ہے آپ نے کہیں دیکھا ہے کہ بادشاہ کا مقرب غلام کسی گداگر اور محتاج کے سامنے اپنی حاجت لے جاتا ہو اس کو تو بادشاہ سے ایسی خصوصیت حاصل ہے جو اس کے تمام مہمات[2] کے لیے کافی ہے۔ بادشاہ کے سوا تمام مخلوق اس کی نظر میں گداگر اور محتاج ہے تو جس شخص کو حق تعالیٰ سے خصوصیت حاصل ہو اس کی نظر میں سلاطین دنیا[3] حاجت روا کیونکر ہو سکتے ہیں۔

مصنوعی شیوخ کی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز

جب تکبر اور استغناء میں فرق ظاہر ہو گیا تو اس دھوکہ کا راز بھی کھل گیا جو آج کل کے متصنع[4] شیوخ نے پھیلا رکھا ہے کہ ہر شخص کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے بلکہ گالیاں دیتے ہیں اور جتنی دور دبک[5] کرتے ہیں اتنا ہی لوگ ان کو کامل سمجھتے ہیں۔ یہ عجیب چلتی ہوئی ترکیب ہے۔ تعجب یہ ہے کہ آج کل کے نئے تعلیم یافتہ بھی اس چال میں آ جاتے ہیں۔ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو بخوبی واضح ہو جائے گا کہ وہ استغناء کی محض نقل ہے اور واقع میں تکبر ہے لیکن اثر اس میں اس وجہ سے ہے کہ ایک واقعی مؤثر چیز کی نقل ہے جیسے پولیس کے سے کپڑے پہن کر کہیں چھاپا جا ماریں تو ان کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہو ہی جائیں گے۔ اس صورت میں افسوس تعلیم یافتوں پر زیادہ ہوگا۔ اگر وہ صرف ان کی وردی کو دیکھ کر ان کو واقعی پولیس سمجھ لیں اور اتنی بات بھی نہ دیکھیں کہ ان کا

---

[1] بندگی [2] اہم باتوں [3] دنیا کے بادشاہ [4] مصنوعی پیر [5] دور کرتے اور دھمکاتے ہیں

چھاپا مارنا یہ فعل ہی بتلا رہا ہے کہ یہ پولیس کے آدمی نہیں ہیں کیونکہ پولیس کا کام تو چھاپہ مارنے سے حفاظت ہے نہ کہ الٹا چھاپا مارنا ایسے ہی یہ موٹی بات ہے کہ شیخ کا کام تو تہذیب' اخلاق اور تربیت ہے جب وہ خود ہی بیجا ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے تو دوسروں پر اس کا کیا اثر ہوگا' سوائے اس کے کہ وہ بھی یہی سیکھیں گے یہ تو بعینہ ڈاکہ ڈالنا ہے۔ ظاہری ڈاکو مال کے ڈاکو ہوتے ہیں اور شیوخ ایمان اور قلب کے ڈاکو ہیں۔ شیخ خود بندہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بندہ بنانے والا ہوتا ہے۔ پس اس میں تمیز کرنا کچھ مشکل نہیں کہ وہ شیخ واقعی شیخ ہے یا متصنع۔

مصنوعی شیخ اور واقعی شیخ کو پہچاننے کا طریقہ

بس یہ دیکھ لو کہ اس کے پاس رہنے سے عبودیت حاصل ہوتی ہے یا نہیں یا خود اس کے خفیہ حالات میں عبودیت غالب ہے یا نہیں۔ بنائی ہوئی بات چھپ نہیں سکتی' یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی بنظر غور دیکھے اور تصنع ظاہر نہ ہو جائے غرض بڑی شکایت اس بات کی ہے کہ کبھی اس تلاش کے لیے بھی گھر سے قدم نہیں نکالا نہ کچھ وقت صرف کیا اور نہ کچھ مال ہی صرف کیا میں کہتا ہوں کہ آج کل تو اس قدر سہولتیں ہیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی ہوں گی۔ سفر بہت آسان ہے وقت بھی تھوڑا لگتا ہے' دام بھی تھوڑے خرچ ہوتے ہیں' لوگوں میں ہم نے یہ خبط تو دیکھا ہے کہ ذراسی جڑی بوٹی کی تحقیق کے لیے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں اور اس کو بڑا فخر سمجھتے ہیں اور نہ کرنے والوں کو کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں جمود ہے' تحقیقات کا مادہ ہی نہیں اسی وجہ سے ترقی نہیں ہوتی بعضوں کو یہاں تک بھی دیکھا کہ جب ملازمت سے چھٹی اور تعطیل ہوتی ہے تو تبدیل آب و ہوا اور تفریح طبع کے لیے شملہ یا منصوری یا نینی تال جاتے ہیں اور اس میں بڑی رقم خرچ کرتے ہیں تو فضول کا تو اہتمام اور ضروری دین کا اس سے عشر عشیر بھی نہیں۔

صاحبو! اب میں تو اس پر کیا فتویٰ لگاؤں آپ خود ہی اس فعل کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کر لیجئے' میں اس لیے فتویٰ نہیں لگا سکتا کہ فتویٰ دینے میں مجھے اس کا ثبوت دینا پڑیگا کہ شملہ جانا اور نینی تال جانا جائز ہے اور فقہ میں کوئی جزئیہ ایسا ہے نہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کو مجوج[1] کر دوں اور اگر قواعد سے فتویٰ دیا جائے تو اس کو مانتا کون ہے مگر میں

[1] مغلوب کردوں

آپ سے ایک مثال فرض کر کے پوچھتا ہوں کہ جس شخص کو کھانے کی ضرورت ہو اور وہ کھانا نہ کھائے بلکہ اس کے بجائے تفریح کے لیے بازار میں ٹہلتا پھرے اور سرمایہ وہاں فضول اشیاء میں فنا کر دے تو کیا اس تفریح پر آپ کوئی فتویٰ لگا سکتے ہیں۔ دنیا بھر کے مفتی اکٹھے ہو جائیں تو بازار میں ٹہلنے کی ممانعت صراحتہً ثابت نہیں کر سکتے۔ اگر اس نے یہی عمل رکھا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس عمل کا انجام یہ ہوگا کہ وہ بھوک کے مارے مر جائے گا اس کی وجہ کیا ہے حالانکہ اس نے کوئی ناجائز فعل نہیں کیا' دونوں فعل ظاہر میں شرعاً جائز تھے' کھانا بھی اور بازار میں پھرنا بھی مگر پھر بھی اس فعل کے مذموم[1] ہونے کی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ دونوں فعل اگرچہ مباح تھے لیکن ان میں ترتیب کی ضرورت تھی' ضروری کو اول اور غیر ضروری کو بعد میں رکھنا چاہیے تھا۔

جائز کاموں میں ترتیب بھی ضروری ہے

اس شخص نے اس ترتیب کا خیال نہیں کیا اس واسطے ہلاک اس پر مرتب ہو گیا اس کو چاہیے تھا کہ پہلے کھانا کھاتا اس کے بعد بازار میں ٹہلتا اور زائد رقم اس میں صرف کرتا بلکہ اگر وقت یا سرمایہ نہ بچتا تو اس کام کو حذف ہی کر دیتا یہ بہت سی موٹی سی بات ہے اس میں کسی کے فتویٰ دینے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں' موٹی سے موٹی عقل کا آدمی بھی اس کے خلاف نہیں کہے گا۔

اس نظیر کے بعد جڑی بوٹی کی تحقیقات کے لیے سفر اور تفریح کے لیے سفر کرنے پر میں آپ ہی سے فتویٰ پوچھتا ہوں کہ مولوی تو الگ ہیں وہ کوئی صریح فتویٰ اس پر نہیں دیں گے کیونکہ آپ ان سے دلیل مانگیں گے کہ قرآن وحدیث میں یا کسی اور کتاب میں کہاں لکھا ہے کہ جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کے لیے یا تفریح طبع کے لیے سفر نہ کرو' غرض ہم تو اس تقدیم دنیا علی الدین[2] کے متعلق فتویٰ لگانے سے عذر کر دیں گے' لیکن آپ ہی فرمائیے کہ آپ کے پاس اس عقلی فتویٰ سے بچنے کی کیا ترکیب ہے جو اس شخص پر لگایا تھا جو اس تقدیم دنیا علی الدنیا کا مرتکب ہو رہا ہے یعنی جو کھانا نہیں کھاتا اور بازار میں ٹہلتا پھرتا ہے وہاں آپ کا فتویٰ یہ ہوگا کہ اس نے دو کاموں میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی اس واسطے نتیجہ اس کا ہلاک ہوا۔

---

[1] برے [2] دنیا کو دین پر مقدم کرنا

اسی طرح یہاں بھی دو کام ہیں ایک جڑی بوٹیوں کی تحقیق اور تفریح کے لیے سفر کرنا اور ایک شیخ کی تلاش کے لیے سفر کرنا ان دونوں میں بھی ترتیب ہونی چاہیے یا نہیں یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ ترتیب ہے کیونکہ مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ دین کی اصلاح ضروری اور مقدم نہیں اس وقت مخاطب سب مسلمان ہی ہیں ان کے سامنے اس پر دلیل وغیرہ لانے کی کچھ ضرورت نہیں کہ اصلاح دین اصلاح دنیا سے مقدم ہے۔

جب یہ مسلم ہوا تو اب میں پوچھتا ہوں کہ تحقیقات اور تفریح طبع کے لیے سفر کرنے والوں پر یہ فتویٰ کیوں نہیں عائد کیا جاتا کہ انہوں نے ترتیب کا خیال نہیں رکھا اور کیا کوئی برا نتیجہ اس پر مرتب نہ ہوگا جیسا کہ اس شخص پر ہوا تھا جو بھوک کے وقت کھانا چھوڑ کر بازاروں میں ٹہلتا پھرتا تھا۔ ضرور مرتب ہونا چاہیے اس پر اگر ہلاک جان کا ترتب ہوا تھا تو اس پر ہلاک ایمان کا ترتب ہونا چاہیے کیونکہ کھانا محافظ جان ہے اور شیخ محافظ ایمان۔ ذرا تو انصاف چاہیے ہم گو ضابطہ کا فتویٰ نہ دیں لیکن آپ ہی کا فتویٰ موجود ہے۔

پیش کہ آورم زدستت فریاد ہم پیش نواز دست تو میخواہم داد

(آپ کے ہاتھ کی فریاد کس کے پاس لے کر جاؤں؟ آپ کے سامنے آپ ہی سے انصاف چاہتا ہوں)

شیخ کو تلاش کرنے کی شرعی دلیل

عقلی فتویٰ سمجھا دینے کے بعد اب میں تبرعاً شرعی فتویٰ بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس نظیر کے سمجھنے کے بعد اب شرعی فتویٰ بھی سمجھ میں آ جائے گا' سو یاد رکھئے کہ گو شریعت میں تحقیقات کے لیے سفر کی اور منصوری' شملہ پر جانے کی صراحتہً ممانعت نہیں مگر فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ "الاھم فالاھم" کی رعایت واجب ہے[1] جس وقت جو کام اہم ہو اس وقت اس کام کا کرنا واجب اور جو شے اس میں مخل ہو اس کا ترک واجب ہے۔ چنانچہ اگر نماز کا وقت ہو' جماعت تیار ہو اور اس وقت ایک کافر آپ سے کہے کہ مجھے مسلمان کر لو تو اس وقت اس کو مسلمان کرنا واجب ہے اور جماعت ترک ہو جائے تو اس کی پروا نہ کی جائے گی حالانکہ جماعت بھی شرعاً واجب ہے اسی طرح اگر ایک شخص حج نفل کا ارادہ کرتا ہو اور اندیشہ یہ ہے کہ سفر میں نمازیں قضا ہوں گی اس

---

[1] یعنی جو جتنا زیادہ ضروری ہے اسے اتنا مقدم کیا جائے

کے لیے حج نفل کی اجازت نہیں تو جب شریعت نے "الاھم فالاھم" کے قاعدہ کا اتنا لحاظ کیا ہے کہ اہم کی وجہ سے دوسرے واجب اور نفل کا ترک واجب کر دیا تو بتلائیے کہ اصلاح دین جب اہم اور مقدم ہے اور شملہ، منصوری کا سفر اس میں مخل ہو رہا ہے اور مصلح کے پاس جانے سے مانع ہے کیونکہ اس مدت تعطیلی[1] کے سوا کوئی وقت فراغ کا آپ کے پاس نہیں تو اس حالت میں یہ سفر آپ کے لیے کیونکر جائز ہوگا اور ترک اہم کی وجہ سے یہ مباح کیوں ممنوع نہ ہو جائے گا۔

افسوس کہ جتنی سہولتیں آج کل شیخ کی تلاش میں ہیں اتنا ہی لوگوں نے اس کو دشوار کر لیا ہے وہ اس طرح کہ ارادہ ہی نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی تعطیل[2] تو اس کام میں صرف کی ہوتی پھر میں یہ شکایت خوشی سے سنتا کہ آج کل شیخ کامل کا کال[3] ہے اور کوئی میسر نہیں آیا حالانکہ ایک دفعہ کی تلاش میں میسر نہ آنا بھی کافی عذر نہیں، ایک ایک جڑی بوٹی کی تلاش میں لوگوں نے عمریں کھپا دی ہیں مگر خیر کسی درجہ میں تو عذر ہو جاتا مگر اب تو یہ بھی نہیں کیا جاتا یعنی ایک سفر کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

شیخ کی تلاش کا آسان طریقہ

بلکہ اس سے بھی زیادہ سہولت یہ ہے کہ جس شخص کی طرف خیال ہو اس کی تصانیف اور اقوال دیکھئے سفر کی بھی حاجت نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ طلب کی نظر سے اور تحقیق کی نظر سے دیکھیں گے تو متصنع اور غیر متصنع کا حال فوراً ہی کھل جائے گا۔ غرض کچھ تو کیجئے شکایت تو اس بات کی ہے کہ کچھ بھی نہیں کرتے کبھی شیخ کی طرف طلب کی نگاہ بھی نہیں اٹھائی اور شکایت کرنے لگے کہ کوئی کامل ملتا ہی نہیں یہ تو عام لوگوں کی غلطی ہے اور میں نے کہا تھا کہ اس میں خواص بھی مبتلاء ہیں۔

خواص کی ایک بیجا شکایت اور اس کا جواب

ان کی سنئے کہ اگر کسی کو تلاش سے یا بلا تلاش کوئی شیخ مل بھی گیا تو اب ان کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ اتنے دنوں سے ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں اور کوئی بات بھی حاصل نہیں۔ اول تو تعلق با قاعدہ نہیں رکھتے، تعلق صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے کا نام رکھا ہے، بعض ایسے مرید ملتے ہیں جو

---

[1] چھٹی کا وقت [2] چھٹی [3] نہیں ملتا

مصافحہ کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ آپ نے پہچانا نہیں میں کہہ دیتا ہوں کہ تم نے اپنے کو پہچنوایا ہی نہیں۔ جواب ملتا ہے کہ چار برس ہوئے جب آپ سے بیعت ہوئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ میرے پاس مریدوں کی ایک فہرست رہتی ہے اور صرف رہتی ہی نہیں بلکہ میں اس کو رٹتا بھی رہتا ہوں بلکہ مریدوں کے فوٹو بھی رکھتا ہوں کہ جب کوئی سامنے آیا پہچان لیا۔

صاحبو! ایسا تعلق، تعلق نہیں ہے بلکہ دل لگی ہے جو کسی درجہ میں بھی کارآمد نہیں، سو ایک تو تعلق کی یہ گت ہے اور بعض لوگ تعلق بھی باقاعدہ رکھتے ہیں، خط و کتابت بھی رکھتے ہیں اور آتے بھی ہیں، رہتے بھی ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں مگر چار دن میں ہی یہ شکایت ہوتی ہے کہ دل میں کچھ رونق پیدا نہیں ہوئی۔ ''کے آمدی و کے پیر شدی'' (کب آئے اور کب پیر ہوئے) بندہ خدا دل میں رونق اتنی جلدی کیسے حاصل ہو سکتی ہے وہ کون سا کام ہے جو چار دن میں آسکتا ہے۔ علاوہ بریں میں کہتا ہوں کہ رونق ہے کیا چیز اللہ کی طلب مقصود ہے یا دل کی رونق اگر ساری عمر بھی رونق حاصل نہ ہو تو ضرر نہیں۔ رونق تو بازار میں بھی حاصل ہو جاتی ہے اور ناجائز مجمعوں میں تو بہت ہی کچھ حاصل ہوتی ہے اگر رونق کی طلب تھی تو وہاں جانا چاہیے تھا یہاں تو ویرانی ہی ویرانی ہے گو وہ ویرانی بھی اور قسم کی ہے۔

مترس از محبت کہ خاکت کند   کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

(محبت سے یہ مت ڈرو کہ وہ تمہیں خاک کر دے گی، جب تم خاک ہو جاؤ گے تو ہمیشہ کے لیے باقی ہو جاؤ گے)

طالب کے لیے کیفیات کی طلب خطرناک ہے

طالبین کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کیفیات کے پیچھے نہ پڑیں، اس میں بہت دھوکہ ہوتا ہے بعض وقت آدمی کسی کیفیت سے بہت مسرور ہوتا ہے اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ اسی کو مقصود سمجھنے لگتا ہے پھر اگر وہ جاتی رہے تو مایوس ہوتا ہے اور اگر وہ نہ جائے تو تمام عمر اسی کا ہو رہتا ہے حالانکہ یہ خفی شرک ہے کیونکہ کیفیت کوئی بھی ہو غیر اللہ ہے اور طالب اللہ کا ہونا چاہیے نہ کہ غیر اللہ کا، یہ بڑا دھوکہ ہے اس سے آدمی بلا اعانت شیخ کامل[1] کے بڑی مشکل سے

---

[1] شیخ کامل کی مدد کے بغیر

بچتا ہے۔ جس کا مقصود کیفیات ہوتے ہیں ان کے جاتے رہنے کے وقت ان کو ایسا صدمہ ہوتا ہے جیسے اپنا کوئی محبوب مر گیا۔ دیکھئے حق تعالیٰ تو فانی نہیں جو طالب اللہ کا ہے اس کو یہ وقت کبھی پیش نہیں آتا کیونکہ اس کا محبوب تو موجود ہے اس کی اگر تمام کیفیات بھی سلب ہو جاویں تو وہ یہ کہے گا۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست ۔ تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(سارے دن ہی گزر جائیں تو گزر جائیں کچھ ڈر نہیں، ہاں آپ رہ جائیں کیونکہ آپ کے سوا کوئی پاک نہیں)

جو لوگ چار دن میں شکایت کرنے لگتے ہیں حقیقت میں ان کی نظر مقصود پر پڑی ہی نہیں اگر نظر پڑی ہوتی تو دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مقصود حاصل ہو چکا ہے تب یہ شکایت کس بات کی اور اگر حاصل نہیں ہو چکا ہے تب بھی شکایت کا موقع نہیں اس واسطے کہ مقصود جتنا ذی وقعت[1] ہوتا ہے اتنی ہی وصول میں دیر لگتی ہے اور شکایت کا موقع نہیں ہوتا۔ اگر حق تعالیٰ پر نظر پڑی ہے تو ان کی وقعت کے سامنے کوئی مدت بھی دیر میں داخل نہیں پھر جلدی کرنا کیا معنی۔ بس یا تو مقصود کی وقعت[2] ہی ان کے ذہن میں نہیں یا مقصود پر نظر ہی نہیں پہنچی۔ کیفیات کے دھیان میں لگنے کے یہ نتائج ہیں ایسی جلدی جب ہی ہوتی ہے جبکہ مقصود متعین نہ ہو یا اس کی عظمت ذہن میں نہ ہو۔ دیکھئے ڈپٹی کلکٹری کے لیے کتنی مدت کی ضرورت تھی جس کو اس مدت میں کامیابی ہو جاوے تو وہ اس کو دیر میں کامیابی نہ کہے گا پھر حیرت ہے کہ خدا مطلوب اور دیر کے لیے آمادگی نہیں کہ ادھر رات کو اللہ اللہ کیا اور صبح تک معراج کا فرشتہ نہ آ گیا تو کہتے ہیں کہ ساری محنت اکارت ہے یہ تو وہی قصہ ہوا کہ "اِذَا صَلّٰی یَوْمَیْنِ انْتَظَرَ الْوَحْیَ" (دو دن نماز پڑھی اور وحی کا انتظار شروع کر دیا)

چنانچہ ہماری بستی محلہ خیل میں ایک شخص جاہل تھے بہت عابد، زاہد، تہجد گزار، پابند صوم و صلوٰۃ تھے، لوگوں کو ان کی طرف میلان بھی تھا اور کہتے تھے کہ وہ بزرگ آدمی ہے ایک شخص نظام الدین نام کا ان ہی کے محلہ میں رہتا تھا وہ مسخرہ تھا اور ان سے بدعقیدہ تھا، جب لوگ یہ کہتے کہ یہ بزرگ آدمی ہیں تو وہ کہتا کہ جاہل کی کیا بزرگی؟ لوگ اس کو برا بھلا کہا کرتے تھے

---

[1] اونچے مرتبہ والا [2] قدر

ایک روز اس نے تماشا کیا' جب وہ عابد صاحب تہجد کے لیے اٹھے تو یہ چھت پر جا بیٹھے اور بہت باریک آواز میں انہیں پکارا' انہوں نے کہا کون؟ جواب دیا میں ہوں جبرئیل خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغام لایا ہوں کہ اب تم بوڑھے ہو گئے اور موسم بھی سردی کا ہے رات کو اٹھ کر وضو کرتے ہو بہت تکلیف ہوتی ہے ہم کو شرم آتی ہے جاؤ ہم نے تمہیں اب نماز معاف کر دی' یہ سن کر بے حد خوش ہوئے اور خوب پاؤں پھیلا کر سوئے' یہاں تک کہ صبح کی نماز میں بھی نہیں آئے' لوگوں نے یہ سمجھا کہ کچھ طبیعت خراب ہوگی' یا آنکھ لگ گئی ہوگی اس لیے نہ آئے ہوں گے لیکن وہ دوسرے وقت بھی نہ آئے' یہاں تک کہ کئی وقت گزر گئے تب محلّہ کے آدمی مزاج پرسی کے لیے گئے' جا کر دیکھا ہٹے کٹے بہت خوش چارپائی پر لوٹ مار رہے ہیں۔

لوگوں نے کہا میاں جی کیسا مزاج ہے؟ کہنے لگے بہت اچھا ہوں۔ کہا نماز کو کیوں نہیں آتے؟ تو بہت اینٹھ کر بولے کہ بھائی بہت نماز پڑھی اب خدا نے سن لی ہے اور جو غرض تھی نماز سے وہ حاصل ہوگئی ہے اب میرے پاس فرشتہ آنے لگا' پرسوں یہ پیغام لایا تھا کہ اب نماز معاف کر دی گئی ہے۔ وہ مسخرہ جو دور بیٹھا تھا دیکھ رہا تھا' قہقہہ مار کر ہنسا اور کہا دیکھ لی جاہل کی بزرگی۔ لوگوں نے کہا ظالم تو نے غضب کر دیا' یہ تو ایک جاہل کا قصہ ہے جس کو سن کر اس کو بہت ہی خفیف نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر صاحبو! تعجب ہے کہ ہم اس کا تو مضحکہ[1] بناتے ہیں لیکن اپنے حالات دیکھیں تو وہ بھی اس ہی جیسے ہیں کہ چار دن میں انتظار کرنے لگے حق تعالیٰ کے ملنے کا' بتلایئے فرق کیا ہے ہماری اس حرکت میں اور اس جاہل کی حرکت میں بلکہ یہ حرکت اور زیادہ خفیف ہے اس واسطے کہ اس نے تو تمام عمر کی عبادت پر اس ترقی کو مرتب سمجھا اور ہم چار ہی دن کے ذکر پر اس کے منتظر ہوں تو اس کا معراج کا انتظار اتنا مستبعد[2] نہ ہوا جتنا کہ ہمارا ہے یہ کیسی غلطی ہے ایک تو یہ غلطی ہے۔

ایک اور غلطی

اور دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض دفعہ کوئی چیز غیر مطلوب پیدا ہوگئی' مثلاً بدن میں حرارت پیدا ہوگئی یا دل میں حرکت بڑھ گئی تو اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگے' خوب کان کھول کر سن لیجیے

---

[1] مذاق اڑاتے ہیں [2] دور

کہ ذکر پر جو نتیجہ موعود ہے وہ یہ ہے: "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ"[1] (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا۔) بس اسی کا وعدہ ہے یہ ضرور مرتب ہوتا ہے اس کے سوا کسی بات کا وعدہ نہیں، کوئی بات پیدا ہو یا نہ ہو بلکہ پیدا ہونا بعض اوقات خطرناک ہوتا ہے۔ غرض نتیجہ کے تو مرتب ہونے میں کچھ شبہ نہیں اور واقعی نتیجہ ہے بھی یہی اور یہی اس قابل ہے کہ اس پر دھیان لگایا جاوے، باقی اس کے سوا دوسری کیفیات اور احوال چیز ہی کیا ہیں۔ کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ہماری یاد وہاں ہو اگر کسی کو ایک دفعہ کوئی معمولی حاکم یاد کرلے تو اس کے دماغ آسمان پر چڑھ جاتے ہیں پھر خدا تعالیٰ کا یاد کرنا تو کتنی بڑی چیز ہے اور اس سے زیادہ کیا نتیجہ چاہیے۔ پھر جب موعود نتیجہ[2] یہ ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر ذاکر[3] کو کسی دلیل سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ یہ نتیجہ میرے ذکر پر مرتب نہیں ہوا تب تو شکایت کا موقع ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے کیونکہ یہ بات عقائد میں داخل ہے کہ خلف وعدہ[4] نہیں ہو سکتا۔

فرشتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آ چکا اور وعدہ سنا گیا کہ جب کوئی ذکر کرے گا تو حق تعالیٰ اس کا ذکر کریں گے۔ نیز حدیث میں ہے:

مَنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ وَمَنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَأٍ ذَكَرْتُهُ فِيْ مَلَأٍ خَيْرٍ مِّنْهُ.

(یعنی جو مجھ کو چپکے چپکے یاد کرتا ہے میں اس کو چپکے چپکے یاد کرتا ہوں اور جو کوئی مجھ کو مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں) وہ بہتر مجمع کون سا ہے؟ ارواح انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ ہیں جب یہ وعدہ ہو چکا اور عقیدہ ہے کہ وعدے کے خلاف ہو نہیں سکتا تو ہر ذکر کے بعد یقیناً ثمرہ مرتب ہوتا ہے اور کیسا ثمرہ جو کہ تمام ثمروں سے اچھا، اول تو حق تعالیٰ کا یاد کرنا اور پھر بعض صورتوں میں ایسے مجمع میں جس کا ایک ایک فرد تمام دنیا سے افضل ہے۔

دیکھئے اگر کسی کو یہ خبر دی جائے کہ بادشاہ سلامت دربار خاص میں تمہارا ذکر کر رہے تھے تو اس کی کیا حالت ہو بلا مبالغہ انگر کھے کے بند ٹوٹ جائیں خواہ اس ذکر کا کوئی کارآمد

---

[1] البقرہ: ۱۵۲ [2] جس نتیجہ کا وعدہ کیا گیا [3] ذکر کرنے والے [4] وعدہ خلافی

نتیجہ بھی متفرع[1] نہ ہو یعنی کوئی جاگیر یا کوئی منصب ملنے کی بھی امید نہ ہو' صرف اس بات پر مرتے ہیں کہ بادشاہ نے یاد تو کیا حالانکہ بادشاہ ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے اور دربار کا سارا مجمع بھی ہم ہی جیسے افراد کا مجموعہ ہے۔ تمام دنیا کے بادشاہوں اور عظماء کو خدائے احکم الحاکمین اور انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ سے کیا نسبت؟ شادی مرگ[2] ہو جانا چاہیے جبکہ ہم سنیں کہ حق تعالیٰ نے ہم کو یاد کیا ہے غرض وہ ثمرہ یہ ہے اور کتنی بڑی بات ہے مگر ہم لوگوں نے اپنی عقلوں کو کیسا مسخ کر لیا ہے کہ اس کو کسی شمار ہی میں نہیں لاتے اور ان ثمرات کا جو بالکل بے اصل ہیں (یعنی ثمرات اصلیہ کے سامنے) انتظار کرتے ہیں۔ صاحبو! میں دل سوزی سے مشورہ دیتا ہوں کہ اگر کسی وقت ثمرات زائدہ کا دل پر تقاضا ہو تو یوں کہا کیجئے:

یا بم اورایا نیابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اسے پاؤں یا نہ پاؤں' جستجو کر رہا ہوں' پوری ہو یا نہ ہو آرزو کر رہا ہوں)

بہرحال لوگوں کو ان زوائد میں ابتلاء[3] ہو گیا ہے اور اصلی چیز کا پتہ نہیں اور اگر اصلی چیز کی خواہش بھی ہوتی ہے تو یہ چاہتے ہیں کہ مفت مل جائے' کچھ کرنا نہ پڑے اور ناقص طلب پر اپنے آپ کو امیدوار سمجھتے ہیں۔

آخرت کے لیے کوشش دنیا کی سی نہیں کی جاتی

مگر اس قسم کی امیدواری صرف آخرت ہی کے بارے میں ہے' دنیا کی امیدواری کبھی اس طرح نہیں کرتے' وہاں تو کوشش میں جان توڑ دیتے ہیں اور کوئی ایسا کرے کہ غلہ کی تمنا کرے اور کھیتی نہ کرے اور نہ اس کی سینچائی کرے اور اپنے آپ کو غلہ کا امیدوار رکھے تو ہر کس و ناکس بلاشبہ اس کو یہی کہے گا کہ پاگل ہے' اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور یوں کہتے ہیں کہ یہ غلط چال چلتا ہے نہ دانا بویا' نہ پانی سینچا اور غلہ کا امیدوار بن بیٹھا اور اگر کسی نے ساری تدبیریں کر کے پھر کہا کہ کام تو سب کر لیا ہے اب خدا سے امید ہے اس کو لوگ کہیں گے کہ یہ صحیح چال ہے یا مثلاً ایک شخص اولاد چاہتا ہے' اس کو ہر شخص مجنوں کہے گا حالانکہ اس شخص کے پاس ایک نظیر بھی اس کی ہے کہ بلا نکاح کے اولاد ہوئی ہے۔ سب

---

[1] برآمد [2] خوشی میں مر جانا چاہیے [3] فضول باتوں میں پڑ گئے ہیں

جانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام بلا مرد و عورت کے پیدا ہوئے۔ حضرت حوا بدوں عورت کے پیدا ہوئیں، عیسیٰ علیہ السلام بدوں مرد کے پیدا ہوئے جبکہ یہ نظیریں موجود ہیں تو کسی کو انکار اور اعتراض کا چنداں موقع نہیں مگر پھر بھی کہتے ہیں اس کو پاگل ہی۔

امید کے صحیح معنی

تو اصل اس کی یہ ہے کہ سب مقاصد میں امید کے معنی جمع اسباب کے بعد توقع حصول نتیجہ[1] ہیں مگر حیرت ہے کہ طلب خدا کے بارے میں امید کے عجیب معنی گھڑے گئے ہیں کہ نہ تقویٰ کی ضرورت نہ طہارت کی، نہ کسی اور چیز کی اور امید ایسی گہری کہ یقین سے بھی کسی درجہ میں بڑھی ہوئی۔ کیوں صاحب کیا یہ بھی کوئی خاصیت ہے کہ امید کے ساتھ جب دنیا کا نام لگے تو اس میں بہت سے شرائط ہوں اور جب آخرت کا نام لگے تو بالکل شرائط حذف ہو جائیں، کوئی قید و شرط باقی نہ رہے۔

امید کے معنی میں نفس کا دھوکہ

دیکھ لیجئے یہ کس درجہ نفس کا دھوکہ ہے کبھی تو غور کرنا چاہیے کہ وہی ایک لفظ ہے ایک جگہ اس کے معنی کچھ ہو جاتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ، لغت میں تو کہیں نہیں لکھا کہ امید دو معنوں میں مستعمل ہے، افسوس ہم نفس و شیطان کے سامنے ایسے بھولے بنے کہ جس طرح وہ چاہے بہکا لیتا ہے، اس کے اقوال میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ ایک لفظ کے دو معنی کس قاعدہ سے لیتا ہے۔

ایک طلب علم کی بوالہوسی کا قصہ

ایک، طالب علم تھے، فاقہ کرتے تھے مگر دماغ میں ایک شہزادی سے نکاح کی سمائی ہوئی تھی، کسی نے ان سے پوچھا کہ میاں کچھ امید بھی ہے، کچھ آثار بھی ایسے ہیں جن سے امید پڑے؟ کہا جی ہاں آدھا سامان تو ہو گیا ہے آدھا باقی ہے۔ پوچھا وہ آدھا کیا ہے؟ کہا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں یعنی نکاح میں دو جزو ہیں ایجاب و قبول، میں تو ایجاب کے لیے تیار ہوں اس کا قبول کرنا باقی ہے۔ بس ایسے ہی ہمارا سامان آخرت ہے کہ ہم تو جنت کے

---

[1] اسباب جمع کرنے کے بعد نتیجہ کی امید اور توقع رکھنا

لیے تیار ہیں' فقط ادھر کی منظوری باقی ہے۔ صاحبو! نری باتوں اور خالی آرزوؤں سے کہیں کام چلتا ہے خوب یاد رکھو

عرفی گر بگر یہ میسر شدے وصال — صد سال میتواں بتمنا گریستن

(عرفی اگر صرف رونے سے ملاپ ممکن ہوتا تو اس آرزو میں سو سال رویا جا سکتا تھا)

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

لَوْكَانَ يُدْرَكُ هَذَا الْعِلْمُ بِالْمُنٰى — مَاكَانَ يَبْقَى فِي الْبَرِيَّةِ جَاهِلُ

فَاجْهَدْ وَلَا تَكْسَلْ وَلَا تَكُ غَافِلاً — فَنَدَامَةُ الْعُقْبٰى لِمَنْ يَتَكَاسَلُ

(اگر یہ علم محض آرزوؤں سے ملا کرتا تو دنیا میں کوئی جاہل باقی نہ رہتا' کوشش کرو' سستی نہ کرو' غفلت نہ کرو' سست آدمی کا انجام تو شرمندگی ہوتا ہے)

یہ سب نفس کے دھوکے ہیں کہ زندگی بھر ان ہی ابلہ فریبیوں[1] سے آدمی کو کام سے روکتا ہے اور جب موت آ گئی تو پلہ جھاڑ کر بے حیا الگ ہو گیا اور کہہ دیا "اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ" یعنی سچی تو حق تعالیٰ ہی کی بات تھی میں نے جو کچھ وعدے کر رکھے تھے وہ جھوٹے تھے آج اپنے ان سب وعدوں کے خلاف کر رہا ہوں اب جو ہو سکے میرا کر لو۔

کس قدر حسرت کا وقت ہوگا سو اس وقت سے پہلے ہی ہوش میں آ جائیے اور اس دھوکے میں نہ رہئے کہ خواہ کوشش کریں یا نہ کریں کام ہو ہی جائے گا آپ کو خدا تعالیٰ سے جو امید ہے یہ امید غلط معنوں میں ہے اور ایک وقت میں اس کی غلطی کھل جائے گی' عمل میں کوشش کیجئے اور اس کے بعد حق تعالیٰ سے امید رکھئے' ہاں کوشش کر کے یہ نہ سمجھئے کہ یہ ہماری کوشش سے حاصل ہوا بلکہ کوشش کے بعد جو نتیجہ ہوتا ہے وہ بھی فضل خداوندی ہی ہے۔

یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ حق تعالیٰ نے کیا دیا ہم نے کوشش بھی تو کی تھی کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوشش کے بعد نتیجہ مترتب نہ ہو۔ چنانچہ بہت سے اسباب' مسببات میں اس کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے اور مسلمان کے تو عقیدہ میں داخل ہے کہ کوئی چیز موجود نہیں ہو سکتی جب تک حق تعالیٰ کا ارادہ نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد بھی نتیجہ کا وجود از خود نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔

---

[1] بے وقوفی کی باتیں

زیادہ تدبیر سے آدمی کو تدبیر پر بھروسہ ہو جاتا ہے

یہ خرابی انہماک فی التدبیر[1] کی ہے کہ اس پر بھروسہ ہو جاتا ہے اسی واسطے اجمال فی الطلب[2] کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ تدبیر پر بھروسہ نہ ہونے پائے۔ لوگ کہہ تو دیتے ہیں کہ تدبیر میں کیا حرج ہے مگر حضرت آپ نے غور نہیں کیا جب سے تدبیر میں غلو ہوا ہے اس وقت سے لوگ فاعل حقیقی[3] بننے لگے ہیں ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاعل حقیقی گو زبان سے کسی اور کو کہیں مگر یہ برائے گفتن ہے دل میں تدبیر پر اتنا بھروسہ ہے کہ اس کے بعد ترتب نتیجہ کے لیے مشیت ایزدی[4] کا خیال بھی کم آتا ہے حالانکہ تدبیر کے بعد کام بمشیت ایزدی[5] ہی ہوتا ہے۔ دیکھو حق تعالیٰ ایک ایسے فعل کی نسبت جو ظاہراً تمہارا اختیاری معلوم ہوتا ہے کیا ارشاد فرماتے ہیں: ''اَفَرَاَیْتُمْ مَّاتَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ[6]''، یعنی اپنے بونے کو بھی تم نے دیکھا اس کو تم اگاتے ہو یا ہم۔ دیکھئے لیجئے ظاہری نظر میں تو کھیت کا پیدا ہونا اور غلہ حاصل کرنا انسان کا اختیاری فعل ہے پھر اس پر یہ سوال کیسے ٹھیک ہے کہ اس کھیت کو تم تیار کرتے ہو یا ہم۔

کسی فعل پر نتیجہ مترتب ہونے سے اس فعل کی نسبت اپنی طرف کرنا صحیح نہیں

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی فعل پر نتیجہ مترتب ہوتے دیکھ کر اس کی حقیقی نسبت اپنی طرف کرنا صحیح نہیں اور یہ واقعی بات ہے بے سوچے سمجھے کوئی کچھ کہہ دے لیکن غور کرنے کے بعد یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ تمہارا دخل ترتب نتیجہ میں سوائے اس کے اور کیا ہے کہ تم نے آلات و ذرائع کو استعمال کیا' باقی ان کے استعمال پر نتیجہ کا ترتب اس میں تمہارے اختیار کو کیا دخل ہے تم تو کھیت میں دانہ پھینک کر اور غارت کر کے مٹی میں ملا کر چلے آئے تھے' وہاں مٹی میں مل کر جو کچھ تغیرات ہوئے اس کا تمہیں علم تک بھی نہیں ہوتا' اختیار تو کہاں سب کام اس کے اندر ہی اندر ہو کر سبز پتے کی صورت میں جب باہر نکل آیا تب تو تم کو یہ علم ہوا کہ اس دانہ کے سب کام ہو گئے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دانہ نہیں جمتا اور آپ کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ دانہ کہاں گیا' غرض کسی قسم کا اختیار سوائے استعمال

---

[1] تدبیر میں بہت زیادہ محنت اور توجہ [2] مختصر تدبیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرنا) [3] اصل کرنے والا [4] نتیجہ حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا خیال [5] اللہ تعالیٰ کے ارادہ [6] سورۃ الواقعہ ۶۳' ۶۴

آلات کے آپ کو نہیں، اگر کوئی کہے کہ ہم کو بعض چیزوں پر تو ہر طرح سے اختیارات ہیں، دیکھو جب چاہیں بجلی بنا لیتے ہیں اور طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں تو میں یہ جواب دیتا ہوں کہ بجلی کا پیدا کرنا کیا تمہارے فعل سے ہوا؟ تم نے تو صرف یہ کیا کہ چند چیزوں کو ملا دیا اس کے بعد جو بجلی پیدا ہوئی اس میں تمہارے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں، تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ بجلی کیا چیز ہے، یہ لوگ فلسفہ بھی نہیں جانتے۔

دیکھئے فلسفہ کا مسئلہ ہے: "اَلْقُدْرَۃُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّیْنِ" یعنی قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے جیسے چلنا[1] یا مٹھی بند کرنا کہ اس پر قادر اس شخص کو کہیں گے جس کے ارادہ کا تعلق مشی اور عدم مشی اور قبض اور بسط دونوں سے ہو سکے یعنی جب چاہے چلے اور جب چاہے نہ چلے اور جب چاہے مٹھی بند کرے اور جب چاہے کھول لے۔ اسی بنا پر میں سوال کرتا ہوں کہ بجلی کا پیدا کرنا اگر تمہاری قدرت میں ہے تو یہ جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا وجود اور عدم دونوں تمہارے اختیار میں ہوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ آپ برق کے پیدا کرنے کیلئے آلات کو استعمال کیجئے اور یہ ارادہ کیجئے کہ برق پیدا نہ ہو، دیکھوں تو پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ ضرور پیدا ہوگی۔

اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ آپ کے اختیار میں صرف استعمال آلات ہے اور وجود برق[2] آپ کے اختیار میں نہیں ورنہ ارادہ عدم کے وقت نہ پیدا ہوتی۔ یہ فلسفہ سے ثابت ہوا۔ افسوس تو یہ ہے کہ فلسفہ کو بھی لوگ پورا نہیں پڑھتے، صرف نام سے آشنا ہو کر فلسفی بن جاتے ہیں۔ یہ گفتگو تو ایسی چیز میں ہوئی جو قلیل الوقوع[3] ہے، بجلی بنانا ہر شخص کو نہیں آتا اس کا اگر غیر اختیاری ہونا ثابت بھی کر دیا جائے تو کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ یہ افعال غیر اختیاریہ کا ایک فرد ہوگا۔

اب ان افعال کو دیکھو جن کو آپ دن رات کرتے ہیں اور ان کی کثرت و تکرار[4] کی یہ نوبت ہے کہ ہر وقت ان پر نتیجہ کا ترتب دیکھ کر خیالوں میں عام طور سے یہ بات جم گئی ہے کہ یہ افعال ہمارے اختیار میں ہیں اور کبھی اس بات کی طرف وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ افعال ہمارے اختیاری نہیں ہیں۔ مثلاً ترکاری بازار سے لے آنا ایک کام ہے جو نہایت ادنیٰ درجہ کا اور معمولی کام ہے اور ہر روز کیا جاتا ہے اور اس معنی کو اختیاری بھی ہے کہ ہم چاہیں کریں نہ چاہیں نہ کریں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی اس درجہ کا اختیاری نہیں جس درجہ کا سمجھے ہو۔

---

[1] چلنا [2] بجلی کا وجود [3] جس کا وجود کم ہے [4] بار بار کرنے

بیان اس کا یہ ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں پہلے دماغ میں اس کا ایک خیال اور نقشہ آتا ہے۔ مثلاً جب ہم کو ترکاری لانا ہے تو پہلے دماغ میں اس کا نقشہ اس طرح آتا ہے کہ فلاں ترکاری لانا ہے اور وہ فلاں بازار میں ملے گی اور اس بازار کا فلاں فلاں رستہ ہے اور اتنی قیمت اس کے واسطے لے چلنا' یہ سب باتیں ذہن میں آنے کے بعد ترکاری لانے کا کام انجام پاتا ہے اس قسم کے کام صبح سے شام تک صدہا دفعہ ہوتے ہیں اور ہر انسان کرتا ہے اور کبھی یہ خیال بھی نہیں جاتا کہ ایک ایک کام کے لیے اتنے بکھیڑے ہوتے ہیں مگر خدا نے عقل دی ہے اس کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہو۔

ارادہ کے بعد کسی چیز کا ذہن میں آجانا اختیاری نہیں

سو میں پوچھتا ہوں کہ ان سب افعال میں کونسا فعل آپ نے کیا اور کونسا از خود ہو گیا۔ ان سب کاموں میں سے جو کام کسی قدر آپ کے اختیار سے ہوا وہ صرف ارادہ ہے باقی ارادہ سے پہلے اس کی طرف التفات اور نقشہ ذہن میں آنا اور جتنے بھی کام تھے وہ سب بلا آپ کے اختیار کے ہوئے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر دماغ میں کسی چیز کا آجانا اختیاری ہے تو چاہیے کہ جو چیز آدمی سوچے فوراً سوچ کر سمجھ لے حالانکہ بعض چیزیں مدتوں تک سوچنے کے بعد آتی ہیں۔ مؤجدین کے حالات آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان کا کام صرف یہ رکھا گیا ہے کہ سوچا کریں' برسوں سوچنے سے ایک کام کی ایجاد ہوتی ہے ان کی اختیاری اتنی بات تو ہے کہ سوچا کریں اور اگر دماغ میں آجانا ہی سوچنے والے کا کام ہے تو پندرہ برس کیوں لگائے اول ہی دفعہ میں کیوں دماغ میں نہ لے آیا اس واسطے آیت میں پوچھتے ہیں: "اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ"[1] (بھلا دیکھو جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔)

کھیت کا تیار ہونا یا پانی کا برسنا ہمارے اختیار میں نہیں

اس آیت میں کئی سوال ہیں اول کھیتی کے متعلق پوچھتے ہیں:

"ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ"[2] یعنی اس کھیتی کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں: "لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ

---

[1] سورۃ الواقعہ ۶۳ [2] (الواقعہ ۶۴)

مَحْرُوْمُوْنَ [1] " اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کریں یعنی اس میں دانہ ذرا بھی پیدا نہ ہو اور سب گھاس کوڑا ہی ہو جائے۔ پھر پانی کی نسبت فرماتے ہیں: اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ [2] " یعنی جو پانی دن رات پیتے ہو اسی کو بتاؤ کہ بادلوں میں سے تم اس کو اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں۔ اسی طرح آگ کی نسبت فرماتے ہیں: یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہم دن رات استعمال کرتے ہیں اور جن کو ہم اختیاری سمجھتے ہیں۔ یہ سوال اس بات پر مبنی ہے کہ اختیاری سمجھنا غلط ہے اور یہ قاعدہ کچھ افعال دنیوی تک ہی محدود نہیں بلکہ اعمال اخروی میں بھی یہی ہے کہ ہمارے اختیار میں ارادہ ہے اس پر عمل کا وجود پھر عمل کی غرض کا متفرع ہونا [3] یعنی جنت مل جانا ہمارے اختیار میں نہیں سوائے حق تعالیٰ کے فضل کے۔ اگرچہ یہاں محاورات میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب ایک شخص نے نوکری کی اور مہینہ بھر تک کارگزاری اچھی رہی تو اب اس کی تنخواہ کام لینے والے کے ذمہ ہو گئی مگر دنیا کے کاموں میں تو یہ حکم اس واسطے صحیح ہے کہ کارگزاری کرنے والے نے اپنے ارادہ اور قدرت سے کام کیا تھا اور جس کی نوکری کی تھی اس کے اختیار و قدرت کو اس کے فعل میں کوئی دخل نہیں اور اعمال آخرت میں ایسا نہیں ہے گو ہم بظاہر حق تعالیٰ کے اجیر ہیں اور کارگزاری کرنے پر اپنے خیال میں اجر مانگ سکتے ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آیا ہمارے اختیار کو ان اعمال میں مستقل دخل ہے یا وہ اختیار بھی کام لینے والے ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

سو گو بظاہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے اپنے اختیار سے اعمال کیے اور ہاتھ پیر ہمارے قبضہ میں ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ کا اعضاء کو کام میں لانا آپ کے ارادہ پر موقوف ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے ارادہ کرنے کے بعد اعضاء کام کرنے لگتے ہیں لیکن خود یہ ارادہ حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تو بعد قطع وسائط [4] کے یہی کہنا پڑے گا کہ آپ کے افعال حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اب آپ بتائیے کہ اگر ہم نے کچھ اعمال کیے جن کے بعد ہم جنت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں ان میں ہماری کارگزاری کیا ہوئی' اعمال بھی باری تعالیٰ کی طرف سے ہو گئے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور جنت بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ملے گی پھر ہمارا نام بیچ میں کیسے آیا یہ محض فضل ہے مگر غلطی سے ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال پر دخول جنت ضرور مرتب ہونا چاہیے اور نتیجہ ہمارے فعل کا اثر ہے۔

---

[1] الواقعہ ۶۵ [2] الواقعہ ۶۶' ۶۷ [3] اس پر مرتب ہونا [4] درمیانی چیزوں کو ختم کرنے کے بعد

اعمال کے غیر اختیاری ہونے کی مثال

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اعمال اور نتائج کا تعلق اچھی طرح واضح ہو جائے گا' دیکھئے گھڑی کے چلنے میں اتنا دخل آپ کا ضرور ہے کہ اس کو کوک دیں لیکن کوکنے کے بعد اس کو چلایا کس نے؟ یہ کوئی نہیں کہے گا کہ کوکنے والا چلا رہا ہے' کوکنے والے کا کام تو فنر کو اینٹھ دینا ہے اب چلا رہی ہے فنر کی طاقت۔

عشق من پیدا و معشوقم نہاں

(میری محبت تو نظر آتی ہے مگر محبوب چھپا ہوا ہے)

علی ہذا آپ کے افعال میں گو ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کر رہے ہیں مگر آپ کے تمام افعال کی انتہاء جا کر ارادہ پر ہوتی ہے اور ارادہ آپ کے قبضہ میں نہیں تو آپ کا کوئی فعل بھی آپ کے قبضہ میں نہیں' ارادہ ڈالنے والے کا تو پتہ نہیں چلتا پھر جن افعال کی یہ حالت ہو ان پر اجر کا مترتب ہونا کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ افعال کا نتیجہ ہے اور ان افعال کو اس میں دخل تام[1] ہے۔ حقیقت میں کچھ بھی نہیں بلکہ یہ سب کچھ بمشیت باری تعالیٰ[2] ہے۔ غرض اس تقریر سے یہ ثابت ہوگئی کہ اسباب کے بعد بھی مسبب کا ترتب بقبضہ خدا تعالیٰ ہے اور جمع اسباب کے بعد بھی نتیجہ کا وجود یقینی نہیں اور اس سے جبر کا شبہ نہ کیا جائے' اختیار کی نفی کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایسا اختیار عبد[4] کو نہیں جس کے استعمال کے بعد وہ اپنے کو مستحق معاوضہ سمجھے۔ خلاصہ یہ کہ اس تحقیق کا مقتضی[3] تو یہ تھا کہ ہم اعمال صالحہ کرنے کے بعد بھی دخول جنت کے امیدوار نہ ہو سکتے کیونکہ سبب اور مسبب میں لزوم کا علاقہ نہیں۔ چہ جائیکہ اعمال بھی نہ کریں اور اپنے آپ کو امیدوار کہیں۔ یہ بھی محض خدا تعالیٰ کا فضل اور محض عطاء ہی ہے کہ کچھ عمل ایسے بتلا دیئے جن کے بعد اجر کا وعدہ ہے حالانکہ اس میں اور اجر میں کوئی علاقہ نہیں کیونکہ کسی کو مزدوری دینے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ اس سے کوئی کام ایسا لیا جائے جس کی کام لینے والے کو ضرورت ہو۔ مثلاً مزدور سے چھت پر مٹی ڈلوائیں تو اس کی مزدوری اس واسطے دی جائے گی کہ اس نے ایسا کام کیا جس کی ہم کو ضرورت تھی اور

---

[1] مکمل دخل [2] اللہ تعالیٰ کے حکم [3] حاصل کرنے کا [4] بندہ

بعض وقت مزدوری یا انعام ایسے کام پر دیا جاتا ہے جس کی کام کرنے والے کو ضرورت تو نہیں لیکن وہ کام فی نفسہ اچھا ہے اور داد دینے کے قابل ہے جیسے کاریگر کوئی عمدہ چیز بنا کر امراء کے ہاں لے جاتے ہیں اور اس پر انعام ملتا ہے۔ اس صورت میں رئیس کو اس کی ضرورت تو نہیں تھی مگر وہ اچھی چیز ہے اس لیے انعام دے دیا تاکہ کاریگر کو ایسی ایجادات کا شوق بڑھے۔ حق تعالیٰ کے یہاں دونوں باتیں نہیں، حق تعالیٰ کو کسی کام کی ضرورت ہے اور نہ کسی عمل میں ایسی ذاتی خوبی ہے جس کو دکھانے کے لیے وہاں پیش کیا جائے۔ ہر چیز کا حسن و قبح حق تعالیٰ کے فرمانے پر ہے کسی چیز کو دربار خداوندی میں پیش کر کے اپنے کو کسی مزدوری یا انعام کا مستحق کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ غرض اس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی آدمی نیک اعمال کرے تب بھی اس کو ایک پیسہ کا بھی مستحق نہیں سمجھا جا سکتا مگر حق تعالیٰ کی عطاء ہے کہ بلا کسی وجہ کے چند کام بتلا دیئے کہ ایسا کرو ہم اتنا اجر دیں گے۔

اعمال اور نتیجہ کی مثال

اس کی مثال ایسی ہو گئی کہ ایک مزدور کو بلاویں اور یوں کہیں کہ تم بازار میں ٹہل آؤ، جتنے قدم جاؤ گے ہر قدم پر ایک روپیہ ملے گا۔ اس صورت میں کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ سلوک کرنا ہی منظور ہے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس مزدور کو کیا برتاؤ کرنا چاہیے، کام پورا کرنا چاہیے یا نہیں اور کام کرنے کے بعد کیا اس کا یہ منہ ہے کہ مزدوری کا تقاضا کرے۔ ہرگز نہیں اور اگر اس صورت میں وہ کام بھی نہ کرے تب تو اس کو مزدوری کی امید میں رہنا نری حماقت ہے اور اگر کام کرے تو پوری مزدوری مانگنا یا اس کی امید رکھنا یہ بھی غلطی ہے۔ اس مثال کو خوب یاد کر کے اپنا برتاؤ حق تعالیٰ کے ساتھ دیکھ لیجئے جن کاموں پر نام نہاد کے لیے اعمال کا نام لگا کر حق تعالیٰ نے اجر و ثواب کا وعدہ کر لیا ہے ان کو ہم کہاں تک پورا کرتے ہیں، ہرگز پورا نہیں کرتے لیکن اجر اور مزدوری کی امید بلکہ پوری سے بھی زیادہ لگا رکھی ہے۔

امید کے معنی میں غلطی

اور اس کا نام امید رکھا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ یہی وہ امید ہے جس کی نسبت حدیث میں ہے: "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ" (ایمان تو خوف اور امید کے درمیان ہے) اور

جس کی نسبت وارد ہے کہ ناامیدی کام شیطان کا ہے۔ صاحبو! ذرا غور سے کام لیجئے' دنیا کے کاموں میں بھی کہیں اس قسم کی امید رکھی ہوتی اور کسی کے یہاں بلا کام کیے یا کام کر کے پوری مزدوری مانگنے کو پہنچے ہوتے مگر دنیا کے کاموں میں تو بیوقوف سے بیوقوف اور پاگل کو بھی اس قسم کا خیال نہیں آ سکتا اور آخرت کے کاموں میں اچھے اچھے عقلاء بھی اس امید کو لیے بیٹھے ہیں اور لوگ ان کو عقلمند کہتے ہیں یہ حالت تو ان لوگوں کی ہے جو نرے دنیا کے عقلمند ہیں اور دین سے ان کو کم تعلق ہے۔

اجر آخرت کا مدار محض عمل پر نہیں

میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو واقعی دین دار ہیں اور امید کو صحیح معنی میں سمجھے ہوئے ہیں کہ آپ لوگ اپنے کاموں میں دنیا کے لیے کے گھنٹے دیتے ہیں اور آخرت کے لیے کے گھنٹے' اگر دنیا کے لیے دس گھنٹے دیتے ہوں گے تو آخرت کے لیے ایک ایک گھنٹہ بھی غالباً نہ ہوگا' اب اجر کا حساب لگائیے تو اگر دس گھنٹے کے پچاس روپے ملتے ہوں تب ایک گھنٹہ میں پانچ روپے ملنے چاہئیں لیکن پچاس روپے دس گھنٹے میں عام طور پر کہاں ملتے ہیں روپیہ دو روپیہ روز سے زیادہ دن رات میں بہت کم لوگوں کو ملتے ہوں گے۔ اس حساب سے ایک گھنٹہ کی اجرت کچھ پیسے ہی ہوں گے اور یہ بھی جب کہ ایک گھنٹہ خالص اللہ کے لیے چھوڑا گیا ہو حالانکہ ہم لوگ ایسا بھی نہیں کرتے جو گھنٹہ اللہ کے واسطے مقرر کرتے ہیں اس میں بھی دنیا کے قصوں میں دل پھنسا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر تمام عمر کا ثواب بروئے حساب جمع کر لو تو دس پندرہ روپے سے زیادہ نہ ہونا چاہیے مگر وہاں فضل کی یہ حالت ہے کہ ثواب کتنا ملے گا: "مَالاَ عَيْنٌ رَأتْ وَلاَ اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلاَ خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ" جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کان نے سنا' نہ کسی آدمی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔ دس پندرہ کی تو کوئی گنتی نہیں لاکھوں میں بھی شمار نہیں' کیفاً و کماً بے شمار اجر ملے گا کہ اتنے بڑے نتیجہ کا ترتب ان اعمال پر جن کا اجر حساب سے دس پندرہ روپیہ سے زیادہ نہ تھا' کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا اور عقل کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ یہ ہمارے عمل کا نتیجہ ہے بلکہ محض فضل خداوندی ہے۔

عمل پر اجر آخرت مترتب نہ ہونے کی وضاحت

سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عمل کے بعد بھی یہ نتیجہ حاصل ہو جائے تو بڑی بات ہے اور محض فضل ہے۔ چہ جائیکہ عمل بھی نہ کریں حق تعالیٰ نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس آیت میں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ.

(بیشک جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا تھا اس میں سے چپکے اور علانیتاً (اللہ کے راستہ میں) خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ٹھپ نہ ہوگا۔) اس میں یرجون کو مترتب فرمایا ہے۔ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وغیرہ پر، معنی یہ ہوئے کہ جن لوگوں میں اول ان چیزوں کا وجود ہوتا ہے اور اس کے بعد امید کا وجود ہوتا ہے ان کی تجارت سودمند ہوتی ہے اور اگر امید اس سے پہلے ہو تو دھوکہ ہے اور امید کے معنی میں غلطی ہے یہ بات ضرور شرعاً ثابت و مسلم ہے کہ امید بھی ایک عبادت ہے اور امر مطلوب ہے۔

امید کی صحیح حقیقت

مگر حقیقت اس کی جمع اسباب ہے بعد ازاں نتیجہ کی توقع، نہ کہ محض توقع بلا جمع اسباب[1] (بغیر اسباب اختیار کیے امید رکھنا) کیونکہ یہ تو خیالی باتیں ہیں۔

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت — دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

(جس نے برائی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اس نے بیوقوفی کی تدبیر کی اور بے کار خیال جمایا)

ایک دوسری آیت بھی اس طرز کی مدعا میں صریح ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُوْلٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَۃَ اللّٰہِ[1]

(حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اَلَا اِنَّ سِلْعَۃَ اللّٰہِ غَالِیَۃٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَۃَ اللّٰہِ ھِیَ الْجَنَّۃُ" سن لو حق تعالیٰ کا

---

[1] البقرہ ۲۱۸

سرمایہ بڑا گراں ہے سن لو کہ وہ سرمایہ جنت ہے پس جنت کی امید سے پہلے جنت کی قیمت بھی دیکھ لو جس کو اللہ اور رسول گراں فرمارہے ہیں جس کے سامنے دنیا و مافیہا کو ہیچ فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تمام دنیا سے جنت کی قیمت زیادہ ہے سوان ناتمام اعمال کو اس کی قیمت کیا سکتے ہیں ان اعمال پر اس کا مل جانا فضل ہی فضل ہے تو کیا ہم سے اتنا بھی نہ ہوگا کہ ان اعمال ہی کو ادا کرلیں۔ اتنی بڑی چیز کے واسطے جس کی قیمت تمام دنیا بھی نہیں ہوسکتی یہ اعمال کیا چیز ہیں ذرا غور اور انصاف کی ضرورت ہے۔ میری تقریر میں امید کے معنی کے متعلق غالباً شافی بیان ہوچکا' البتہ یہ بات قابل انکار نہیں کہ محض ایمان پر بھی امید کا ترتب ہوسکتا ہے مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس درجہ کی بنا ہوگی اسی درجہ کا مبنی ہوگا۔ یعنی نفس ایمان پر فلاح کی امید' اگرچہ کامل نہ ہو اور ایمان کامل یعنی مقرون بالاعمال[1] پر فلاح کامل کی امید۔ نکیر اس پر کیا جارہا ہے کہ بنا ضعیف پر کامل مبنی کی امید' خوب سمجھ لو۔

اب سمجھئے کہ ہر چند اس آیت میں تین ہی عمل کا بیان ہے۔ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ یعنی قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں اور اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز پڑھتے ہیں وَ اَنْفَقُوْا یعنی مال خرچ کرتے ہیں مگر درحقیقت اس میں اشارہ ہے تمام عبادات اور شرائع کی طرف۔ بیان اس کا یہ ہے کہ عبادات دو قسم کی ہیں مالی اور بدنی اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ میں اشارہ ہے عبادات بدنیہ کی طرف اور اَنْفَقُوْا میں اشارہ ہے عبادات مالیہ کی طرف اور نیز عبادات بدنیہ اور مالیہ دونوں دو قسم پر ہیں فرض اور نفل۔ آیت میں دونوں ہی داخل ہیں۔ دیکھئے نہ صلوٰۃ میں قید ہے فرض کی نہ انفاق میں۔

نوافل کی فضیلت اور ترغیب

اور نوافل کو میں نے عبادت میں تصریحاً اس لیے داخل کیا ہے کہ اکثر ذہنوں میں اس کی کچھ حقیقت نہیں حالانکہ یہ غلطی ہے۔ لوگ نفل کو ایک زائد چیز سمجھتے ہیں خاص کر اہل علم اس غلطی میں زیادہ مبتلا ہیں کیونکہ طالب علموں کو شروع سے نفل کا حکم یہ بتایا جاتا ہے کہ جس کے کرنے میں ثواب ہو اور نہ کرنے میں کچھ گناہ نہ ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ بات ہے تو نفل نہ کرنے میں کیا حرج ہے یہاں تک بھی غنیمت تھا۔

---

[1] وہ ایمان جس کے ساتھ اعمال بھی ہوں

اہل علم کی نفل کے بارے میں غلطی

مگر غضب یہ ہے کہ اس کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں یوں کرلیا کہ نفل کوئی مہتم بالشان نہیں' چلئے چھٹی ہوئی۔ گویا شریعت میں نوافل کا بیان ہی فضول ہے' خوب سمجھ لیجئے کہ نفل بیکار اور فضول چیز نہیں بلکہ متمم فرائض[1] ہونے کی وجہ سے ایک مہتم بالشان چیز ہے نیز ایک بڑی علامت ہے خاص محبت کی۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں فرض کرو ایک ملازم ہے جس کو کھانا پکانے کے واسطے رکھا گیا ہے اور وہ ایسا قانونی ہے کہ کھانا پکا کر چل دیتا ہے اور ایک دوسرا ملازم ہے کہ اسی کام کے لیے وہ بھی رکھا گیا ہے مگر اس کی یہ حالت ہے کہ جب کھانا پکا چکتا ہے تو آقا کو پنکھا جھلنے لگتا ہے اور بھی خدمت کر دیتا ہے۔ ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ ضرور فرق ہے دوسرے آدمی کی قدر آقا کے دل میں یقیناً زیادہ ہوگی بلکہ اس کی ان زائد خدمتوں کی قدر بعض دفعہ اصل کام سے بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ منصبی کام تو ضابطہ کی خانہ پری ہے اور نوکر سے زبردستی اور ٹھوک بجا کر لیا جاتا ہے اور یہ زائد خدمات محبت اور خلوص کی دلیل ہیں' محبت اور خلوص کا نتیجہ دوسرے کی طرف سے بھی محبت اور خلوص ہی ہوتا ہے تو اس دوسرے شخص سے آقا کو خاص محبت ہوگی اور بلفظ دیگر یہ دوسرا نوکر محبوب ہوگا اور پہلا آدمی نوکر اور مزدور ہوگا یہ حقیقت ہے نفل کی۔

پس اسی طرح جو شخص احکام شرعی میں سے صرف فرائض کو ادا کرے' پانچ وقت کے فرض ہی پڑھے اور زکوٰۃ بقدر واجب ہی دیدیا کرے اور کوئی نفل نماز نہ پڑھے نہ کوئی نفل خیر خیرات کرے تو وہ ضابطہ کا نوکر ہے اس سے ٹھوک بجا کر کام لیا جائے گا اور ذرا سا بھی قصور ہوگا تو گرفت سے نہ چھوڑا جائے گا اور کسی طرح یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کو حق تعالیٰ سے محبت ہے۔

کثرت نوافل علامت محبت ہے

صاحبو! محبت کی علامت سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ آدمی نفل طاعات کی کثرت کرے۔ پس نفل بھی اس مقصود کے لیے ضروری چیز ہوئی ہاں نوافل وفرائض کے درجات اس واسطے قائم کیے گئے ہیں کہ اگر کبھی دونوں میں تعارض آ پڑے تو نفل کو فرض کے سامنے

---

[1] نوافل سے فرائض مکمل ہوتے ہیں

ترک کر دیا جائے۔ مثلاً صبح کا وقت جا رہا ہو اور صرف اتنی گنجائش ہو کہ دو رکعت پڑھ لی جائیں تو اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ صبح کی چار رکعتوں میں سے دو فرض ہیں اور دو غیر فرض تو ممکن ہے کہ دو سنتوں کو پہلے پڑھے اور اتنے میں وقت نکل جائے اور فرض قضا ہو جاویں۔

اس واسطے علماء نے طاعات کے درجات کو مدوّن[1] کر دیا تا کہ ایسے وقت میں اول فرض کو ادا کیا جاوے اور قضا کرنے کے گناہ سے آدمی بچ جائے۔ کیا اس سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ سنت فجر کوئی چیز نہیں؟ سنت فجر وہ چیز ہے جس کے واسطے حکم ہے کہ اگر گھوڑے بھی تمہارے اوپر کو اتر جائیں تب بھی اس کو مت چھوڑو۔ اب تو سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ نوافل کس درجہ کی چیز ہیں۔ میں نے یہاں بہت مختصر طور سے نوافل پر کلام کیا ہے نوافل کے فضائل سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

نوافل میں سب سے افضل تلاوت قرآن ہے

اب معلوم کیجئے کہ نوافل میں سب سے زیادہ بڑھ کر تلاوت قرآن ہے اس طرح پر یَتۡلُوۡنَ کِتَابَ اللّٰہِ میں عبادت نفل کی طرف اشارہ ہو گیا اور اس میں سے تلاوت کو اس لیے خاص کیا کہ نوافل میں سے یہ ایک بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ کتاب اللہ کو پڑھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ حق تعالیٰ کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے جس کا راز یہ ہے کہ یہ طبعی بات ہے کہ آدمی کو اپنا کلام سننے سے مسرت ہوتی ہے سو حق تعالیٰ تأثر سے تو منزہ[2] ہیں لیکن انہوں نے اپنی رحمت سے ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرمایا ہے اور یہ کس قدر رحمت ہے بس جس طرح اگر ہماری تصنیف کردہ کوئی کتاب ہو اور اس کو کوئی پڑھے تو ہم کو اس کا سننا اچھا معلوم ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے ساتھ ہم کو ایک خاص محبت ہو جاتی ہے اسی طرح حق تعالیٰ کو تلاوت کے وقت قاری کی طرف خاص توجہ ہوتی ہے۔

حفاظ اور قراء کی فضیلت

یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حافظ و قاری حق تعالیٰ کے ہاں کس قدر محبوب و معزز ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے کلام کو پڑھنے والے اور اس کے محافظ ہیں۔ پھر جس شخص کے ساتھ حق تعالیٰ کو محبت ہو اس کی عظمت کیا ٹھکانا' ایک دنیا کا حاکم اگر کسی سے بات کر لیتا ہے تو اس کے

---

[1] بیان کیا گیا [2] پاک

دماغ آسمان پر پہنچ جاتے ہیں اور دیکھنے والوں کی نظر میں اس کی عظمت ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں یہ شخص حاکم کا منہ لگا ہوا ہے حالانکہ دنیا کیا اور اس کی حکومت ہی کیا؟ خدا تعالیٰ کی شان تو بہت ارفع[1] ہے سو جس شخص کی خدا تعالیٰ عظمت کریں اس کی عزت کا کیا ٹھکانا۔

صاحبو! سن لو اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حفظ قرآن کتنی بڑی دولت ہے اسی طرح قرأت گو حفظ سے نہ ہو' خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے۔ جس شخص کو حق تعالیٰ سے کلام کرنے کی دولت نصیب ہو سکتی ہو اس کو تو کسی طرح ایسے موقع سے چوکنا زیبا نہیں اور اگر چوک گیا تو بڑے خسارے میں رہا۔ دیکھو کتنے کتنے سفر قطع کرنے پڑتے ہیں اور کتنا مال صرف ہوتا ہے اور کتنا وقت لگتا ہے جب جا کر ایک ادنیٰ سے بادشاہ سے بات کرنا نصیب ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کے یہاں کسی وقت بندش نہیں کی۔

تلاوت قرآن حق تعالیٰ سے ہم کلامی ہے

جس وقت جی چاہے حق تعالیٰ سے بات چیت کر سکتا ہے پھر بادشاہوں سے بات چیت کرنے میں کس قدر بکھیڑے ہیں' ذرا سی کوتاہی رہ جائے تو اس کا نتیجہ ناخوشی ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں بلکہ کوئی شخص غلط بھی پڑھتا ہو تو اس کو رد نہیں کرتے' قاری تو قاری ہیں ہی' کوئی الثاسیدھا بھی پڑھے تو فی حرف دس نیکیوں کا وعدہ ہے۔

اٹک اٹک کر پڑھنے میں دوگنے ثواب کا وعدہ ہے

بلکہ یہاں تک بھی آیا ہے کہ جو شخص اٹک اٹک کر بھی پڑھے تو اس کے واسطے دوگنا ثواب ہے کیونکہ ایک تو پڑھنے کا ثواب' دوسرے اس مجاہدہ[2] کا ثواب کہ اس سے قرآن چلتا نہیں اور وہ نفس پر جبر کر کے پڑھے جاتا ہے اور اصل اس کی وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ قرآن بوجہ کلام حق ہونے کے حق تعالیٰ کو پسند ہے جس طرح آپ کا کوئی فارسی کا دیوان ہو اور ایک ان پڑھ اسے پڑھے جس سے اس کا تلفظ بھی صحیح نہ ہو سکے مگر اس کی یہی وقعت آپ کے ذہن میں ہو جاتی ہے کہ اس کو ہم سے محبت ہے اور ہمارے کلام کی قدر کرتا ہے۔ گو اس سے چلتا نہیں مگر بلا ذوق کے بھی پڑھ رہا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں قرآن کے

---

[1] بالا و برتر [2] محنت کوشش

پڑھنے والے کی عزت ہے یہاں سے تلاوت قرآن کی فضیلت سمجھ میں آ گئی ہوگی اور یہ اعتراض بھی رفع ہوگیا ہوگا جو آج کل تعلیم یافتوں کی زبان پر ہے جو بچوں کو قرآن نہیں پڑھواتے' کہتے ہیں طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ' پڑھنا تو وہ ہے جو معنی سمجھ کر ہو بچوں کو اتنی سمجھ نہیں' پھر پڑھنے سے کا کیا فائدہ۔

اس کا جواب کہ بچوں کو طوطے کی طرح قرآن رٹوانے سے کیا فائدہ؟

خدا رحم کرے اے معترض! میں پوچھتا ہوں فائدہ کسے کہتے ہیں؟ کیا سارا فائدہ سمجھنے میں منحصر ہیں ہرگز نہیں بلکہ سمجھنا بھی ایک فائدہ ہے اور مصنف کو خوش کرنا بھی ایک فائدہ ہے بلکہ سمجھنے کا اخیر انجام بھی مصنف کو خوش کرنا ہی ہے کیونکہ طاعت میں غرض خوشنودی حق تعالیٰ کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ ان سے پوچھنا چاہیے کہ سمجھ کر پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اس کا جواب شاید یہ دیں گے کہ سمجھ کر پڑھا جائے تو عمل ہوگا پھر ہم کہیں گے کہ عمل سے کیا فائدہ' اخیر میں دو گھنٹے کے بعد یا چار گھنٹے کے بعد یہی کہنا پڑے گا کہ اس سے حق تعالیٰ خوش ہوں گے۔

آپ نے اتنی دیر کے بعد یہ نتیجہ نکالا اور ہم نے شروع سے یہی بات کہی تھی۔ غرض جو ہم نے کہہ دیا وہی آپ کو کہنا پڑا' انجام تو آپ کا بھی وہی نکلا۔ حیرت کی بات ہے کہ شروع سے آپ کی سمجھ میں نہیں آیا اور گھوم گھام کر وہیں آئے کہ فائدہ کی حقیقت حق تعالیٰ کو خوش کرنا ہے۔

پس جبکہ ہم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کا ہر طرح پڑھنا خوشنودی کا موجب ہے پھر اس سوال کا کیا معنی کہ بلا سمجھے پڑھنے کا کیا فائدہ اور دیکھئے اقلیدس[1] مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے بعض طالب علموں کو اس سے مناسبت نہیں ہوتی اور بالکل نہیں سمجھتے مگر ایسا ہوا ہے کہ امتحان میں اقلیدس کے پرچہ میں وہی عبارت لکھ دی جو بلا سمجھے رٹ لی تھی اور پاس ہوگیا۔ تعجب کی بات ہے کہ اقلیدس کی عبارت کا رٹنا تو مفید ہو اور کتاب اللہ کا رٹنا مفید نہ ہو اور اس کی نسبت یہ کہا جائے کہ طوطے کی طرح رٹنا دماغ کو خراب کرنا ہے۔ صاحبو! اپنے دماغ کو درست کیجئے کہ یہ باتیں خلل دماغ کی ہیں یا نہیں یہ تو ضابطہ کی تقریر تھی۔

---

[1] جیومیٹری کی ایک پرانی کتاب

اہل درد کے لیے دوسرا جواب

اب دوسرے طریق سے خاص ان کو خطاب کیا جاتا ہے جو اہل درد ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کا نام کسی عوض ملنے کے واسطے لیتے ہو۔ اگر کسی فائدہ کی تلاش ہے تو اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ محبوب کو خوش کر رہے ہو جو لوگ اہل درد نہیں وہ اگر حق تعالیٰ کو خوش بھی کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ ہم کو کچھ ملے گا اگر آپ کو بھی کچھ ملنے ہی کی خواہش ہے تو گویا آپ کے یہاں بھی سارا دھندا پیٹ ہی کے واسطے ہے پھر اس حالت میں بندگی کا کیوں دعویٰ کرتے ہو۔ بس آج سے بندہ خدا ہونے کا نام نہ لیجئے' اپنے کو بندہ شکم[1] کہئے۔

یہ تو مطلق عوض[2] کے انتظار میں کلام تھا مگر آج کل تو اس سے بڑھ کر مذاق عام ہو گیا ہے کہ فائدہ و عوض کو بھی منحصر رکھا ہے' محض مال کے ملنے میں۔ کسب دنیا تو مال کے لیے تھا ہی مگر اب خدا کا نام بھی مال کے لیے ہو گیا اور جن لوگوں سے آپ نے یہ مذاق سیکھا ہے ان میں پھر بھی کچھ انصاف اور حقیقت شناسی کا مادہ موجود ہے اور اچھی بات کی قدر کرتے ہیں۔ ایک انگریز جنٹ سے انہی کی درخواست پر میری ملاقاتی ہوئی تھی انہوں نے سنا تھا کہ میں نے ایک تفسیر لکھی ہے' پوچھا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے (شریف بھی کہا) میں نے کہا ہاں' کہا آپ کو کتنا روپیہ ملا؟ میں نے کہا ایک پیسہ بھی نہیں' کہا پھر کیا فائدہ ہوا اس کتاب کے لکھنے سے' میں نے کہا مجھ کو دو قسم کے فائدے ہوئے' ایک دنیا کا اور ایک آخرت کا' دنیا کا تو یہ کہ قوم کے ہاتھ میں ان کے کام کی کتاب آ گئی جس کا دیکھنا ان کے لیے موجب حظ[3] ہو گیا اور اس کو دیکھ کر میں مسرور ہوں گا اور آخرت کا فائدہ وہ ہے جس کو خوشنودی حکام کہتے ہیں اس کام سے سب حکام کے حاکم یعنی احکم الحاکمین کی خوشنودی کی امید ہے یعنی خدا تعالیٰ کی خوشنودی' اس بات سے اس پر بڑا اثر ہوا اور اس بات کی اس نے بہت قدر کی۔

دیکھئے جو دنیا طلبی میں امام ہیں ان کے نزدیک اچھی بات کی پھر بھی قدر ہے اور جو ان کے مقلد ہیں ان کے نزدیک قرآن کا پڑھنا طوطے کی طرح رٹنا اور فضول ہے۔ افسوس لوگوں نے دین کو تو بہت دور ہی پھینک دیا ہے' دین کا فائدہ تو فائدہ کے افراد ہی میں سے

---

[1] پیٹ کا بندہ [2] عام بدلہ [3] لطف کا باعث ہوگا

نہیں رہا[1] اور غیر قوموں کو دیکھئے کہ ان کو اپنے مذہب کی کتنی قدر ہے وہ مذہب کے لیے کتنی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ باطل ہے۔ اگر مسلمان ان سے آدھی بھی کوشش کریں تو بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے کیونکہ وہ اپنی کوششوں سے ایک باطل بات کو حق کرنا چاہتے ہیں جو کبھی نہیں ہوسکتی اور مسلمان اگر کوشش کریں تو وہ کوشش حق کے لیے ہوگی۔

دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ایک مردہ لاش کو کھڑا کرنے کی کوشش کرے وہ اگر بہت کوشش کرے گا اور دوسروں کو ساتھ ملالے گا تو اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ وہ لاش درخت کے تنے کی طرح کھڑی ہوجائے گی لیکن جس وقت ذرا اس سے ہاتھ ہٹے گا فوراً گر جائے گی' برخلاف اس کے کہ ایک دوسرا شخص ہے کہ وہ ایک زندہ اور تندرست شخص کو بیٹھے یا لیٹے سے کھڑا کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ذرا سہارے کی ضرورت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین مردہ ہوگیا۔ صاحبو! دین نہ کبھی مردہ ہوا نہ مردہ ہے' نہ مردہ ہوگا' ہاں کبھی وہ خود اپنے خدام و اعوان[2] کا امتحان لینے کے لیے بیٹھا یا لیٹا بن جاتا ہے اس کے لیے ذرا سے سہارے کی ضرورت ہے وہ خود اپنی قوت سے کھڑا ہوجائے گا نہ کہ آپ کی قوت سے۔ البتہ کھڑا ہوگا آپ کا امتحان لینے کے بعد جو جو شخص اس کی مدد کرے گا وہ اپنے واسطے کامیابی حاصل کرے گا نہ کہ اس پر کچھ احسان ہوگا کیونکہ وہ محتاج نہیں' اس بہانہ سے تم کو فائدہ پہنچانا منظور ہے۔

مگر اب تو مصیبت ہے کہ سب کا مذاق روپیہ میں منحصر ہوگیا ہے' خدا تعالیٰ کے کام کو بھی مفید جب ہی کہا جاتا ہے جب روپیہ ملے۔

ایک اہلکار نمازی کا قصہ

ایک عہدیدار شخص بے نمازی تھا اور بیوی اس کی نمازی تھی' بیوی سے کہنے لگا تو اتنے دنوں سے نماز پڑھتی ہے تجھ کو کیا فائدہ ہوا؟ کون سی دولت مل گئی؟ گویا فائدہ دولت اور روپیہ ہی کا نام ہے جیسے ایک صاحب کو یہ فائدہ بھی ملا کرتا تھا ایک اہلکار ایسے پکے نمازی تھے کہ صبح کی نماز پڑھ کر اشراق تک مصلی پر بیٹھے رہتے اور کسی سے نہ بولتے کیونکہ پیر صاحب نے وظیفہ میں بولنے کو منع کردیا تھا۔ اہل مقدمہ اسی وقت میں آتے اور رشوتیں پیش کرتے' یہ

---

[1] یعنی یہ دنیا دار اس کو فائدہ ہی نہیں سمجھتے [2] مددگار

زبان سے تو کچھ نہ کہتے کیونکہ وظیفہ میں خلل پڑے گا' انگلیوں سے اشارہ کرتے' دوسولوں گا یا پانچ سولوں گا' لوگ کہتے سو لے لیجئے' یہ اشارہ سے کہتے نہیں اور دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ دوسو ہی لوں گا۔ اہل غرض مجبور ہو کر وہی دے دیتے پھر آپ اشارہ کرتے کہ مصلی کے نیچے رکھ دو' بس ان لوگوں کے نزدیک یہ ہے فائدہ' بس اب تو روپیہ ہی کچھ چیز رہ گیا ہے اس کے سامنے نہ حرام کچھ ہے نہ خبیث کوئی چیز ہے' بس جس طرح ہو سکے روپیہ آنا چاہیے۔ نماز بھی جب ہی پڑھیں گے جب روپیہ کی امید ہو۔

سودا شاعر اور ان کی بیوی کا قصہ

سودا شاعر کی بیوی نمازی تھی' سودا نے کہا کہ تو نماز کیوں پڑھا کرتی ہے تجھے اس سے کیا ملتا ہے؟ اس نے کہا ہمیں جنت ملے گی' کہنے لگا جا بیوقوف تو وہاں بھی ان غریب' مسکین' ملانوں کے ساتھ ہی رہے گی اور ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے سلاطین اور امراء ورؤساء (بادشاہ اور حکام) ہوں گے جیسے فرعون' ہامان' شداد' نمرود' قارون وغیرہ۔

اس مسخرہ نے شاید یہ سمجھا کہ مساکین جنت میں جا کر بھی مساکین ہی ہوں گے اور یہ سلاطین دوزخ میں بھی بادشاہ ہی رہیں گے حالانکہ مساکین جنت میں بادشاہی کریں گے اور سلاطین' دوزخ میں بھنگی چماروں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ خیر یہ تو ایمان کے خلاف باتیں ہیں ایسے خیال کے تو سب مسلمان نہیں ہوتے مگر شکایت اتنی ضرور ہے کہ بدون مال کے کسی فائدہ کو آج کل فائدہ ہی نہیں سمجھتے۔ حق تعالیٰ سے بھی مال ہی کے واسطے تعلق رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ کے ساتھ وہ تعلق ہونا چاہیے جو اور کسی کے ساتھ نہ ہو سکے' دینے لینے کا تعلق تو انسانوں سے بھی رکھا جاتا ہے کہ جس نے چار پیسے دیئے اس کا کام کر دیا اگر یہی تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بھی رکھا تو خدا اور بندے میں تم نے کیا فرق کیا' گو حق تعالیٰ بہت کچھ دیں گے لیکن بندہ کو بحیثیت بندہ ہونے کے حق تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے۔

غلام کو کیا حق حاصل ہے کہ آقا سے اپنی خدمت پر کچھ معاوضہ کا مطالبہ کرے؟ حق تعالیٰ کو تو یہ حق حاصل تھا کہ بندہ سے سب کچھ لے کر اس کا مال اور اولاد سب چیزیں لے کر بھی ایک سجدہ کی اجازت دے دیتے تو غنیمت تھا نہ کہ اور اپنے پاس سے دے کر اور وہ بھی کیا

چیز دے کر جس کے ایک ادنیٰ سے جزو کی قیمت دنیا و مافیہا نہیں ہو سکتی' سجدہ کا مطالبہ فرماتے ہیں' واللہ مر جانے کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم کو محبت نہیں ورنہ خدا تعالیٰ کا نام لینے کو باعث فخر اور خوبی سمجھتے۔ یہ وہی بات ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک' اس نے کہا کہ میری آنکھیں پھوڑ دیں' تلاوت قرآن حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے اگر کچھ پاس سے دے کر بھی اس کی اجازت ہو جاتی تو غنیمت تھا نہ کہ لوگ پوچھتے ہیں کیا ملے گا؟ اچھا ملنے کی بھی سن لیجئے۔

تلاوت قرآن کا ثواب

حدیث شریف میں وعدہ آیا ہے: "بِكُلِّ حَرْفٍ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا" یعنی ایک ایک حرف پڑھنے پر ایک ایک نیکی ملے گی اور نیکی کا عوض دس گنا ملتا ہے' دیکھئے کس قدر اجر ہے اب تو فائدہ بھی معلوم ہو گیا اور فائدہ بھی کیسا بے حد و بے حساب کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت پڑھئے تو اتنا ثواب ہو جائے کہ اٹھائے نہ اٹھے۔

ہاں شاید کوئی یہ کہے کہ نیکی لے کر کیا کریں گے اور نیکی سے کیا فائدہ؟ (کیونکہ فائدہ یہ تو آج کل روپیہ میں منحصر ہے) صاحبو! نیکی کا فائدہ وہاں معلوم ہو گا جہاں آپ کا یہ روپیہ پیسا نہیں چلتا بلکہ وہاں نیکی ہی کا سکہ چلتا ہے شاید ابھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

میں اس کی شرح کیے دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کو مزدوری میں ایک سکہ دوسرے ملک کا دیا جائے جس کو یہ پہچانتا بھی نہیں اور اس کے ملک میں وہ سکہ چلتا بھی نہیں۔ ہاں وہ اس ملک کا سکہ ہے جہاں اس کو قریب ہی جانا ہے تو کیا وہ سکہ دے دینا' یہ اجرت دینا نہیں ہے اور اگر وہ مزدور یہ کہے کہ اس ملک کا سکہ کیوں نہیں دیا؟ اور وہ یہ جواب دے کہ بیوقوف تجھے فلاں شہر میں جانا پڑے گا یہ سکہ تجھے وہاں کام دے گا تو یہ کہنا اس کا بجا ہے یا بیجا؟ اور اس صورت میں اتنا اور فرض کر لیجئے کہ اس ملک میں جہاں اس مزدور نے اس وقت کام کیا ہے اس کو چند منٹ ہی رہنا ہے اور اس دوسرے ملک میں جس کی تیاری ہے مدتوں رہنا ہو گا۔ اگر اس حالت میں اس نے دوسرے ملک کے سکہ کو منظور نہ کیا اور اسی ملک کے سکے ساتھ لے لیے تو چاہے گدھا بھر بوجھ بھی باندھ کر کیوں نہ لے جائے وہ وہاں کچھ کار آمد نہ ہوں گے اور وہاں جا کر یہ بھوکوں ہی مرے گا اور بوجھ میں مفت مرا' یہ الگ رہا۔

دنیا کا سکہ اموال ہیں اور آخرت کا سکہ اعمال

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایک تو ملک دنیا کا ہے اور دوسرا ملک آخرت کا ہے۔ دنیا کا سکہ اموال ہیں اور آخرت کا سکہ اعمال ہیں جس کا ترجمہ نیکی ہے۔ جس کے پاس نیکی نہیں ہے وہ وہاں مفلس اور بے کس اور بے بس ہے۔ چاہے اموال اس کے پاس قارون سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ وہاں جا کر اس کی قدر معلوم ہوگی کہ نیکی سے کیا فائدہ؟ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ ایک ایک نیکی کے بدلے جنت سے اٹک جاویں گے اور نجات نہ ہو سکے گی۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص ہوگا جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، حکم ہوگا رہائی چاہتے ہو تو جس طرح ہو سکے نیکیوں کا پلہ بھاری کرو، اگر ایک نیکی بھی اور ہو جائے تو پلہ بھاری ہو سکتا ہے۔ وہ بیچارہ اہل محشر سے اپنے شناساؤں سے اور اعزاء و اقارب سے اور جس سے بھی ہو سکے گا سوال کرے گا لیکن کہیں سے بھی سوائے نفی کے جواب نہ ملے گا کیونکہ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ ہر شخص کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید ہمارے حساب میں بھی ایک نیکی کی کمی ہو جاوے اور اس کی بدولت ہم اٹکے پڑے رہیں۔ غرض کوئی نہ دے گا لیکن ایک شخص ایسا ہوگا جس کے پاس تمام برائیاں ہی برائیاں ہوں گی اور نیکی صرف ایک ہوگی وہ کہے گا کہ بھائی جب تو اتنی نیکیاں کر کے صرف ایک نیکی کی کمی کی وجہ سے جنت میں جانے سے روک دیا گیا تو میرے پاس تو بجز ایک نیکی کے سب بدیاں ہی بدیاں ہیں میں تو دوزخ میں یقیناً ہی جاؤں گا کیونکہ ایک نیکی میری اتنی برائیوں کا کہاں تک مقابلہ کرے گی۔ لہٰذا مجھ سے تو یہ بیکار ہی ہے، لے تو ہی لے جا، میرا نہ سہی تیرا ہی کام بن جائے، بس اس ایک نیکی سے حسنات[1] کو غلبہ ہو جائے گا۔

اب رحمت الٰہی دیکھئے کہ اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے یہ نیکی دی تھی اور اس سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنی نیکی دوسروں کو کیوں دیدی، اب تمہارے پاس تو بجز گناہوں کے کچھ بھی نہ رہا، وہ کہے گا کہ الٰہی میں نے یہ دیکھ کر کہ ایک شخص کے پاس ہزاروں نیکیاں تھیں مگر ایک کی کمی کی وجہ سے وہ جنت میں نہ جا سکا، یہ سمجھ لیا کہ میرے پاس تو ایک ہی نیکی ہے

---

[1] نیکیوں

قانون کے موافق میری مغفرت نہیں ہو سکتی اس لیے میں نے دوسرے کو اپنی نیکی دیدی کہ وہ تو بخش دیا جائے' حکم ہوگا کہ ہم نے تجھ کو بھی بخشا۔ اس کو قانون سے بخشا اور تجھ کو فضل سے بخشا' تو نے اس شخص پر رحم کیا ہم نے تجھ پر رحم کیا۔

نیکی کی قدر وہاں ہوگی۔ صاحبو! نیکی وہاں کا سکہ ہے تو وہیں چلے گا بھی اور ایسے وقت میں کام دے گا جب کہ کوئی سکہ بھی کام نہ دے گا۔ لفظ اَلْحَمْدُ میں پانچ حرف ہیں' اتنا چھوٹا سا لفظ پڑھنے سے پانچ نیکیاں ملتی ہیں پھر ان پانچ کی پچاس ہو جاتی ہیں' سو وہ فائدہ یہ ہے۔ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تلاوت قرآن کا فائدہ کچھ معانی سمجھنے ہی میں منحصر نہیں جیسا کہ آپ نے سمجھ رکھا ہے اور اگر منحصر ہے بھی تو معنی سمجھنے سے کس نے منع کیا ہے؟ عربی پڑھو اور سمجھو۔ ہم یہ کب کہتے ہیں کہ تم صرف طوطے ہی کی طرح پڑھو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح بھی پڑھو اور سمجھ کر بھی پڑھو۔

بعض لوگ قرآن کی تعلیم بالکل اڑانا چاہتے ہیں

افسوس تو یہ ہے کہ جو لوگ بچوں کو قرآن پڑھنے پر اعتراض کرتے ہیں ان لوگوں کی نیت طوطے کی طرح رٹنے سے منع کرنے میں یہ نہیں کہ سمجھنے کی کوشش کرو بلکہ مطلقاً قرآن کی تعلیم کو اڑانا مقصود ہے۔ ریاست رام پور میں کسی کا لڑکا قرآن پڑھتا تھا' دوسرے شخص نے کہا تم اپنے بچے کو انگریزی اسکول میں داخل نہیں کرتے؟ اس نے کہا قرآن پڑھ لے تو داخل کر دوں گا۔ پوچھا کتنا قرآن رہا ہے؟ کہا آدھا رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میاں اتنے دن تو خراب ہوئے' اگلے دن بھی کیوں خراب کرتے ہو (نعوذ باللہ منہ) بھلا یہ کیا اسلام ہے کہ ایک شخص مسلمان کہلا کر قرآن کی تعلیم میں مشغول ہونے کو وقت کا خراب کرنا بتلائے؟ یہ کتنا سخت کلمہ ہے جس سے ایمان کی جڑ ہی کھوکھلی ہوئی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے بھتیجوں کو کیا پڑھایا؟ میں نے کہا ایک میرے پاس علم دین پڑھتا ہے' باقی اپنے والد کے پاس ہیں وہ انگریزی میں مشغول ہیں' کہنے لگے اس ایک کے واسطے آپ نے ترقی کی فکر نہیں کی؟ آپ کے بھائی تو بڑے صاحب استطاعت ہیں۔ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلا سکتے ہیں اور عربی پڑھنے کے لیے تو

دیوبند کے طالب علم کافی ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ آپ لوگوں نے زبانی دعووں سے تو ہمدردی کا بڑا غل مچا رکھا ہے مگر قوم کے ساتھ یہ کیسی آپ کی ہمدردی ہے کہ غریبوں کے لیے تو آپ ترقی نہیں چاہتے' وہ تو دیوبند میں ادنیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور امیروں کے لیے ترقی چاہتے ہیں' کیا دیوبند کے طالب علم قوم میں نہیں؟ اگر ترقی اچھی چیز ہے تو دیوبند کے طالب علموں کے متعلق بھی آپ نے یہی رائے کیوں نہیں دی کہ علم دین چھوڑ کر وہ بھی ترقی کی فکر میں رہیں اور اگر ترقی بری چیز ہے تو میرے بھتیجے کے لیے کیوں پسند کی جاتی ہے۔

مپسند بر دیگر کساں چیزے کہ داری ناپسند

(دوسروں کے لیے وہ چیز پسند نہ کرو جسے خود ناپسند کرتے ہو)

یہ کیا انصاف ہے کہ آپ کے نزدیک پستی کے لیے تو دیوبند کے طالب علم رہ گئے ہیں اور عیش و آسائش کے لیے آپ لوگ

افسوس عقل اور ہمدردی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کی رائے اس کے برعکس ہوتی کیونکہ جن لوگوں کو (جیسے کہ آپ) دنیا بقدر ضرورت حاصل ہے ان کو علم دین میں زیادہ حصہ لینا چاہیے تھا کیونکہ دنیا تو حاصل ہی ہے اور جن کے پاس دنیا بقدر ضرورت بھی نہیں (جیسے دیوبند کے طالب علم) ان کو ترقی دنیا کی ضرورت تھی مگر ان کے لیے آپ یہ رائے دیتے ہیں کہ وہ ترقی نہ کریں پس آپ ہی ترقی کرتے رہیں آپ کے لیے علم دین کی کچھ ضرورت نہیں؟ کیوں صاحب اس کے لیے دیوبند کے طالب علم ہی کیوں کافی ہیں' کیا دین فقط ان ہی کا ہے آپ کا دین نہیں؟ آپ کے ذمہ دین کا کوئی حق نہیں؟ مجھے سمجھائیے تو کہ اس جملہ کا کیا مطلب ہے کہ عربی پڑھنے کے لیے دیوبند کے طالب علم بہت کافی ہیں بس اس کا کچھ جواب نہ تھا' یہ عجیب رائے ہے۔

افسوس! امراء کو دین سے ایسا بعد[1] ہو گیا ہے کہ دین میں کچھ بھی حصہ لینا نہیں چاہتے حالانکہ دین مسلمانوں کی مشترکہ جائیداد ہے مگر انہوں نے اس میں سے اپنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ پس سہارنپور اور دیوبند کے مولوی ہی سب لے لیں۔ ان کے نزدیک دین تو ملانوں ہی کا ہے۔ گویا یہ لوگ دین کو اپنا نہیں سمجھتے مگر مہربانی کر کے یہ لوگ اس کا بھی وعدہ کر لیں کہ جب جنت سامنے آئے گی تو اس کو بھی خالص مولویوں کے لیے ہی چھوڑ دیں گے مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر تعجب ہے کہ جنت کے لیے تو مدعی بنتے ہیں اور اسباب جنت مولویوں کے حوالہ کرتے ہیں۔

---

[1] دوری

اور اگر کوئی شخص ایسا دلیر ہو جو کہ منہ پھاڑ کر یہ بھی کہہ دے کہ صاحب مجھے جنت میں جانا بھی منظور نہیں تو اس سے ہم اس طرح خطاب نہیں کریں گے کیونکہ وہ تو مسلمانوں کی قوم سے خارج ہے۔ اس سے ہم دوسری طرح خطاب کریں گے کیونکہ اس کو تو جنت و نار کے وجود ہی میں شک ہے باقی جس کو جنت دوزخ کے وجود کا یقین ہو وہ ہرگز یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مجھے جنت لینا منظور نہیں' دوزخ ہی منظور ہے ایک انگارا بدن پر گر جائے تو میاں ناچنے لگیں گے اور جہنم میں جانا منظور کرتے ہیں۔ ہاں جنت و نار[1] کے وجود ہی میں شک ہو تو جتنی چاہو باتیں بنالو مگر ایسا شخص تو مسلمان ہی نہیں' اس کو تو اول مسلمان بنانا چاہیے جب وہ جنت و نار کا یقین کر کے ہمارے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔ پھر اس کے سامنے وہی بات کی جائے گی جو اوپر بیان ہوئی کہ جنت و نار کے ماننے کے بعد یہ کیسے جائز ہے کہ اس کے موجبات کو اختیار نہ کیا جاوے۔

بات یہ ہے کہ لوگوں میں دین کا شوق نہیں اور کسی کو ہے بھی تو ایک غلطی کے ساتھ' وہ یہ کہ علم حاصل نہیں کرتے' بڑی دوڑ یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ دیکھ لیا کیونکہ قرآن ہی اصل الاصول دین کا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا کسی فن کی اعلیٰ درجہ کی کتاب کا لفظی ترجمہ دیکھنے سے وہ فن آجاتا ہے؟ ڈاکٹری یا طب تو اس طرح حاصل کر لیجئے ہم جب جانیں' پھر ترجموں میں سے بھی کون سے ترجمے انتخاب کیے ہیں وہ نئے ترجمے جو واقع میں ترجمے نہیں بلکہ تحریف ہیں اور اگر ان سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ دین سے منع کرتے ہیں' اچھے اچھے سمجھدار لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں میاں ترجمہ دیکھنے دو آخر تو قرآن ہی کا ترجمہ ہے' کچھ دین کا فائدہ ہوگا اور یہ نئے ترجمے نئی عبارت کی وجہ سے ذرا دلچسپ ہیں ان کو لوگ شوق سے دیکھ لیتے ہیں تو ان سے کیوں روکتے ہو ان کی دلچسپی ذریعہ ہے دین سے لگاؤ پیدا ہونے کا۔

میں کہتا ہوں بددینی کو دین کا ذریعہ بنانا کیسا جائز ہے؟ دیکھئے اگر کوئی شخص مسجد میں ناچ کرائے اس خیال سے کہ اسی کے ذریعے سے لوگ جمع ہو جائیں گے تو کیا یہ جائز ہے؟ آج کل کے تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ جب سے یہ نئے ترجمے ہوئے ہیں لوگ قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے لگے ہیں' پہلے تو کوئی ترجمہ جانتا بھی نہ تھا۔

---

[1] جہنم

غلط ترجمے پڑھنا بڑا گناہ ہے

میں کہتا ہوں ناچ کرانے اور غلط ترجمہ پڑھنے میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی گناہ ہے اور یہ بھی گناہ۔ لہٰذا اس کا فتویٰ دیجئے کہ مسجد وغیرہ میں پانچوں وقت ناچ ہوا کرے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لوگ آ تو جایا کریں گے جیسے کہ غلط ترجموں سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگ ترجمہ دیکھنے تو لگے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ ناچ کو جس چیز کا ذریعہ بنایا وہ دین تو ہے یعنی نماز اور غلط ترجمہ جس چیز کا ذریعہ بنا ہے وہ تو دین ہی نہیں یعنی عقائد فاسدہ اور علوم ضارہ۔[1]

علم دین کوئی کھیل نہیں ہے

خوب سمجھ لیجئے کہ علم دین کوئی کھیل نہیں جو تحصیلداری یا ڈپٹی کلکٹری پاس کرنے سے ترجمہ وتفسیر کا حق حاصل ہو جائے پھر ایسے لوگوں کو دین میں ہاتھ ڈالنے کا کیا حق ہے اور ان کے ترجمے کیونکر معتبر ہو سکتے ہیں۔ صاحبو! دین کے لیے تو محض دین کا ہو کر پچاس پچاس برس محنت کی جائے تب جا کر کہیں حاصل ہوتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یہ نہیں ہے کہ جو چہرہ دھولے وہ خوبصورت بن جائے اور جو آئینہ رکھ لے وہ سکندر بن جائے)

کیا غضب ہے کہ ہر کام کے لیے تو اس کا ماہر تلاش کیا جاتا ہے ایک چارپائی کا ڈھانچہ بھی درست کرانا ہو تو اس بڑھئی کو تلاش کیا جاتا ہے جو اس کام کا مشاق اور مشہور ہو اور دین کے لیے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ عالم دین ہو اور کتابیں پڑھی ہوں۔ بس اس کے لیے انگریزی پڑھنے والے اور ڈپٹی کلکٹری کرنے والے بھی کافی ہیں اور غضب ہے کہ ان کے قول کو ماہرین کے قول پر ترجیح دی جاتی ہے اور یہ شخص علماء کی غلطی نکالنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور احکام خداوندی میں اپنی رائے سے ترمیم کرتا ہے۔

بھلا انصاف سے کہئے کہ میں اگر فن زراعت میں غلطی نکالوں تو یہ خلل دماغ ہوگا یا نہیں؟ پھر علم دین نہ جاننے والے علماء کی رائے میں غلطی کیسے نکالتے ہیں؟ آج کل تو تعلیم کا بڑا چرچا ہے ہر کام کی تعلیم دی جاتی ہے ایک انجن کی ڈرائیوری بلا تعلیم نہیں ملتی۔ حیرت کی بات ہے کہ ان معمولی کاموں کیلئے تو لیاقت کی ضرورت ہو اور خدائی پارلیمنٹ کا ممبر بننے کیلئے کسی لیاقت کی ضرورت نہ ہو آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ حوصلہ بڑھایئے لیکن حد کے اندر۔

---

[1] یعنی غلط عقائد اور نقصان دہ علوم

اس کا جواب کہ سود کیوں حرام ہے

مجھ سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ سود کیوں حرام ہے؟ میں نے کہا اس واسطے کہ حق تعالیٰ نے اس کو حرام کیا ہے' کہا حق تعالیٰ نے کیوں حرام کیا ہے؟ میں نے کہا میں اس وقت مشورہ میں شریک نہ تھا' جو وجہ پوچھتا اور اگر شریک ہوتا تب بھی یہی کہتا جو آپ لوگ حکام کے مشوروں میں دن رات کہا کرتے ہیں کہ جو حضور کی رائے ہو شاید یہ بھی کہہ دیتا کہ مسلمانوں پر ایک وقت افلاس کا آنے والا ہے۔ لہٰذا اس کو حرام نہ کیجئے مگر مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ حکم خداوندی حکمت سے خالی تو ہوگا نہیں' وہ حکمت معلوم ہونا چاہیے۔ میں نے کہا حکمت ضرور ہے مگر میں بیان سے معذور ہوں کیونکہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی' کہنے لگے بیان تو کیجئے میری سمجھ میں آوے یا نہ آوے۔ میں نے کہا میرے پاس ایسا فالتو دماغ نہیں۔ ہاں اس کی ایک صورت ہے کہ کسی سمجھ دار طالب علم کو میرے پاس لے آئیے جو کم از کم ہدایہ پڑھتا ہو۔ وہ مجھ سے یہی سوال کرے تو میں حکمت بتلا دوں گا' آپ بھی سن لیں۔ اس صورت میں میرا وقت بیکار میں تو ضائع نہ ہوگا کیونکہ مخاطب صحیح سامنے ہوگا' اس وقت آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں ضرور ہیں اور یہ بھی تجربہ ہو جائے گا کہ آپ ان حکمتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں۔

افسوس آج کل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ مسئلہ پوچھتے ہیں' محض اس خیال سے کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کو کر دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ریفارمر[1] سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے ہی نہیں بلکہ از خود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں' گویا دین ان کے گھر کا قانون ہے جو چاہا بنا دیا۔

ایک شخص نے ربٰوا کو ربودن سے مشتق کیا

اور لیاقتوں کی یہ حالت ہے کہ ایک مصنف صاحب نے حرم الربٰوا کی یہ کتر بیونت کی کہ ربٰوا (بضم راء) کہا اور اس کے معنی ربودن سے مشتق کر کے اچکنے کے لیے اور کہہ دیا کہ قرآن میں کہیں سود کی حرمت ہے ہی نہیں۔ اس آیت میں تو غصب کی حرمت ہے اور راء کے کسرہ کو

---

[1] مصلح [2] پاک

مولویوں کی گھڑت بتلایا۔ اس عقلمند نے اس کی بھی ضرورت نہیں رکھی کہ قرآن میں لفظ عربی کا استعمال ہونا چاہیے خواہ اصل سے خواہ اہل عرب کے استعمال سے۔ ربودن تو لفظ فارسی کا ہے اور عرب نے اس کا کہیں استعمال بھی نہیں کیا۔ فرمایئے کیا ان ترجموں کو بھی منع نہ کیا جاوے؟ کوئی حد ہے اس بدتمیزی کی۔ افسوس آج کل ایسے ایسے لوگ قوم کے ریفارمر ہیں اور اسی لیاقت پر حق تعالیٰ کے احکام میں اصلاح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اے اللہ! کیا ہوگیا عقلوں کو۔

ایک شخص کی صدقہ فطر میں ترمیم کی رائے

ایک نوجوان کہنے لگے صدقہ فطر کی مقدار میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ ایک عالم کے سامنے یہ خیال انہوں نے ظاہر کیا۔ عالم صاحب نے کہا پھر آپ ہی ترمیم کر دیجئے۔ کہنے لگے ناں صاحب! میں کس طرح کرسکتا ہوں میرے اوپر تو کفر کے فتوے لگ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کفر کے فتوے سے جیسے آپ ڈرتے ہیں علماء بھی ڈرتے ہیں۔ غضب ہے کہ اپنے لیے تو کفر کا فتویٰ پسند نہیں اور علماء کے لیے اس کو پسند کیا جاتا ہے' یہ کون سی تہذیب ہے اور کیسی ہمدردی ہے کہ بدتر سے بدتر چیز اپنے مقتداؤں کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔

دین کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے

میں اس پر ایک اور بات کہتا ہوں کہ اگر خدا نہ کرے کوئی عالم ایسی حرکت پر آمادہ بھی ہوجاوے تب بھی اس دین کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تمام دنیا کے عالم بھی غلطی پر اکٹھے ہوجائیں تو یہ نہ ہوگا کہ دین بگڑ جائے بلکہ انہیں کو عام لوگ چھوڑ دیں گے۔ بس جس کو مسلمانوں کی نظر سے گرنا ہو وہ ایسا کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب مولوی مل کر اگر ایک مسئلہ کو رواج دیں مثلاً سب مل کر سود کو جائز کر دیں تو بات چل جائے اور سب لوگ ان کو مان لیں۔ میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے بلکہ وہ مولوی خود ہی مردود ہوجائیں گے اور اول تو میں کہتا ہوں کہ جو مولوی ہیں وہ ایسا کریں گے ہی نہیں کیونکہ مولوی اس کو کہتے ہیں جو مولا والا ہو یعنی علم دین بھی رکھتا ہو اور متقی بھی ہو۔ خوف خدا وغیرہ اخلاق حمیدہ بھی حاصل کیے ہوئے ہو۔ اس سے ایسے کام کب صادر ہوسکتے ہیں صرف عربی جاننے سے آدمی مولوی نہیں

ہوجاتا' چاہے وہ کیسا ہی ادیب ہو' عربی میں تقریر بھی کر لیتا ہو کیونکہ عربی دان تو ابوجہل بھی تھا بلکہ وہ آج کل کے ادیبوں سے زیادہ عربی دان تھا تو وہ تو بڑا محقق عالم ہونا چاہیے حالانکہ اس کا نام ہی ابوجہل ہوا۔ معلوم ہوا کہ صرف عربی دانی کا نام مولویت نہیں۔

مولوی کس کو کہتے ہیں

بلکہ مولوی کہتے ہیں عالم' متقی' متبع سنت کو کیونکہ مولوی میں نسبت ہے مولیٰ کی طرف یعنی مولی والا۔ سو جب تک وہ اللہ والا ہے اسی وقت تک مولوی بھی ہے۔ لائق اتباع بھی ہے اور جب اس نے رنگ بدلا' اسی وقت سے وہ مولوی نہیں رہا' نہ قابل اتباع بلکہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غرض آج کل آزادی کا زمانہ ہے اس لیے دین میں اس طرح کے تصرف کیے جاتے ہیں اور ہر شخص شریعت میں دخل دینا چاہتا ہے۔ یہ خرابی علم دین نہ ہونے کی ہے۔ آج کل لوگ اردو کے ترجمے دیکھ کر عالم بن گئے ہیں اور لطف یہ کہ بے سمجھے طوطے کی طرح رٹنے کو بیکار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھایا جاوے۔

ترجمہ پڑھنے سے بے ترجمہ قرآن پڑھنا اچھا ہے

صاحبو! اس رائے میں میں بھی آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ قرآن سمجھ کر ہی پڑھنا چاہیے مگر یہ یاد رکھئے کہ اردو کا ترجمہ دیکھ لینا' اس کا نام سمجھ کر پڑھ لینا نہیں بلکہ یہ اس طوطے کی طرح رٹنے سے بھی زیادہ برا ہے کیونکہ وہ بقول آپ کے بیکار سہی مگر مضر تو نہیں اور یہ مضر ہے کیونکہ ترجمہ دیکھ کر آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے اور نیم ملا خطرہ ایمان[1] کا مصداق ہو جاتا ہے۔ سمجھ کر پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعلق جتنے علوم ہیں ان سب کو حاصل کیا جائے جس کے لیے دوسرا لفظ یہ ہے کہ طالب علمی کی جائے اور مدرسہ میں باقاعدہ پڑھا جائے۔ پس میں بھی آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ قرآن ضرور سمجھ کر پڑھئے مگر سمجھنے کے طریقے سے اور وہ یہ ہے جو میں نے بتلا دیا مگر اس کو کون کرے اس میں مدت صرف ہوتی ہے اور اتنی مدت کے بعد پھر ملازمت کے لیے تعلیم کیونکر حاصل ہوگی اور عمر زیادہ ہو جانے کے بعد محکموں میں جگہ کیسے ملی گی اس لیے اس کو دوسروں پر ٹالتے ہیں کہ عربی پڑھنے کے لیے دیوبند کے طالبعلم ہی کافی ہیں۔ کیوں صاحب اس کو دوسروں پر کیوں ٹالتے ہو خود

---

[1] آدھا مولوی ایمان کے لیے خطرہ ہے جیسے آدھا طبیب جان کے لیے خطرناک ہے

کیوں نہیں سمجھ کر پڑھتے ؟ اور اگر کسی کو یہ عذر ہو کہ ہم تو بوڑھے ہو گئے' اب پڑھنا ممکن نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کو ہی پڑھائیے اور اس قابل بنائیے کہ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھیں اور تمہیں سناویں اور سمجھاویں مگر خدارا ترجموں پر اکتفا نہ کیجئے جس کو عالم بنانا ہو' باقاعدہ عالم بنائیے اور اس سے پھر آپ بھی فائدہ حاصل کیجئے۔

اور ہر کام کا یہی قاعدہ ہے کہ اس کا ایک مرکز ہوتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً سب مالدار نہیں ہوتے اور ان کے مال سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ طریقہ ٹھیک نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ سب کے سب نام نہاد عالم بن جائیں۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ چند اشخاص باقاعدہ عالم ہوں اور دوسرے ان کے علم سے فائدہ اٹھائیں۔ اس پر بعض وہ لوگ جو دین کا دم بھرتے ہیں خوشی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا ایک بچہ علم دین کے لیے وقف کر رکھا ہے یہ ہمت کی بات ہے۔

علم دین کے لیے سب سے نکما بچہ دیا جاتا ہے

لیکن اس میں اتنا اعتراض ہے کہ علم دین کے لیے وہ بچہ دیا جاتا ہے جو سب سے نکما ہو جس کا دماغ اور قویٰ اور اخلاق اور طبیعت بیکار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ قدر کہ اس کے نام پر بچہ بھی وہ دیا جاتا ہے جو اور کسی کام کا نہ ہو اور جو ہوشیار ذہن ہو اس کو انگریزی کے نام پر دیا جاتا ہے کہ یہ انگریزی کے لائق ہے پھر بتائیے اس سے کیا جی خوش ہو۔

اور اولاد ہی پر کیا منحصر ہر چیز میں یہی عادت ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پر وہی چیز دی جائے گی جو بالکل بیکار ہو' کپڑا جب پھٹ گیا اور کسی کام میں لانے کا نہ رہا تو دیدو اللہ واسطے' کھانا جب بگڑ گیا اور بھس گیا اور گھر میں اسے کوئی نہیں سونگھتا' نوکر چاکر بھی نہیں کھاتے تو دیدو اللہ واسطے' افسوس "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ"[1] (ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہیے تھی۔) ان لوگوں کو خدا کی قدر ہی نہیں۔

اس بات کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مؤذن کے پاس محلہ کا لونڈا ایک مٹی کی رکابی میں کھیر لایا' مؤذن بڑے خوش ہوئے اور کہا شاباش آج کیا تقریب تھی جو کھیر لایا' لڑکے نے کہا کہ تقریب تو کچھ نہ تھی' اماں نے کھیر پکائی تھی اس میں کتا منہ ڈال گیا' اماں نے کہا کہ پھینکنے

---

[1] سورۃ الزمر ۶۷

سے اچھا ہے کہ مؤذن کو دے آ' رزق ہے پیٹ میں پڑ جائے گا۔ یہ سن کر مؤذن کو بہت غصہ آیا اور رکابی اٹھا کر پھینک دی' کھیر بھی گر گئی اور رکابی بھی ٹوٹ گئی' لڑکا رونے لگا اس پر مؤذن صاحب کو اور بھی غصہ آیا اور کہا کہ ابے! تو کتے کے آگے کی کھیر لایا اور اوپر سے روتا ہے تجھے کسی نے مارا ہے کیا؟ کہا انا مارے گی رکابی بھیا کے گو[1] اٹھانے کی تھی (ظرف بھی بڑا پاکیزہ تھا اور مظروف بھی ایسا ہی' جوڑ تو اچھا ملا)

بالکل نکمے کو امام اور مؤذن بنایا جاتا ہے

مگر آج کل یہ زیادہ بے جوڑ نہیں کیونکہ مؤذن بھی آج کل خیر ایسے لوگ ہی رکھے جاتے جو گو کے ٹھیکرے کے برابر ہوتے ہیں اور کسی کام کے نہ ہوں' اندھے' لنجے' اپاہج' بے علم آدمی مؤذن اور امام بنائے جاتے ہیں۔ راز یہ ہے تا کہ کچھ زیادہ خرچ نہ ہو کیونکہ جو آدمی کام کا ہوگا وہ تو خرچ سے ہی آوے گا اور لطف یہ ہے کہ خرچ تو کرتے نہیں اور کام ان سے اتنا لیتے ہیں کہ زر خرید غلام سے بھی کوئی نہ لے۔ ہمارے قصبات میں رواج ہے' سقاوے کے لیے ایندھن لانا انہیں کے ذمہ ہے اور محلّہ کا کوئی لونڈا گھڑا لے کر آوے تو اس کا گھڑا بھر دینا مؤذن کے ذمہ ہے۔ اہل محلّہ کا گوشت لانا مؤذن کے ذمہ ہے اور ضرورت کے وقت دہلیز میں سونا بھی مؤذن کے ذمہ ہے۔ علی ہذا امام جو رکھے جاتے ہیں وہ بھی وہ ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہ رہیں' جب تک کام کے رہے نوکری چاکری کرتے رہے اور جب اپاہج ہو گئے تو وکالت دربار خداوندی کے لیے منتخب ہوئے۔

امامت وکالت خداوندی ہے

کیونکہ امامت' وکالت دربار خداوندی ہے۔ اگر بادشاہ سے آپ ملنے کو جائیں اور قسمت سے رسائی ہو جائے تو آپ کو بادشاہ کے روبرو پیش کرنے کے لیے کوئی قلی مزدور نہیں آگے بڑھے گا بلکہ کوئی معمولی رئیس یا حاکم بھی یہ کام نہ کر سکے گا' گمان غالب یہ ہے کہ یہ کام کوئی والی ملک یا وائسرائے کرے گا اور خدا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ارذل الناس اور اخس الناس[2] تجویز ہوتا ہے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے۔

اماموں کی قدر ہم نے مکہ معظمہ میں دیکھی ہے کہ سو سو روپیہ ماہوار کے ایک سو پانچ امام اس وقت مقرر تھے جو نوبت بنوبت امامت کرتے تھے اور امام کی تعیین کوئی معمولی

---

[1] پاخانہ [2] سب سے گھٹیا لوگ

آدمی نہیں کرسکتا تھا۔ ہر وقت کے لیے امام کو معین کرنا شیخ الحرم کے ذمہ تھا جو حرم کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اور علاوہ تنخواہ کے اماموں کی عزت بھی بہت ہے۔ وہاں کے امام ایسے ہوتے ہیں جیسے رؤسا اور یہاں خرچ کی کفایت کے لیے خود ہی تو ایسے آدمیوں کو رکھا جاتا ہے جو نہایت ذلیل، بدنیت، دنی الطبع[1] ہوتے ہیں حتیٰ کہ تمثیلاً[2] کہا جاتا ہے کہ فلانے کی تو ملانوں کی سی عادت ہوگئی مگر اپنی خطاء کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اول تو انتخاب ہی میں ایسے لوگ لائے جاتے ہیں جو فطرۃً پست حوصلہ ہوتے ہیں پھر اس کی خدمت کی یہ حالت ہے کہ خوشی میں تو برادری کی پوچھ ہوتی ہے، شادی ہو، بیاہ ہو، بسم اللہ ہو سب میں لمبی چوڑی فہرستیں بنیں مگر ان کو مؤذن اور امام صاحب کا نام کہیں نہ آوے۔

بیماری اور مصیبت میں مؤذن یا امام کی پوچھ ہوتی ہے

اور غمی میں مثلاً کوئی مرجائے، بیمار ہوجائے، ہیضہ ہوجائے، طاعون ہوجائے (خدا خیریت رکھے) مؤذن کی پوچھ اور امام کی پوچھ ہوگی کیونکہ صدقہ دیا رد بلا[3] اس وقت یہ سوجھتی ہے کہ دو ایک مصلیوں کو کھانا کھلا دو اور بیماری میں مؤذن سے یہ کہتے ہیں کہ ملا جی ذرا دعا کرنا اور پانچوں وقت بعد نماز کے لوگوں سے بھی دعا کروانا۔ وہ جیسی دعا کرے گا معلوم ہے اگر زبان سے دعا کر بھی دی تو دل سے تو کبھی نہیں کرے گا کیونکہ کسی کے اچھا ہونے سے اس کو کیا فائدہ؟ اس کا فائدہ تو مرنے میں ہی ہے کہ کچھ دن کی روٹیاں چلیں گی، سوئم چہلم میں کھانا ملے گا، کچھ پیسے ملیں گے، غرض اس کا نفع تو کسی کے مرنے میں ہی ہے جینے میں تو اس کا نقصان ہی ہے کہ کچھ کام بڑھتا ہے یہ قدر رہ گئی ہے خدا تعالیٰ کے نام کی چیزوں کی۔

خدا تعالیٰ کے نام اعلیٰ درجہ کی شے دینی چاہیے

صاحبو! خدا تعالیٰ کے نام کی اتنی تو بے وقعتی نہ کرو خدا کے نام کی چیز تو وہ نکالنی چاہیے جو سب سے اعلیٰ درجے کی ہو، خدا واسطے کھانا دو تو اعلیٰ درجے کا دو، کپڑا دو تو اعلیٰ درجے کا دو، علم دین کے لیے اولاد تجویز کرو تو اعلیٰ درجے کی کرو، اس بچہ کو منتخب کرو جس کے قویٰ اچھے ہوں، فہم درست ہو، عالی حوصلہ ہو، لوگ کہتے تو ہیں کہ آج کل غزالی اور رازی پیدا نہیں

---

[1] نیت کے خراب، بہت ہلکی فطرت والے [2] مثال کے طور پر [3] صدقہ بلا ٹالنے کے لیے

ہوتے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اب بھی ان سے بڑھ کر پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ہاں آج کل ایسے کم پیدا ہوتے ہیں اور اس کی وجہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ تندرست، صحیح الدماغ لوگوں کو عربی نہیں پڑھاتے ایسے لوگوں کو انگریزی میں ڈالتے ہیں۔

غزالی اور رازی اب بھی پیدا ہوتے ہیں

اگر انتخاب صحیح ہو تو غزالی اور رازی اس وقت بھی پیدا ہوں۔ غزالی اور رازی پر علم ختم نہیں ہو گیا کیونکہ قیامت سے پہلے کسی زمانہ میں ختم نہ ہوگا۔ نبوت کا ختم ہو جانا تو ثابت ہے لیکن ولایت اور علم کا ختم ہونا کہیں ثابت نہیں لیکن جب علم دین کے لیے منتخب ہی وہی بچے ہوں جو نرے بیوقوف ہوں تو یہی تو پڑھ کر علماء کہلائیں گے پھر بڑے ہو کر عقل مند کہاں سے ہو جائیں گے؟

مولوی بیوقوف نہیں ہوتے بلکہ بیوقوف مولوی بن جاتے ہیں

لوگ مولویوں کو بے وقوف کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بیوقوف بن کر مولوی ہوئے یا مولوی ہو کر بیوقوف بنے جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی مدرسہ میں ایک طالبعلم نے دوسرے طالب علم کی چوری کی، پولیس آ گئی ان میں سے ایک افسر جو غالباً درجہ دوم کے تھے، حیرت سے کہنے لگے کہ طالب علم بھی چوری کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں طالب علم چوری نہیں کرتے بلکہ یوں کہو کہ چور بھی طالب علمی کرتے ہیں۔ اس جواب کو سن کر وہ شخص بہت محظوظ ہوئے[1]۔

میں ڈھاکہ گیا تھا وہاں ایک اسکول کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میری ملاقات ہوئی جو مجھ کو اسکول لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا گستاخی معاف ہو، ایک بات پوچھنی ہے۔ میں نے کہا فرمایئے، کہنے لگے میرے تحت میں دو قسم کے طالب علم ہیں عربی کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ انگریزی خوانوں میں جس کو بھی میں دیکھتا ہوں عالی حوصلہ پاتا ہوں اور عربی خوان جتنے بھی ملتے ہیں سب پست خیال۔ میں نے کہا کہ یہ خاصیت انگریزی اور عربی کی نہیں بلکہ یہ اثر خاندانوں کے عالی و سافل[2] ہونے کا ہے اس دور میں عموماً عالی خاندان والے انگریزی پڑھتے ہیں اور عربی پڑھنے والے اکثر پست خاندانوں والے ہیں، پھر ظاہر ہے کہ جو شخص فطری طور پر کم حوصلہ ہو وہ عربی پڑھنے سے عالی حوصلہ کیسے ہو جائے گا؟ عربی پڑھنے سے وہ کم حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ

[1] مطمئن ہوئے [2] اونچے نیچے

وہ اپنی فطرت سے ہی ایسے ہیں پھر کسی قدر اصلاح ہوجاتی ہے اگر وہ عربی نہ پڑھتے تو نہ معلوم کتنے پست حوصلہ ہوتے اور انگریزی پڑھنے والے انگریزی پڑھنے سے عالی حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ وہ چونکہ اکثر شریف النسب' عالی خاندانوں کے ہیں اس لیے عالی حوصلہ ہیں کیونکہ آپ نے چھوٹی قوموں کے عربی طلبہ کو دیکھا ہے اس لیے آپ کو یہ شبہ ہوا۔

آپ ان لوگوں کو دیکھیے جو شریف النسب اور خاندانی ہیں اور پھر انہوں نے عربی پڑھی ہے ان کے برابر کوئی بھی عالی حوصلہ نہیں ہوسکتا۔ وہ سلاطین کو بھی نگاہ میں نہ لائیں گے' پھر میں نے بعض واقعات سے اس کی شہادت پیش کی۔ مثلاً میرے پاس ایک رئیس کا بچہ عربی پڑھتا تھا' اس سے ایک افسر پولیس نے جو ہتھیار لگائے ہوئے تھے' اس کی ہیبت اتنی مہیب[1] تھی کہ اس کے سامنے ایسا ویسا آدمی بات بھی نہ کرسکے۔ سوال کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ عربی پڑھنے والے سب سر منڈواتے ہیں؟ بچہ نے بے دھڑک جواب دیا کہ یہ کیا بات ہے کہ انگریزی پڑھنے والے سب ڈاڑھی منڈواتے ہیں' بس وہ چپ ہی تو رہ گئے۔ اگر کسی غریب قوم کا بچہ ہوتا تو یہ جواب ہرگز نہ دے سکتا۔

علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ بڑھ جاتا ہے

اصل یہ ہے کہ علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ فطری حوصلہ بڑھ جاتا ہے مگر جب فطرت ہی میں حوصلہ نہ ہو تو علم سے کہاں سے آئے گا تو یہ غلطی پڑھانے والوں کی ہے نہ کہ علم کی۔ وہ صاحب اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا جزاک اللہ آپ نے میرا ایمان بچالیا اور یہ بالکل صحیح ہے میرے رجسٹر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ ہیں واقعات پھر حیرت ہے کہ اپنے انتخاب میں خود تو غلطی کریں اور خود ہی عربی پڑھنے والوں پر اعتراض کریں۔

ایک رئیس تارک جماعت کی حکایت

یہ ایسا ہے جیسے ایک رئیس سے کہا گیا کہ آپ نماز مسجد میں کیوں نہیں پڑھتے؟ کہنے لگے کہ اس واسطے نہیں پڑھتا ہوں کہ وہاں صفائی کا کوئی انتظام نہیں' نہ جھاڑ دے نہ روشنی ہے' بورے ہیں تو ٹوٹے ہوئے' میلے کچیلے' پرانے ان پر نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہتا' ان کی

---

[1] رعب والی

صورت دیکھ کر بھی قے آتی ہے' میں نے کہا کہ بے شک یہ بات تو صحیح ہے مگر یہ تو بتلاؤ کہ یہ الزام کس پر اور قصور کس کا ہے؟ جب مسجد کی خدمت کرنے والے اور اس میں نماز پڑھنے والے غریب ہی لوگ ہوں گے تو وہ بوریئے' بدھنے اپنی حیثیت کے موافق لائیں گے' صفائی بھی اپنے مزاج کے موافق کریں گے' تم مسجد میں آنا شروع کرو اور بوریوں' بدھنوں کا انتظام کرو' رقم خرچ کرو' دیکھو پھر مسجد میں چاندنا ہوتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ جس مسجد میں امراء اور رؤسا نماز پڑھنے کی پابندی کرتے ہیں ان کو جا کر دیکھو کیسا عمدہ انتظام اور کیسی صفائی رہتی ہے۔ صاحب آپ مسجد میں آنے کی پابندی کریں اور صفائی کا معقول انتظام کریں پھر دیکھیں صفائی کیسے نہ ہو؟ مسجد غریبوں کے باپ کا گھر تو نہیں کہ وہ اگر صفائی نہ کریں تو آپ آنا ہی چھوڑ دیں' کسی کا ذاتی گھر ہو اور وہاں صفائی نہ ہو تو عذر ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے گھر اس واسطے نہیں آتے کہ تم صفائی نہیں رکھتے' مسجد تو کسی ایک کا یا محلّہ کے غریبوں کا گھر نہیں بلکہ آپ کی بھی مسجد ہے اور آپ کے بھی ذمہ اس کی صفائی ہے خود تو صفائی کا انتظام کرتے نہیں اور خود ہی گھن کھاتے ہیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ اپنے ہی گھر سے گھن کھاتے ہیں اس پر مجھے مولانا کا قول یاد آیا:

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد　　　ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے سادہ شخص تو خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہے جیسے وہ شیر جس نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر خود اپنے آپ پر حملہ کیا)

اسی طرح یہ اعتراض تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ مولوی کم حوصلہ ہوتے ہیں' تنگ خیال ہوتے ہیں۔

مولویوں کے تنگ خیال وغیرہ ہونے میں قصور کس کا ہے

مگر خدا جانے عقلیں کہاں ماری گئی ہیں؟ کوئی غور نہیں کرتا کہ یہ قصور مولویوں کا ہے یا اپنا۔ صاحبو! اس کی اصل وہی ہے جو میں نے بیان کی اس کو سن کر سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں پھر مولوی جیسے بھی ہوں مگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ دین کی اور علم دین کی مسلمانوں کو ضرورت ہے تو اہل دین اور اہل علم سے آپ کو تنافر اور بعد[۱] ہونا تو کسی طرح ٹھیک نہیں بلکہ ان سے مجانست و موانست[۲] ہونی چاہیے ان کے ساتھ استغناء کا برتاؤ نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے آپ کو ان کا محتاج سمجھنا چاہیے۔

---

[۱] نفرت اور دوری [۲] ان کے ساتھ مل کر بیٹھنا اور ان سے محبت

اور یہ کوئی اختراعی بات نہیں بلکہ واقعی بات ہے کیونکہ کسی مذہب کا بھی آدمی ہو وہ اپنے مذہب کے اہل علم سے مستغنی نہیں ہوسکتا ورنہ مذہب کا نام لینا ہی فضول ہوگا۔ جب آپ علماء اور طلبہ کے محتاج ہیں تو ان سے الگ نہیں ہوسکتے۔ پس آپ کے ذمہ یہ بات ہے کہ ان سے ملیے اور ان کی باتوں کی اصلاح کیجئے جو ان میں باعث بعد ونفرت ہیں۔

صاحبو! اس میں ایک اور طرح سے بھی سراسر آپ ہی کا قصور ہے وہ یہ کہ آپ نے طلبہ کو اس طرح تنگ حال کیوں رکھا ہے جس سے وہ تنگ خیال ہوگئے کہ کوڑی کوڑی پر ان کی نیت بگڑنے لگی۔ تنگی معاش ایسی بلا کی چیز ہے کہ اچھے سے اچھے آدمی کی نیت کو بگاڑ دیتی ہے' الا ماشاء اللہ۔ جب آدمی کے پیٹ کو لگتی ہے تو اس کی آنکھیں ہر طرف اٹھتی ہیں اور ذرا ذرا سی چیز پر جان دینے لگتا ہے۔ طالب علموں کو چھوڑ کر آپ اپنے حالات میں اور اپنی برادری کے حالات میں غور کریں تو اس کی تصدیق ہوجائے گی' اچھے اچھے خوشحال لوگوں کو جب تنگی پیش آتی ہے تو نیتیں بگڑ جاتی ہیں اور معمولی ضرورتوں کے لیے وہ کام کر بیٹھتے ہیں جن سے دنیا میں بھی منہ کالا اور آخرت میں بھی منہ کالا ہوتا ہے۔ سودی قرض لیتے ہیں اور تیرا میرا حق دبا لیتے ہیں جس میں آخرکار مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں اور سر بازار رسوائیاں ہوتی ہیں اور آخرت کا گناہ الگ سر پر رہتا ہے۔ نیز تنگ دستی میں کہیں رشوت لیتے ہیں' کسی کی امانت میں تصرف کر لیتے ہیں' جب خوش حال لوگ جو بھی حوصلہ مند تھے ایسا کر گزرتے ہیں تو جس شخص کے پیٹ کو شروع ہی سے نہ ملے[1] اس کی نیت بگڑے تو کیا تعجب ہے؟ اس لیے میں پھر کہوں گا کہ طلبہ عربی کے بدنیت ہونے میں بڑا قصور مسلمانوں کا ہے' آپ نے طالب علم کو اس طرح کیوں رکھا کہ اس کو تنگی پیش آئے اور بات بات پر نیت بگڑے۔

طالب علم کے ساتھ کیسا برتاؤ چاہیے

اس کے ساتھ وہی سلوک کیوں نہ کیا جو اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہو' اگر آپ کا بچہ بھوکا ننگا پھرے تو آپ کو کیوں کوفت ہوتی ہے صرف اسی وجہ سے کہ اس کے ساتھ آپ کو طبعی محبت ہے تو اگر اپنے بچے سے محبت طبعی ہے تو طالب علم سے محبت عقلی تو ہونا چاہیے۔ بچہ کے بھوکا' ننگا پھرنے سے اگر اس لیے عار[2] آتی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ فلانے کی اولاد اس طرح پھرتی ہے تو طالب علم کے بھوکا' ننگا ہونے سے یہ عار کیوں نہیں آتی کہ لوگ کہیں

---

[1] یعنی پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے [2] شرم

گے کہ ان کے مذہبی لوگ اس حال سے پھرتے ہیں۔ دنیا بھر کے خیال میں تو یہ راسخ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ مذہب پر جان دینے والی کوئی قوم نہیں مگر ان کو ہمارے گھر کی خبر نہیں، ان کو پہلے قصے یاد ہیں ورنہ آج کل جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بے فکر ہیں اتنی کوئی قوم اپنے مذہب سے بے فکر نہیں، بھلا یہ کیا مذہب پر جان دینا ہے کہ اپنے مذہبی لوگوں کی شکستہ حالی کی مطلقاً پروانہیں۔

اہل ثروت ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جہاں اپنے چار بچے پرورش پاتے ہیں وہاں پانچواں بچہ ایک طالب علم کو سمجھ کر اپنے ذمہ لے لیں اور اس کو اپنی اولاد کے برابر رکھیں جو اولاد کو کھلائیں وہی اس کو بھی کھلائیں اور جو اولاد کو پہنائیں وہی اس کو پہنائیں۔ ایک دو کے ساتھ ایسا کیجئے اور اس طرح طلبہ کو علم دین پڑھائیں۔ پھر میں دیکھوں کہ آپ کو ان کے اخلاق کی نسبت کیا کیا شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب وہ خوش عیشی میں رہے گا تو اس کا حوصلہ بڑھے گا اور سیر چشم ہوگا ورنہ جو روپیہ آج کل پڑھنے کا ہے اس سے حوصلہ کیسے بڑھ سکتا ہے؟ جو شخص ہمیشہ فاقے کرتا ہے، پیسے کی صورت کبھی دیکھتا نہیں، دوسروں کا دست نگر رہتا ہے کسی کے پاس جائے تو کوئی منہ نہیں لگاتا، اس کا حوصلہ بڑھے تو کیسے بڑھے؟ کوئی ذریعہ حوصلہ بڑھنے کا ہے ہی نہیں، غرض خود آپ نے اس کو اس حالت میں رکھا ہے اور آپ ہی نے اس کو پست حوصلہ بنایا ہے، پھر افسوس ہے کہ آپ ہی شکایتیں کرتے ہیں، میں پھر کہتا ہوں۔

حملہ برخودے کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے سادہ شخص تو خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہے جیسے اس شیر نے اپنے پر حملہ کیا تھا)

یہ شعر مثنوی کے ایک قصہ میں ہے، مولانا نے نخچیروں[1] کا ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سے جانور رہتے تھے، وہاں ایک شیر آ گیا، اس نے چیر پھاڑ شروع کر دی جس کو چاہتا شکار کر لیتا، جانور بہت تنگ ہو گئے اور آپس میں مشورہ کر کے اس سے جا کر کہا کہ ہم آپ کے لیے روز کی خوراک مقرر کیے دیتے ہیں، ایک جانور روز ہم بھیج دیا کریں گے ہمیں سب کو نہ ستائیے۔ بس یہ مقرر ہو گیا کہ روز قرعہ ڈال کر جس کا نام نکلتا اس ایک کو بھیج دیتے، باقی سب

---

[1] جنگلی جانوروں

جانور امن و امان سے رہتے۔ ایک روز خرگوش کا نام نکل آیا اس نے ایک ترکیب سوچی اور کہا آج میں اس کا جھگڑا پاک کیے دیتا ہوں اور ذرا دیر کر کے گیا، وہاں شیر بھوکا بیٹھا تھا، بھوک کی وجہ سے نہایت غصہ میں تھا، اس کو دیکھ کر کہنے لگا کہ بس میں پھر وہی طریقہ شروع کر دوں گا کہ جو سامنے پڑا اسے ہی پھاڑ ڈالا، تم لوگوں نے اپنا عہد خود توڑ دیا ہے۔ خرگوش نے کہا حضور کو اختیار ہے آپ مالک ہیں مگر میری بات سن لیجئے میں سب جانوروں کی طرف سے آپ کو اس بات کی اطلاع کرنے آیا ہوں کہ آئندہ ہم سے وعدہ پورا نہ ہوگا کیونکہ ایک زبردست شیر جنگل میں اور آ گیا ہے وہ راستہ ہی میں سے آپ کا راتب[1] لے لیتا ہے چنانچہ میں اس وقت اپنے ایک دوسرے بھائی کو حضور کی خوراک کے لیے لایا تھا اس شیر نے راستہ ہی میں چھین لیا، اگر ایسا ہی ہوا کرے گا تو ہم کہاں تک وعدہ پورا کریں گے۔

شیر کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا اور کہا بتلا تو وہ شیر کہاں ہے، میں بھی تو اس کو دیکھوں، خرگوش نے کہا چلئے چنانچہ اس کو ایک بڑے کنویں پر لے گیا اور کہا کہ وہ اس کنویں میں ہے۔ شیر نے جھانک کر جو دیکھا تو کنویں میں ایک شیر اور ایک خرگوش نظر آیا، اس نے کہا دیکھئے وہ ہے اور خرگوش بھی ساتھ لیے ہوئے ہے۔ بس شیر غصہ میں آ کر ایک دم کنویں میں کود پڑا، خرگوش کا کام بن گیا اور اچھلتا کودتا نخچیروں کے پاس پہنچا اور مبارک باد دی کہ میں دشمن کو ہلاک کر آیا، دیکھئے اس شیر نے کیا غلطی کی جس سے لڑنے کو چلا تھا وہ خود اپنی صورت ہی تھی مگر تمیز نہ ہوئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح جو لوگ کسی طالب علم پر اعتراض کرتے ہیں وہ در حقیقت اپنے ہی اوپر اعتراض کرتے ہیں اور طالب علم کی صورت بری معلوم ہونا اپنی ہی صورت کا برا معلوم ہونا ہے کیونکہ وہ صورت اپنے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔

ایک حبشی کہیں چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ اس کو اٹھا کر جو دیکھا تو ایک نہایت بری شکل نظر آئی، موٹے موٹے ہونٹ، کالا رنگ، برا نقشہ۔ اس کے قبل کبھی آئینہ نہ دیکھا تھا کہنے لگا کہ ایسا بری صورت کا تھا جب ہی تو کوئی راستہ میں پھینک گیا، یہ کہہ کر آئینہ کو زمین پر پٹک دیا، دیکھئے اس میں آئینہ کا قصور تھا یا اپنی صورت کا۔

---

[1] مقرر کردہ حصہ

ایسے ہی ایک بچہ روٹی کھا رہا تھا' پانی کا لوٹا پاس رکھا تھا۔ اتفاق سے اس میں ٹکڑا گر گیا' جھانک کر جو دیکھا تو اپنی صورت نظر آئی کہ ایک بچہ ہاتھ میں ٹکڑا لیے ہوئے ہے' بس لگا رونے کہ ہائے ابا! اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ ابا جان نے کہا کہ کس نے چھین لیا؟ کہا یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہے' وہ بھی اسی کے باوا تھے' لوٹے میں جھانک کر جو انہوں نے دیکھا تو ان کو اپنی صورت نظر آئی' اس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ اتنی بڑی ڈاڑھی لگا کر شرم نہیں آتی کہ بچہ کا لقمہ چھین لیا۔ یہ سب کچھ اپنے ہی کو سنا رہے تھے مگر حماقت سے یہ سمجھ لیا کہ دوسرے کو سنا رہا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ علماء پر' مسجدوں پر' مساکین پر اعتراض کرتے ہیں سمجھ لیں کہ یہ صورت' یہ حالت انہی کی بنائی ہوئی ہے' اگر مساکین اور طلبہ کی خبر گیری رکھیں تو وہ ایسے شکستہ حال کیوں رہیں۔

ہر قوم مذہبی جماعت کی خدمت کرتی ہے

اور علماء وطلبہ کی خدمت مفت بھی تو نہیں ہے وہ بھی تو قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی خدمت آپ کی خدمت سے زیادہ اچھی اور زیادہ ضروری ہے۔ اگر آپ ان کی دنیوی خدمت کرتے ہیں تو وہ آپ کی دینی خدمت کرتے ہیں اور دین کی خدمت کرنا قوم ہی کی خدمت تو ہے کیونکہ دین سب مسلمانوں کی مشترک چیز ہے جس کی خدمت سب مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے جس کو طلبہ علم دین آپ کی طرف سے ادا کر رہے ہیں اگر قرآن وحدیث سے یہ بات سمجھ نہ آوے تو دوسری قوموں کی شہادت سے سہی کیونکہ آج کل دوسروں کی تقلید کی عادت ہو گئی ہے۔

دیکھئے غیر اقوام بھی اپنی مذہبی جماعت کی دینی خدمت کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی جماعت ساری قوم کی طرف سے ایک اہم اور ضروری کام کو سرانجام دے رہی ہے اسی لیے مشنریوں کی خدمت تمام عیسائی اور گروکل کی خدمت تمام ہندو' سب چھوٹے' بڑے کرتے ہیں۔ ہر ہر شخص اپنا کام سمجھ کر اس میں حصہ کچھ نہ کچھ ضرور لیتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان اس بات میں دوسروں کی بھی تقلید نہیں کرتے' وہ بیچارے دست خود دہان خود[1] کا منظر بن رہے ہیں ان کی وہ حالت ہے جو اکبر بادشاہ کے ایک عطیہ کی تھی۔

---

[1] خود کماؤ' خود کھاؤ

بھانڈوں کے ہاتھی کا قصہ

قصہ اس کا یہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے ایک دفعہ بھانڈوں کو انعام میں ہاتھی دیا مگر ہاتھی کو کہاں تک کھلاتے۔ پس انہوں نے کیا کیا کہ اس کے گلے میں ڈھول ڈال کر بازار میں چھوڑ دیا' اس ہاتھی نے بازار میں بہت فساد مچایا' یہاں تک کہ بادشاہ کو خبر پہنچی' بادشاہ نے ان کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے کہا حضور ہم غریب لوگ ہیں' ہاتھی کے کھلانے کو کہاں سے لاتے اور پیشہ ہمارا مانگنا کھانا' ہم نے اس سے بھی کہہ دیا کہ تو بھی مانگ اور کھا' بادشاہ بہت خفیف ہوئے اور اس کی خوراک اپنے یہاں سے مقرر کر دی۔

حضرت آج کل ہماری قوم نے مولویوں کو اکبر بادشاہ کا ہاتھی بنایا ہے کہ دین کی خدمت بھی کرو' مدرسے بھی قائم کرو' مخالفین اسلام کا جواب بھی دو اور بھیک مانگو اور کھاؤ۔ اگر کوئی بات دین پر آئے تو مولویوں پر الزام کہ یہ مذہب کی خبر نہیں لیتے' یہ نہیں کرتے' وہ نہیں کرتے' ان سے کوئی پوچھے کہ کبھی تم نے بھی کسی دن مذہب کی خبر لی کہ مولوی صاحب یہ رقم لو اور اس سے دین کا کام چلاؤ۔ جب تم خبر نہیں لیتے اور خود مولوی صاحب کو گھر گھر چندہ مانگنا پڑتا ہے تو وہ بھیک مانگیں یا سارے کام کریں' پھر چندہ میں بھی قوم فراخ دلی سے حصہ نہیں لیتی۔ حالت یہ ہے کہ جب کوئی عالم چندہ مانگتا ہے تو رئیس صاحب یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ میں ذرا گھر جاتا ہوں اور وہاں جا کر خدا ہی کے یہاں پہنچ جاتے ہیں پھر جب تک مولوی صاحب کے بیٹھے رہنے کا احتمال رہے گا نکلنے ہی کے نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ خیر قوم نے تو جو کچھ بھی کیا وہ کیا مگر علماء کا بھی ان کے ساتھ یہ رنگ ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی   بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل اس سرخ رنگ کی شراب سے دل لگانا بہتر ہے' بغیر سونے' خزانے کے تمہیں قارون کا سا دبدبہ حاصل ہو جائے گا' لیلیٰ کے راستے میں اگرچہ جان کے بہت سے خطرات ہیں مگر اس راستہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں ہو)

علماء کو چاہیے کہ سوال نہ کریں

سوال کرنا تو نہایت ہی ذلت کا کام ہے جو کرنا ہو خود خدا کے نام پر کریں اور قوم کو منہ بھی نہ لگائیں۔ اچھا ہے جیسا یہ دین کی خدمت سے بھاگتے ہیں یہ دین کی خدمت سے محروم ہی رہیں۔ بس خدا ہی پر نظر رکھیں، حق تعالیٰ اپنا کام آپ ہی کریں گے۔ اس سوال ہی نے علماء کو بے قدر کر دیا۔ علماء کی بے قدری سادگی سے اور پھٹے ہوئے کرتے سے اور پھٹے ہوئے جوتے سے نہیں ہوتی، اس کی تو وہ کچھ بھی پروا نہ کریں مگر خدا کے لیے مستغنی ہو کر رہیں۔ اگر یہ ایسا کریں تو مسلمان اتنے بے حس نہیں کہ حقیقت کو نہ سمجھیں گے۔ ایک شخص پھٹے ہوئے لباس میں ہو لیکن عالم ہو اور متقی ہو تو ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی نظر میں اس کی عزت نہ ہو برخلاف اس کے جو لوگ عبا، قبا میں ہوتے ہیں، چاہے کیسے ہی مہذب طریق سے سوال کریں مگر ذلت ضرور ہوتی ہے، خاص کر اس وقت جبکہ سوال بھی اپنی ذات کے لیے ہو اور اگر سوال کسی کارِ خیر کے لیے ہو تب بھی کچھ نہ کچھ ذلت ضرور ہوتی ہے۔

اس پر اہل مدارس کہہ دیتے ہیں کہ اگر اس طرح سے سوال نہ کیا جائے تو کام کیسے چلے؟

اہل علم کو سوال کرنے سے مرنا بہتر ہے

میں کہتا ہوں سوال ضرور ذلت ہے، ہاں تحریک عام[1] کا مضائقہ نہیں اور اگر خلوص سے کام کیا گیا تو اس تحریک کا بھی اثر ضرور ہوگا اور اگر اثر نہ ہو تو نہ سہی ہر شخص مکلّف اتنے کام کا ہے جو اس کے بس کا ہو، آپ اپنا کام کر چکے کوئی نہیں دیتا ہے، مت دو۔ رہا کہ کام تو بند ہو گیا، میں کہتا ہوں کہ جتنا تھوڑا بہت ہو سکے کرو اور جو بدون بڑی بڑی رقموں کے نہ ہو سکے اسے چھوڑ دو اور اگر مدرسے بھی مٹ جائیں، مٹ جانے دو۔

میں علماء سے کہتا ہوں کہ اس حالت میں تم اپنے گھر بیٹھو، مزدوری کر کے کھاؤ، کوئی آوے تو پڑھا دو، کھانے کو نہ ملے تو اسی کونہ میں مرجاؤ مگر ہاتھ مت پھیلاؤ اور خدا تعالیٰ کے سامنے کہہ دینا کہ جتنا ہم سے ہو سکا اتنا ہم نے کیا اس سے زیادہ کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس تھا نہیں، جن کے پاس تھا انہوں نے دیا نہیں۔ بس اس وقت ساری قوم

---

[1] عمومی انداز میں چندہ کی ترغیب دینا

کی گردنیں نپ جائیں گی۔ باقی اس سوال میں تو طرح طرح کی خرابیاں ہیں، گو لوگ اس کو کار خیر سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک تو یہ کار شر ہے۔ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ دین کی ذلت ہے اور ان علماء کے لیے جو سوال کرتے ہیں، یہ خرابی ہے کہ ذلیل ہوتے ہیں اور چند روز میں حیا جاتی رہتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ اکثر سائلوں کے اخلاق اکثر خراب ہو جاتے ہیں اور علم کے آثار مٹ جاتے ہیں۔ پھر ان سے دوسروں کو کیا فیض ہو سکتا ہے، علماء کو تو اس عیب کے پاس بھی نہ جانا چاہیے۔ بس اگر کام کرنا ہے خدا کا نام لے کر کریں، جب نہ ہو سکے چھوڑ دیں۔

خلوص کے ساتھ کام کرنے میں فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی

اور حضرت میں خدا پر توکل کر کے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ فاقہ کی نوبت آوے ہی گی نہیں، کام کیجئے کام خود لوگوں کو متوجہ کر لیتا ہے مگر براہ خدا للّٰہیت کے ساتھ کیجئے، یہ بھی نیت نہ رکھئے کہ لوگ رجوع ہوں۔ خیر یہ تو دور کی بات ہے، کس کس کو رائے دوں اور کیسے دل میں ڈال دوں؟ آج کل اہل علم کو اس چندہ سے روکنا تو مشکل ہے اور یہ سوال کی رسم دنیا سے اٹھنا دشوار ہے کیونکہ ضعفاء کو ظاہراً تکلیف کا قوی احتمال ہوتا ہے مگر میں قوم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے دین کی بے عزتی کیوں کرتے ہو، علماء کے سپرد تم نے یہ چندہ کی خدمت کیوں کی ہے جس سے وہ ذلیل ہوئے اور ان کے ساتھ علم اور دین بھی ذلیل ہوا۔ غیرت قومی کیسے تقاضا کرتی ہے کہ اپنے علماء کو لوگوں کی نظروں میں بے وقعت دیکھا جائے۔

امراء کو چندہ جمع کرنا چاہیے نہ کہ علماء کو

یہ چندہ کا کام تم خود کرو اور علماء سے وہ کام لو جو ان کے کرنے کا ہے یعنی تعلیم و تبلیغ اور تعلیم و تبلیغ کے متعلق جو نظم و نسق ہو اس میں تم دخل مت دو اور مالی انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس میں علماء کچھ دخل نہ دیں اور دینے والوں کو اور وصول کرنے والوں کو سب کو چاہیے کہ اس کام کو حقیر نہ سمجھیں کیونکہ سوال سے علماء کی تو تحقیر ہوتی ہے اور قوم کی تحقیر نہیں ہوتی کیونکہ علماء کے مانگنے میں تو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اپنے پیٹ کے واسطے مانگتے ہیں اور قوم کے سر برآوردہ لوگوں کے مانگنے میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اپنے پیٹ کے واسطے مانگتے ہیں اس واسطے مولویوں کو چندہ نہیں ملتا اور ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں تو فوراً ملتا ہے۔ مولویوں کی تو صورت دیکھ کر لوگ چھپ جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک جگہ ایک صدر اعلیٰ کی تبدیلی ہوئی وہ پرانے فیشن کے آدمی تھے' عبا قبا پہنتے تھے جب اس شہر میں پہنچے تو ایک رئیس صاحب سے ملنے گئے' وہ باہر مکان میں بیٹھے ہوئے تھے' دور سے دیکھ کر کہ کوئی مولوی صاحب آ رہے ہیں گھر میں چلے گئے۔ صدر اعلیٰ سمجھ گئے اور یہ کہلوا بھیجا کہ ڈریں نہیں میں کوئی سائل نہیں ہوں تب وہ باہر تشریف لائے۔ علماء کے مانگنے سے یہ نتائج پیدا ہوگئے ہیں' علماء کو مانگتے دیکھ کر جاہلوں نے بھی مانگنا اختیار کرلیا' مولویوں کی وضع بنالی ان کا نام بھی مولوی ہوگیا۔

بھک منگوں کا نام مولوی ہوگیا

بھک منگوں کا نام مولوی؟ حیرت کی بات ہے۔ بوڑھانہ میں ایک واعظ آئے پھر وہ آٹھ آنہ سے لے کر پانچ روپیہ تک کا وعظ کہتے تھے۔ لا الہ الا اللہ ان کا نام بھی مولوی صاحب تھا۔ ایک مولوی صاحب (ایسے ہی نام کے مولوی) نے وعظ کہا "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" کا ترجمہ کیا: دیا ہم نے تجھ کو مثل کوثر کے۔ ایک صاحب علم نے ان سے پوچھا مثل کا ہے کے معنی ہیں؟ کہنے لگے ایک کاف تشبیہ کا ہوتا ہے' سائل نے کہا وہ تو ایسے موقع پر گول گول لکھا جاتا ہے' غنیمت ہے مان گئے اور کہا مجھ کو معلوم نہ تھا خیر ان کی سمجھ میں تو آ گیا۔

ایک اور صاحب نے میرے سامنے وعظ کہا تھا اور "ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" سورۃ الجمعہ ۹) کا یہ ترجمہ کیا تھا: (تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت دکانوں کو تالا لگا کر مسجد میں آیا کرو) تعل کو تو تالا سمجھے اور مون کو موند سمجھے' بند کرنے کے معنی میں۔ یہ حالت واعظوں کی رہ گئی ہے اور قوم کی یہ حالت ہے کہ جو منبر پر بیٹھ گیا وہ مولوی ہے' مجھ سے بعض لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں' پھر کہتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب آئے تھے وہ تو یوں کہتے ہیں' میں کہہ دیتا ہوں کہ کیا میں تمام دنیا کے گشتی مولویوں کا ذمہ دار ہوں۔

ہر شخص کا وعظ نہ سننا چاہیے

یہ خرابی قوم کی بے توجہی سے ہے۔ اگر ہر شخص کا وعظ نہ سنیں اور یہ قید لگادیں کہ کسی معتبر عالم سے اپنے عالم ہونے کی تصدیق کراؤ جب ہم وعظ سنیں گے تو یہ راستہ ہی بند ہو جاوے گا اور سندوں کا اعتبار ہرگز نہ کیا جائے' جعلی سند تو ہر کوئی بنا سکتا ہے جب وہ تصدیق نہ کرا سکا تو ایسوں کے ساتھ صرف یہ سلوک کردیں کہ ان کو کھانا کھلا دیا اور وعظ سے منع کردیا۔

میں خدمت سے منع نہیں کرتا، حسب موقع ومحل خدمت کردو کیونکہ ممکن ہے کہ وہ محتاج اور واجب الخدمت ہوں مگر وعظ کسی کا نہ سنیں سوائے مستند اور مصدق شخص کے اور خدمت کے باب میں یہ مسلک رکھیں۔

خورش دہ بہ کنجشک و کبک وحمام　　　　که شاید ہمائے درافتد بدام

(چڑیا، چکور، کبوتر سب کو خوراک دیتے رہو شاید کوئی ہما پرندہ جال میں پھنس جائے)

پیرزادوں کے ساتھ برتاؤ

پپاڑ ایک جگہ ہے وہاں میں ایک جلسہ میں گیا ہوا تھا کہ ایک پیر صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ ایک لسان مولوی صاحب بھی تھے، ان کو اس واسطے لائے تھے کہ اگر میں پیرزادوں کی خدمت سے منع کروں تو وہ مجھ سے مناظرہ کریں۔ اتفاق سے میں نے وعظ میں یہ بیان کیا کہ صاحبو! پیرزادوں کی خدمت تو خوب کرو کیونکہ یہ بزرگ زادے ہیں مگر ان سے حاصل کچھ مت کرو کیونکہ وہ دین کو نہیں جانتے۔ یہ خدمت تعلیم کی مولویوں سے لو یعنی ان سے وعظ کہلاؤ، مسئلے مسائل پوچھو مگر وعظ کے بعد ان کی مالی خدمت کچھ نہ کرو۔ پس مالی خدمت کے لیے تو پیروں کو رکھو اور دین حاصل کرنے کے لیے ہم طالب علموں کو رکھو چاہے اور ہمیں کچھ نہ دو۔ اس جملہ سے وہ پیر صاحب گویا مرید ہو گئے، پھر مجھے داعی نے جو رئیس شخص تھے سو روپیہ کا نوٹ دیا مگر میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا۔ صاحبو! اگر دین سے معاملہ درست ہوتا تو چندہ میں کچھ خرابی نہ تھی۔

علماء دین کی خدمت کریں اور اہل دنیا علماء کی

ہمارے ذمہ تمہارے دین کی خدمت ہے اور تمہارے ذمہ ہمارے تن کی خدمت ہے، انصاف کی بات تو یہ ہے لیکن اب انصاف نہیں رہا مگر میں علماء سے کہتا ہوں کہ اس کا استغاثہ کسی انسان کے پاس نہ لیجاؤ بلکہ حق تعالیٰ کے پاس لے جاؤ اور اپنا کام کیے جاؤ حق تعالیٰ خود آپ ہی سنیں گے، میں نے تو اپنا طرز عمل یہی رکھا ہے۔

ہدایا لینے میں حضرت والا کا طرز عمل

اس میں تو شک نہیں کہ میں لیتا ہوں، میرا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں مگر چند شرطوں کے ساتھ لیتا ہوں، مثلاً جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ اس ہدیہ دینے والے کو محبت کا جوش ہے اور بلا کسی

غرض کے دیتا ہے اور ہدیہ قبول کر لینے میں کوئی خرابی اس وقت اس کے لیے یا میرے لیے یا کسی شخص کے لیے نہیں ہے نہ آئندہ کسی خرابی کا احتمال ہے نہ کسی قسم کا دباؤ پڑے گا نہ اس شخص کو حق بات کہنے میں وہ ہدیہ مجھے کچھ مانع ہوگا۔ یہ سب باتیں دیکھ لیتا ہوں اور مقدار بھی اس کی یہی رکھی ہے کہ ایک مہینہ میں ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں لیتا ہوں حتیٰ کہ جس کے یہاں وعظ ہوتا ہے اس کے یہاں اس دن بلکہ اس سے اگلے دن بھی کھانا نہیں کھاتا ہوں۔

غرض لیتا ضرور ہوں مگر اس طرح کہ نہ ایمان فروشی ہو، نہ حیا فروشی، نہ عزت فروشی ہو ورنہ یہ اگر احتمالاً بھی معلوم ہو جائے کہ ذرا آنکھ نیچی ہوگی تو ہفت اقلیم[1] کی سلطنت بھی بحمد اللہ میرے نزدیک کچھ نہیں۔ مجھے فاقہ سے بیٹھا رہنا اور گھر کے اندر مر جانا گوارا ہے مگر کسی کے سامنے مہذب یا غیر مہذب پیرایہ میں بھی اپنی حالت کا ظاہر کرنا گوارا نہیں اور یہ فخر نہیں، شکر ہے جو رقم آن بان کے ساتھ آ دے وہ عطیہ الٰہی ہے اس سے ناک بھوں چڑھانا تکبر اور ناشکری ہے۔ گو یہ مضمون بحث سے خارج ہے مگر اس وجہ سے زبان پر آ گیا کہ مفید ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست بھی ایسا کریں اس لیے بیان کر دیا۔

ایک شخص نے میرے پاس پانچ روپیہ بھیجے اور یہ لکھا کہ یہ روپے طالب علموں کے واسطے ہیں اور میری فلاں حاجت کے لیے ان سے دعا کرا دیجئے، میں نے وہ روپیہ واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ طالب علم اس کام کے لیے نہیں ہیں وہ روپیہ واپس آیا اور اس شخص نے لکھا کہ میں دعا بھی نہیں چاہتا، طالب علموں کے لیے بھیجتا ہوں، تب میں نے لے لیے۔ دیکھئے اب ہوا ہدیہ، وہ کیا ہدیہ ہے جس میں اپنی غرض بھی شامل ہو۔ حق تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے: "اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا"[2] (ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں نہ تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ۔) اس میں جزاء نکرہ ہے یعنی کوئی بھی بدلہ نہیں چاہتے حتیٰ کہ دعا بھی نہیں اور شکوراً کے لفظ سے اس کی اور تاکید ہوگئی۔ مطلب یہ ہوا کہ اور کسی قسم کا بدلہ تو درکنار وہ تو خالی شکریہ بھی نہیں چاہتے۔

---

[1] یعنی ساری دنیا کی حکومت [2] سورۃ الدھر ۹

جلسوں میں شکریہ کرنے کی بدرسم

اسی وجہ سے میرا مشرب یہ ہے جو میں نے مؤتمر الانصار میں کہا تھا کہ دینی کاموں میں چندہ دینے والوں کے لیے ہمارے منہ سے قیامت تک یہ پانچ حرف نہیں نکل سکتے یعنی شکریہ کیونکہ ہمارے اوپر چندہ دینے والوں کا کیا احسان ہے۔ اگر آپ لوگ جلسہ میں آئے ہیں یا کچھ خرچ کریں گے تو یہ سب اپنے واسطے ہے کیونکہ دین کی امداد ہر مسلمان کا فرض منصبی ہے تو اب جلسہ میں اپنے کام کے لیے آئے ہو اور امداد اپنے فرض کو ادا کرنے کے لیے کی جس سے مقصود ثواب اور رضائے الٰہی ہے۔ ہمارے اوپر کون سا احسان کیا ہے جو ہم اس کا شکریہ ادا کریں۔

اور بطور وظیفہ کے یہ بھی کہہ دیا کہ جو لوگ چندہ دینے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اس سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس رقم کو اپنے واسطے سمجھتے ہیں اور خود کھالیں گے ورنہ کیا وجہ ہے شکریہ ادا کرنے کی؟ جیسے بانیان جلسہ قوم کے ایک فرد ہیں' ایسے ہی شرکاء جلسہ بھی ایک فرد ہیں۔ انہوں نے اپنا کام کیا' انہوں نے اپنا کام کیا اور اگر یہی ٹھہری ہے کہ ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرے تو آپ بھی شکریہ ادا کیجئے ہم بھی ادا کریں گے۔ اس صورت میں شکریہ کی رسم ایک گدھا کھجاؤں[1] کی رسم بن جائے گی۔

شرکائے جلسہ کو علماء کا شکریہ ادا کرنا چاہیے

بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ پہلے تم ہمارا شکریہ ادا کرو کیونکہ جلسہ تمام قوم کا ہے اس کے انتظام کا بار جو ہم نے اٹھایا ہے اس کا احسان آپ پر ہے یا نہیں؟ کسی اور نے نہ اٹھالیا اور یہ کام ہم نے پہلے کیا اس لیے ہمارا شکریہ پہلے ادا کیا جائے' اس کے بعد ذرا دیر کے لیے آپ بھی جلسہ میں آ گئے اور کچھ رقم دے گئے اور بس فارغ ہو گئے' ہم نے تو انتظام میں بہت وقت خرچ کیا اور اب تک ہمارا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد وصول شدہ رقم کی حفاظت کریں گے اور اس کی ذمہ داری لیں گے۔ آپ کا کام تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا ہے اور ہمارے ذمہ تو یہ بلا مہینوں اور برسوں کے لیے ہے بلکہ تمام عمر کے لیے لگ گئی۔ اب بتایئے قوم کا کام

---

[1] گدھے ایک دوسرے کو کھجاتے ہیں

ہم نے زیادہ کیا یا تم نے؟ اور شکریہ آپ کے ذمہ زیادہ واجب ہوا یا ہمارے ذمہ؟ مگر عجیب الٹی رسم پڑ گئی ہے کہ کم کام کرنے والے زیادہ کام کرنے والوں سے شکریہ چاہتے ہیں اور وہ بھی خواہ مخواہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے جس سے بانیان مدرسہ کی آنکھ لجتی ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا اس میں کچھ بناوٹ نہیں۔

میں واللہ دل سے کہہ رہا ہوں کہ جہاں دینے والے کے خیال میں ہم کو شکریہ ادا کرنا پڑے مجھے تو اس جگہ سے کچھ بھی لیتے ہوئے سخت غیرت آتی ہے۔ میں تو اس کا ہدیہ قبول کرتا ہوں جس کو شکریہ کا وہم بھی نہ ہو۔ اس آن بان کے ساتھ جو ملتا ہے وہ نعمت خداوندی ہے ہدیہ سے مطلقاً انکار کرنا تکبر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدیہ لیا ہے پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ اس سے استنکاف[1] کریں مگر اس کیلئے کچھ اصول اور شرائط ہیں' شریعت میں مصرح یا اس سے مستنبط[2] ہیں۔

ہدیہ کے عام اصول

چنانچہ میں ہدیہ کے عام اصول عرض کرتا ہوں وہ یہ ہیں کہ ہدیہ کسی کے مکان پر نہ لے اپنے صدر مقام پر لے۔ اپنا مقام ہدیہ کے لیے ہیڈ کوارٹر رکھے یا بذریعہ منی آرڈر تو لے لے' کوئی گھر پر بلا کر دے تو ہر گز نہ لے۔ ایک جگہ ایک شخص مجھے گھر پر لے گئے اور کچھ پھل سامنے رکھ دیئے' میں نے کھا لیے' پھر کچھ روپیہ دینے لگے' میں نے وہ نہ لیے' بہت اصرار کیا مگر میں نے کہا کہ میری مصلحتوں میں دخل نہ دیں' وہ مصلحت یہ تھی کہ ان کے علاوہ بھی بعض اہل محبت مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں مگر وہ غریب ہیں' کچھ ہدیہ نقد نہیں دے سکتے اس واسطے وہ مجھے نہ لے جا سکیں گے۔ جب یہ بات لوگوں کو معلوم ہو گئی کہ کسی کے مکان پر جا کر میں نہیں لیتا ہوں تو سینکڑوں بلانے والے پیدا ہو گئے مگر وہ بہت خفا ہوئے کہ یہ پیچ اور چال ہے تاکہ شہرت زیادہ ہو۔ میں نے کہا چال اور پیچ ہی سہی مگر ایذاء رساں چال اور پیچ تو نہیں' لوگوں کو کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ یہ ہیں اصول ہدیہ کے' نیز لینے والے کو چاہیے کہ دینے والے کی گنجائش بھی دیکھ لے اگرچہ دینے والا امیر ہی ہو۔

---

[1] انکار کرنا' حقارت سے دیکھنا [2] کھول کر بیان کی گئی ہیں یا قرآن وسنت سے نکلتی ہیں

ہدیہ لینے میں بنسبت غرباء کے امراء زیادہ قابل رحم ہیں

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے بنسبت غریبوں کے امیروں پر زیادہ رحم آتا ہے' غریب کا تو یہ ہے کہ اگر وہ دو پیسہ بھی دے اور کوئی یہ بھی کہہ دے کہ کچھ نہیں دیا تو اس کی شان نہیں گھٹتی۔ سب جانتے ہیں کہ غریب ہے اور بڑے لوگ شان سے کم دینے کو اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔ پس جب امیر ہدیہ دیں تو اس بات کو ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اتنا دینے کے قابل بھی ہیں یا نہیں کیونکہ امراء دیکھنے میں تو سب کچھ کرتے ہیں مگر بسا اوقات مقروض ہوتے ہیں۔ ان کے سامان' ٹھاٹھ کو دیکھ کر لوگ ان کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں حالانکہ آمدنی اور خرچ دونوں کو دیکھنا چاہیے جس کی آمدنی زیادہ ہو اس کو امیر کہنا چاہیے اور جس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو وہ ہرگز امیر نہیں بلکہ غریب ہے۔ آج کل اکثر جگہ یہی حالت ہے کہ ہزار کی آمدنی تو ڈیڑھ ہزار کا خرچ ہے اور یہ آج کل بڑا حوصلہ کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں فلانا رئیس ایسا عالی حوصلہ ہے کہ ایک پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتا اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ (عقلاء کے نزدیک تو یہ بیوقوفی ہے) بہت جگہ صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے' کپڑے ہی کپڑے ہیں' کھانے کو پیٹ بھر روٹی بھی میسر نہیں اور ریاست تو کہاں' کسی نے خوب کہا ہے۔

ہے شرافت تو کہاں بس شر و آفت ہے فقط ۔۔۔ ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

مگر دیکھنے والے کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی حالت کیا ہے اور ہم کو اس کا بھی کیا حق حاصل ہے کہ کسی کے خزانہ کی جانچ کریں۔ لہٰذا حکم عام بھی مناسب ہے کہ امراء سے ہدیہ کم لیں۔ ان سے زیادہ لینا ان کو تکلیف پہنچانا اور اخذ مال مسلم بغیر طیب نفس ہے جو حرام ہے۔

ہدیہ کے متعلق عقلی التزامات

یہ تو ہدیہ کے متعلق شرعیات تھے یعنی وہ باتیں تھیں جن کی رعایت شرعاً واجب ہے اور کچھ عقلی التزامات بھی ہیں جو تجربہ سے ضروری معلوم ہوئے۔ وہ یہ ہیں کہ میں کسی شخص سے ایک مہینہ میں ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں لیتا۔ بعضوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک دن آ کر ایک دن کی آمدنی کے برابر دے گئے اور دوسرے دن پھر دینا چاہا اور کہا: دیکھ لیجئے یہ

ہدیہ اس قاعدہ کے اندر ہے کیونکہ ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں۔ میں نے ایک قاعدہ بڑھادیا کہ دو ہدیوں میں کم از کم ایک مہینہ کا فصل ہو نیز میری رائے یہ ہے کہ کسی سے اول ملاقات میں ہدیہ نہ لے اور یہ کہ ہر ملاقات میں نہ لے کیونکہ اس سے ملاقات قطع ہو جاتی ہے اس واسطے کہ جب تک اس کے پاس نہ ہو اس وقت تک آنیکی ہمت نہ ہوگی۔ نیز اس سے لینے والے کے دل میں طمع پیدا ہوگی کہ جب آنے والے کی صورت دیکھے گا نفس خوش ہوگا کہ کچھ لایا ہوگا۔ آج کل مشائخ اس کا خیال بالکل نہیں کرتے۔ بقول حضرت گنگوہیؒ کے کہ آج کل پیروں کی یہ حالت ہے کہ مریدان کے سامنے سر بھی کھجلانے لگے تو خیال ہوتا ہے کہ پگڑی سے کچھ نکال کر دے گا۔ پس پیر کے ساتھ یہ برتاؤ کبھی نہ کرے کہ بلا ہدیہ اس کے پاس جاوے ہی نہیں' اس سے وہی نقصان ہوتا ہے کہ پیر کی نیت بگڑتی ہے تو یہ کیا انصاف ہے کہ پیر تو تمہارا دین سنوارے اور تم اس کا دین بگاڑ دو۔

پس چاہیے کہ کبھی لاؤ اور کبھی نہ لاؤ بلکہ کبھی کچھ ان کے پاس سے لے جاؤ۔ یہ بات از راہ تفاخر نہ سمجھئے گا خدا کی نعمت سمجھ کر عرض کرتا ہوں کہ بحمد اللہ میں تو بہتیروں کی خدمت کر دیتا ہوں کیونکہ ہمیشہ لینے سے نیت بگڑتی ہے اور بزرگوں نے نیت بگڑنے سے بڑی احتیاط کی ہے۔

بلگرام کے ایک بزرگ کا قصہ

بلگرام میں ایک بزرگ تھے' انکو فاقہ تھا' ایک مرید کو آثار سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ شیخ کو آج فاقہ ہے' وہ اٹھ کر گئے اور ایک خوان میں کھانا لگا کر شیخ کے سامنے لائے' شیخ نے اس کے لینے سے عذر کیا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ تو ہدیہ ہے اور بلا سوال کے آیا ہے اس کے قبول کر لینے میں کیا حرج ہے؟ شیخ صاحب نسبت بھی تھے' نرا مولوی ایسا نہیں کر سکتا' صاف کہہ دیا کہ بیشک یہ ہدیہ ہے اور خلوص سے بھی ہے اور مجھے حاجت بھی ہے مگر اس وقت اس کا قبول کرنا سنت کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے "ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ"[۱] اور اس وقت یہ ہدیہ اشراف نفس[۲] کے بعد آیا ہے کیونکہ جس وقت تم اٹھ کر چلے تھے میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ کھانا لینے گئے ہو' اس وقت سے برابر نفس کو اشتیاق اور

---

۱ جو ہدیہ نفس کے لالچ اور انتظار کے بغیر حاصل ہوا سے لے لو ۲ نفس کا انتظار

انتظار لگا ہوا تھا یہی اشراف نفس ہے۔ مرید بھی سمجھ دار اور مخلص تھا' اس نے کچھ اصرار نہ کیا اور کھانے کا خوان اٹھا کر واپس لے چلے۔ شیخ کے حکم کے سامنے اور حدیث کے سامنے انہوں نے کچھ تاویل نہیں کی (صحیح عقل بھی نعمت ہے) ہم سوال[1] ہوتے تو کہتے حضرت قبول فرمالیجئے۔ گو یہ قبول کرنا ایک معنی کر خلاف سنت سہی مگر نہ لینے میں مہدی[2] کی دل شکنی ہے اور دل شکنی کی ممانعت ہے (سبحان اللہ تمہاری دل شکنی نہ ہو چاہے پیر صاحب کی دین شکنی ہو جائے یعنی ان کا دین تباہ و برباد ہو کر پاش پاش ہو جائے)

بزرگوں کی صحبت انسان کو انسان بنا دیتی ہے اور جب سچی محبت ہوتی ہے تو کام کے طریقے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں چنانچہ وہ خوان واپس لے گئے حتیٰ کہ پیر صاحب کی نظر سے غائب ہو گئے اور وہاں سے پھر لوٹا کر لے آئے اور سامنے رکھ دیا کہ حضرت اب تو لے لیجئے اب تو اشراف نفس جاتا رہا۔ شیخ نے مرید کو گلے سے لگا لیا اور ہدیہ قبول فرمالیا' دیکھئے شریعت سے عقل کیسی درست ہو جاتی ہے۔

عقل اہل اللہ ہی میں منحصر ہے

میں تو دعویٰ سے کہتا ہوں کہ عقل تو اہل اللہ ہی میں منحصر ہے۔ ہاں تجربہ اور بات ہے جو دنیا داروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ عقیل[3] ہوتے ہیں گو بعض امور کا تجربہ نہیں رکھتے جیسے کوئی چیز ایجاد کرنا یا تجارت و حرفت کے کاموں میں ہوشیار ہونا کیونکہ ایجادات اور صنائع وغیرہ میں عقل کی ضرورت نہیں' تجربہ اور مشق کی ضرورت ہے اور تجربہ عقل سے جدا چیز ہے۔ اگر تجربہ کاری کا نام عقل ہے تو ایک ایل ایل بی پاس شدہ کو کپڑا بننا بھی آنا چاہیے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ ایک معمولی سے معمولی بے وقوف بھی ایل ایل بی صاحب سے کپڑا بننے میں بڑھا ہوا ہے تو آپ کے قاعدے کے موافق اس بے وقوف کو ان سے زیادہ عقلمند کہنا چاہیے حالانکہ کوئی بھی نہیں کہتا۔ وجہ یہی ہے کہ وہ کپڑا بننے کا تجربہ رکھتا ہے اور ایل ایل بی صاحب یہ تجربہ نہیں رکھتے تو وہ تجربہ سے اس کام میں بڑھ گیا نہ کہ عقل سے۔ ثابت ہوا کہ عقل اور چیز ہے اور تجربہ اور چیز۔

---

[1] ہم جیسے [2] ہدیہ دینے والے کی [3] عقل مند

عربی خواں اور انگریزی خواں کا سوال وجواب

ایک عربی مدرسہ کے طالب علم سے ایک سائنس داں اسکول کے طالب علم نے پوچھا بتاؤ آسمان میں کل کتنے ستارے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم بتادو کہ سمندر میں کتنی مچھلیاں ہیں؟ اس نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں' کہا تو افسوس ہے تم کو زمین کی چیزوں کا بھی پورا علم نہیں جس میں تم رہتے ہو اور مجھ سے آسمان کی چیزوں کی تعداد پوچھتے ہو جو تم سے ہزاروں کوس دور ہے' پس وہ چپ ہی تو رہ گئے۔

دیکھئے ان دونوں میں کون زیادہ عقلمند تھا۔ آج کل کے عقلمندوں کی یہی غلطی کیا تھوڑی ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک رکھتے ہیں۔ غرض اہل اللہ میں عقل کامل ہوتی ہے ان کی صحبت میں بھی آدمی عقلمند بن جاتا ہے دیکھ لیجئے کتنی بڑی عقل کا کام اس مرید نے کیا کہ کام بھی کرلیا اور دین کی حفاظت بھی رکھی۔ پس اگر آدمی میں دین اور عقل ہو تو پچاس طرح خدمت کرسکتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ایسی طرح دے کہ کہ اپنا مال ضائع ہو اور دوسرے کا دین ضائع ہو۔ یہ اصول ہیں ہدایا کے کہ ان کی پابندی کے ساتھ ملے تو نعمت خداوندی ہے اور اس سے استنکاف[1] تکبر ہے جو اعلیٰ درجہ کا عیب ہے اور اگر آبرو بگڑے یا دینے والے کو یا لینے دینے والے کو ایذاء ہو تو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی طرف آنکھ بھی اٹھائی جائے۔ آج کل کے ہدایا اور چندے اکثر کسی نہ کسی خرابی کو ضرور مستلزم ہوتے ہیں۔

اگر علماء زبان کو چندہ سے روک لیں تو اس طرح حق تعالیٰ بے گمان پہنچاویں گے کہ انسان کی عقل حیران رہ جائے گی جس کا جی چاہے آزمالے۔ مجھے تو ہر روز تجربہ ہوتا ہے کہ میں نے کسی شرط کے خلاف ہونے کی وجہ سے تو یہ ہدیہ رد کردیا تو اس سے زیادہ بہت ہی قریب وقت میں آگیا۔

اگر علماء حق تعالیٰ کا کام کریں گے تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟

حیرت کی بات ہے کہ جب علماء حق تعالیٰ کا کام کریں گے تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟ وہ تو سرکاری ملازم ہوں گے تو کیا سرکاری ملازم کو کفایت کا سامان نہیں ملے گا؟ گورنمنٹ کا جو کوئی کام کرتا ہے اس کی کفیل گورنمنٹ ہوتی ہے پھر اس کفالت کے بعد

---

[1] انکار کرنا' حقارت سے دیکھنا

سرکاری ملازم مثلاً ایک تحصیلدار یہ پیشہ اختیار کرے کہ مانگنے کھانے لگے تو کیا گورنمنٹ کے نزدیک معتوب نہ ہوگا۔ عالم کو تو یہ چاہیے کہ چندہ ہاتھ میں بھی نہ لے چہ جائیکہ مانگے ۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل! سرخ شراب سے لت پت ہو جانا بہتر ہے، بغیر سونے، خزانے کے تم سو عزت کے ساتھ قارون ہو جاؤ گے)

اور یہ حالت ہونا چاہیے۔

لنگلے زیر، لنگلے بالا　　نے غم دزد، نے غم کالا

(ایک چادر اوپر، ایک نیچے، نہ چور کا ڈر، نہ ڈاکو کا)

اگر کپڑے نہیں ہیں تو پھٹے ہوئے کپڑے پہنیں، پیوند لگے ہوئے پہنیں اور غریبوں اور نوابوں کی پروا نہ کریں اپنے فاقہ میں ہی مست ہوں، مرجائیں مگر سوال نہ کریں، کسی سے آنکھ ان کی نہ لجے، اپنے خدام سے کام رکھیں۔

تکبر اور استغناء میں فرق

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کریں یا کسی کو سخت سست کہیں، گالیاں بکیں، ہرگز نہیں یہ تو تکبر ہے۔ سخت کلامی، سخت عیب ہے اور دل آزاری اور توہین ادنیٰ سے ادنیٰ کی بھی جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاجت کسی کے سامنے نہ لے جائیں اور تملق[1] اور خوشامد کسی کی نہ کریں اور انتظار کسی کا نہ کریں۔ یہ معنی ہیں بے پرواہونے کے، نہ یہ کہ تہذیب چھوڑ دیں، شریعت کو چھوڑ دیں، شریعت نے تہذیب کو دین کا بڑا جز و قرار دیا ہے۔

بعض لوگ استغناء اور دل آزاری اور تکبر میں فرق نہیں کرتے اور اپنا یہ شعار رکھتے ہیں کہ آنے والوں کو دور دبک کرتے ہیں، خاص کر امراء اور بڑے طبقہ کے لوگوں کو، اور حقیقت اس کی استغناء اور لاپروائی نہیں ہے بلکہ اپنی احتیاج کو ایک بلیغ طریقے سے پیش کرنا ہے۔ اصل بات چھپتی نہیں ہے، کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہے اس وقت ان ہی لوگوں کو اس وقت دور دبک کے وقت ہاتھ جوڑتے اور جی حضور کرتے تھے، نفرت ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں سب ڈھونگ ہے یہ تو بڑا مکار شخص ہے۔ غرض یہ استغناء نہیں بلکہ مکر ہے۔

---

[1] چاپلوسی [2] پاک

استغناء کی حقیقت اختیار کرنی چاہیے

انسان کو استغناء کی حقیقت اختیار کرنی چاہیے اس میں خود یہ اثر ہے کہ دنیا کھچی چلی آئے گی مگر خدارا محض اس نیت سے استغناء نہ کرنا۔ محض للہ مستغنی بننا چاہیے اور کسی کے سامنے سوائے حق تعالیٰ کے ہاتھ نہ پھیلائے۔ یہ طریقہ علماء نے چھوڑ دیا اسی وجہ سے ان کی بات میں اثر نہیں رہا۔ ہاتھ پھیلانے کی بدولت نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ اسی وجہ سے امراء اپنے بچوں کو عربی نہیں پڑھاتے اور بعض تو صاف کہتے ہیں کہ ہم کو اپنی اولاد کو گدا بنانا منظور نہیں۔ یہ عذر گو ان کا کافی نہ ہو مگر اصلیت تو رکھتا ہے اس واسطے علماء اس اعتراض سے بالکلیہ نہیں بچ سکتے اور یہ طریقہ ان کا فی نفسہ برا ہونے کے علاوہ اس مفسدہ کو بھی مستلزم ہے کہ لوگوں کو مانع[1] عن تعلیم الدین ہے۔ غرض دونوں طرف سے خرابی ہے۔ مقتداؤں کی طرف سے بھی اور مقتدیوں کی طرف سے بھی مگر زیادہ الزام قوم پر ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ جو کچھ خرابی علماء میں ہے وہ قوم کے غلط انتخاب کی وجہ سے ہے ورنہ علم دین ایسی چیز نہیں جو کسی کو بگاڑے وہ تو بگڑے ہوؤں کو بنانے والا ہے اور مردے میں جان ڈالنے والا ہے۔

باوجود کوتاہیوں کے علم کا اثر ہوتا ہی ہے

دیکھ لیجئے باوجود بہت سی کوتاہیوں کے ان نا قابل لوگوں میں سے بھی جن پر علم کا اثر پورا ہو جاتا ہے وہ کس درجہ شائستہ ہو جاتے ہیں، اچھے اچھے لوگ ان کے ہاتھ پیر چومتے ہیں، یہ اس علم ہی کا اثر ہے یا کچھ اور؟ مگر شکایت یہ ہے کہ ایسے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں اور یہی شکایت ہم بھی کرتے ہیں اور قوم بھی کرتی ہے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ یہ شکایت کیوں پیدا ہوئی اور اس میں قصور کس کا ہے؟ میں نے اسی کو اپنی تقریر میں بیان کیا کہ تمام خرابی اور الزام قوم پر عائد ہوتا ہے اور خیر کسی حد تک حالت موجودہ کے اعتبار سے میں یہ بھی تسلیم کیے لیتا ہوں کہ کسی قدر کوتاہی علماء کی طرف سے بھی ہے اور دونوں کو اصلاح کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ان موانع کو مرتفع کریں جو تعلیم دین میں حارج[2] ہیں تا کہ تعلیم دین عام اور تام ہو۔

علماء اپنا کام کریں اور قوم اپنا کام کرے

علماء اپنی عادات و اخلاق کو درست کریں اور قوم حیلہ بہانہ چھوڑ دے۔ یہ مضمون اس

---

۱ دینی تعلیم سے روکنے والی ۲ رکاوٹ

سے شروع ہوا تھا کہ لوگ تلاوت قرآن نہیں کرتے اور اس کے لیے یہ حیلہ چھانٹا ہے کہ سمجھ کر پڑھنے کی تو قابلیت نہیں اور بے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس کا حاصل یہ ہوا کہ تلاوت اڑا ہی دی جائے۔ میں کہتا ہوں دو شقیں تو آپ نے نکالیں مگر ایک چھوڑ دی' وہ یہ کہ اگر بے سمجھ کر پڑھنا آپ کے نزدیک بے کار ہے تو سمجھ کر پڑھنے کو کس نے منع کیا ہے اور جو عذر آپ نے گھڑ رکھے ہیں وہ سب بے کار ہیں جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا۔

تلاوت قرآن کی اہمیت اور امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ

اب میں عود[1] کرتا ہوں اصل بات کی طرف وہ یہ کہ آیت میں تلاوت کا امر[2] ہے اور اس کو دوسری عبادت سے مقدم[3] کیا گیا ہے۔ اس سے کس قدر فضیلت اور تاکید تلاوت کی نکلتی ہے اور آیت میں سمجھ کر پڑھنے کی بھی کوئی قید نہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا' عرض کیا کوئی عمل ایسا ارشاد ہو جس سے آپ کا خاص قرب حاصل ہو۔ ارشاد ہوا تلاوت قرآن۔ انہوں نے عرض کیا سمجھ کر یا بلا سمجھے؟ ارشاد ہوا سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔

حضرت قرآن وہ چیز ہے کہ اس کا ہم کو عطا ہونا یہ محض موہبت خداوندی[4] ہے جس میں ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ اسی معنیٰ کر فرمایا ہے: "اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ[5]" یعنی (جو لوگ معجزات مانگتے ہیں کیا یہ کافی معجزہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے' ان کو دی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے) معجزہ اسی بات کو کہتے ہیں جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا ایسی بات نہیں تھی کہ ہم اس کو کسی طاقت اور کسی کوشش سے حاصل کر سکتے۔ یہ نمونہ رحمت ہے کہ وہ بے دریغ ہمارے پاس ہے۔

صاحبو! بخدا اس وقت وہ چیز ہمارے پاس ہے جو تمام دنیا کی کوشش سے بھی نہیں مل سکتی۔ اگر کسی سے ان پڑھ ہونے کے سبب اس کا پڑھنا بھی نہ ہو سکے تو زیارت ہی کر لیا کرے۔ دیکھئے آج کوئی چیز ایسی آ جاوے جو کم یاب ہو اور جو ہر جگہ نہ مل سکتی ہو تو لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کے لیے آویں۔ عجائب خانہ دیکھنے کے لیے کہاں کہاں سے لوگ پہنچتے ہیں اس کی بھی تو اصل ہے کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جو ہر جگہ نہیں مل سکتیں حالانکہ اس کو دیکھنے سے کچھ آمدنی بھی نہیں ہوتی بلکہ کچھ نقصان ہی ہو جاتا ہے' روپیہ خرچ ہوتا ہے' ٹکٹ لگتا ہے تو

---

[1] لوٹ کر آنا [2] حکم [3] پہلے ذکر کیا گیا [4] اللہ تعالیٰ کا عطیہ [5] العنکبوت ۵۱

جب قرآن شریف ایسی چیز ہے کہ دنیا بھر کی کوششوں سے بھی نہیں مل سکتی تو وہ ہزار عجائبات کا عجائب ہے اس کی زیارت کرنے کے لیے تو بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے پہنچنا چاہیے تھا نہ کہ زیارت سے بڑھ کر اس کی تلاوت حق تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں کردی ہے پھر اس سے جان چرانا کتنی بڑی کم نصیبی کی بات ہے۔ حرمان[1] اسی کو کہتے ہیں۔

قرآن سے روکنا شیطانی مکر ہے

یہ صرف شیطان کا مکر ہے کہ یوں سمجھایا جاتا ہے کہ سمجھ کر تو ہم پڑھ نہیں سکتے اور بے سمجھے پڑھنا فضول ہے۔ کیوں صاحب عجائب خانہ میں آپ کیوں جاتے ہو؟ وہاں آپ کا نفس یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہ چیزیں دیکھنے سے تو مل نہیں سکتیں پھر دیکھنا فضول ہے؟ اور بعض تلاوت کرنیوالے اس وجہ سے تلاوت چھوڑ بیٹھتے ہیں کہ ان سے صحیح پڑھا نہیں جاتا۔ بس شیطان ان کو بہکا دیتا ہے کہ جب صحیح پڑھا جاتا نہیں تو غلط پڑھنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ بعض لوگ تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ غلط پڑھنے سے اور گناہ ہوتا ہے۔

قرآن غلط پڑھنے سے گناہ کب ہوتا ہے

صاحبو! اس غلطی کو سمجھ لیجئے کہ غلط پڑھنے سے گناہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ صحیح پڑھنے پر قدرت ہو اور لاپرواہی سے غلط پڑھا جائے ورنہ ایں خطا از صد ثواب اولیٰ ترست[2] ایسے غلط پڑھنے والے کو جو کہ شوق سے پڑھتا ہو مگر غلطی رفع کرنے پر اس کو قدرت نہیں ہے۔ دو چند ثواب ملتا ہے حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

مابروں راننگریم وقال را   ما دروں رابنگریم و حال را
ناظر قلبیم اگر خاشع بود   گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

(ہم ظاہر کو اور بات کو نہیں بلکہ باطن کو اور اس کی حالت کو دیکھتے ہیں اگر دل میں خشوع ہو تو ہم اس دل پر نظر رحمت رکھتے ہیں خواہ زبان پر اتنا خشوع نہ ہو)

حق تعالیٰ دل کو دیکھتے ہیں اور ایک تلاوت ہی پر کیا شبہ ہے ہماری عبادت تو کوئی بھی ایسی نہیں جس کو صحیح کہہ سکیں سب ایسی ہی ہیں جیسے غلط قرآن پڑھنا۔ پھر تعجب ہے کہ اور عبادتوں پر ہم خوش ہوتے ہیں اور ثواب کی امید رکھتے ہیں اور غلط تلاوت سے ناخوش

---

[1] محروم رہ جانا [2] یہ غلطی سو درستگی سے افضل ہے

ہوتے ہیں حق تعالیٰ کے یہاں تو دل کی حالت دیکھی جاتی ہے جو شخص شوق سے پڑھ رہا ہے اس کی غلطیوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ دو چند ثواب دیا جاتا ہے۔

حضرت حبیب عجمیؒ کے حروف اچھے نہ تھے ایک مرتبہ تہجد پڑھ رہے تھے حضرت حسن بصریؒ نے بھی ان کے پیچھے شریک ہونا چاہا لیکن ان کی غلطیوں کی وجہ سے گھر آ کر تہجد ادا کیا۔ خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا پوچھا آپ کے نزدیک کون عمل زیادہ پسندیدہ ہے؟ ارشاد ہوا: "الصَّلٰوۃُ خَلْفَ الْحَبِیْبِ" (حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھنا)

دیکھئے یہ رتبہ ہے بعضے غلط پڑھنے والوں کا۔ حق تعالیٰ کی نظر قلب پر ہے اگر کوئی صحیح نہ پڑھ سکے تو اس کا غلط صحیح سے بڑھ کر ہے۔

عورتوں میں تلاوت قرآن بالکل متروک ہے

غرض تلاوت بڑی چیز ہے جس کی طرف سے لوگوں میں عام غفلت ہے۔ بالخصوص عورتیں تو اس سے بہت ہی غفلت کرتی ہیں۔ بس عورتوں کو تو رسموں سے کام ہے یہی ان کا دین ہے اور یہی ان کا قرآن ہے۔ یہ رسم ضرور ہے کہ قرآن جہیز میں دیا جاتا ہے مگر کاہے کے لیے دیا جاتا ہے صرف رسم پورا کرنے کے لیے بس گھر پہنچتے ہی وہ قرآن طاق نسیان پر رکھ دیا جاتا ہے اور بڑی حفاظت کے ساتھ کہ کبھی اس کو جزدان میں سے نکلنے اور ہوا لگنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس میں اس کا قصور تو ہے لیکن اوپر والوں کا بھی ہے کہ اس کو پڑھنے ہی نہیں دیتے۔

دلہن کا قرنطینہ اور دلہن کی کیا گت بنتی ہے

کیونکہ دلہن کو کچھ دنوں تک قرنطینہ[1] میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے کوٹھڑی میں بند کی جاتی ہے کہ ہوا کو بھی ترس جاتی ہے۔ ایک مدت منہ پر ہاتھ رہتا ہے اور یہ قید اس بیچاری کی بیاہ سے پہلے ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ مائیوں بٹھلائی جاتی ہے اس طرح کہ ایک جگہ سے نہیں نکل سکتی اور بیاہ ہونے کے بعد تو وہ عجائب المخلوقات میں سے ہو جاتی ہے۔ دور دور سے اس کو دیکھنے والیاں آتی ہیں اور وہ اس طرح انسان سے جماد بنائی جاتی ہے کہ نہ اس کے آنکھ رہے نہ زبان رہے نہ کسی کی طرف دیکھ سکتی ہے نہ بول سکتی ہے پیشاب پاخانہ کو بھی جانا ہو تو دوسرے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔

صاحبو! یہ کیا خرافات ہیں کون سی عقل ان باتوں کو اچھا بتاتی ہے۔ خیر اگر ان باتوں سے شریعت

[1] وہ جگہ جہاں مریض کو حفاظتی تدبیر کے طور پر عام لوگوں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے

میں خلل نہ پڑتا تو حرج بھی نہ تھا مگر حالت یہ ہے کہ اس قرنطینہ کے زمانہ میں نماز تو بالکل ہی ناجائز ہو جاتی ہے اور تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا۔ قرنطینہ کے بعد منہ پر ہاتھ ہوتا ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ منہ پر ہاتھ نہیں بلکہ ہاتھ پر منہ ہوتا ہے کیونکہ دلہن دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہاتھوں پر منہ رکھ دیتی ہے۔

اس وقت دلہن بالکل مردہ بدست زندہ ہو جاتی ہے اور ان کی دین داری کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دلہن سے پردہ میں وہ کام تو کرادیں گے جو حد سے زیادہ بے حیائی کے (چنانچہ بعض رسمیں ایسی فحش ہیں کہ ان کا ذکر بھی نہیں کیا جاسکتا) یہ سب کام تو ہوں گے لیکن جب نماز کا وقت آوے گا تو وہ خلاف حیا ہے، نماز کیسے پڑھوائیں؟ اور خود دلہن تو بول بھی نہیں سکتی، اگر کوئی دلہن نماز کا نام لے اور پانی بھی وضو کے لیے مانگے تو بوڑھی عورتیں کائیں کائیں کرکے اس کے پیچھے پڑ جائیں کہ نوج اب تو وہ زمانہ آ گیا کہ نئی دلہنوں کا دیدہ بھی نہیں جھپکتا۔ غرض نئے دنوں تک تو یہ مجبوری رہی جب نماز ہی نہیں تو تلاوت قرآن کہاں۔ پھر چند روز تک اس طرح معمول متروک ہو گیا پھر اس کا اعادہ عادۃً دشوار ہو جاتا ہے۔ سو اس طرح سے دوسروں کا بھی اس ترک تلاوت میں دخل ہوا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رخصتی کے بعد ہی امید ہو جاتی ہے۔ پھر طبیعت اچھی نہیں رہتی، تلاوت کیسے ہو؟ پھر بچے ہو گئے، پھر گھر کی مالک بن گئیں، کھانا، پکانا، پیسنا، کوٹنا اپنے ذمہ ہو گیا، پھر بڈھی ہو گئیں، یہاں تک کہ مر گئیں، سب کام ہو گئے مگر تلاوت نصیب نہیں ہوئی۔

تمام عمر گزر گئی مگر تلاوت نصیب نہ ہوئی

کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جس میں اس قرآن کو جو جہیز میں آیا تھا طاق نسیان[۱] پر سے اتار کر کھولنے کی نوبت آ جاتی۔ ساری عمر شیطان نے راہ ماری اور ہمیشہ حیلے بہانوں میں رکھا اور تلاوت ہی نہ کرنے دی حالانکہ سب حیلے فرضی تھے اور صرف سستی اور بدنصیبی تھی، میری والدہ نے ہم دونوں بھائیوں کو پالا مگر سوائے ایام معذوری کے معمولات کو ناغہ نہ ہونے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ آخرت کی طرف سے ذہول ہو گیا ہے اور ثواب کو کچھ نہیں سمجھا جاتا۔

میں کہتا ہوں اگر خاوند دلہن سے یوں کہہ دے کہ قرآن شریف پڑھا کرو، میں فی سپارہ سو روپیہ کا زیور بنوا کر دوں گا تو سب حافظ ہو جائیں اور سب حیلے، بہانے ندارد ہو جائیں[۲] کیونکہ عورتوں کو زیور کی بڑی حرص ہوتی ہے۔

عورتوں کو زیور کا شوق اور اس کی حکایت

ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی بنئے نے اپنی عورت سے کہا کہ ذرا مجھے باٹ اٹھادے، اس

---

۱ غفلت ۲ ختم ہو جائیں

نے کہا اونہہ بھلا مجھ سے اتنا بھاری باٹ اٹھے گا۔ اس نے کیا کیا کہ سنارے سے کہہ کر ایک سل کے اوپر سونا مڑھوایا اور گھر میں لایا کہ لے بی! میں نے تیرے واسطے ایک نئی قسم کا زیور گھڑوایا ہے جیسے ہی وہ زیور عورت کے سامنے آیا بے ساختہ گلے میں ڈال لیا' پھر تو بنئے نے اس کی خوب مرمت کی کہ مردار! کل تک تو تجھ سے باٹ بھی نہ اٹھتا تھا یا اب سل کو بھی بے تکلف گلے میں ڈالے پھرنے لگی۔ یہ حالت ہے ان کے زیور کے شوق کی۔ لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ کان لہولہان ہیں مگر سونا لاد رکھا ہے کیسی ہی تکلیف ہو مگر اس کو نہیں چھوڑ سکتیں' کانوں کے بوجھ اور تکلیف کی وجہ سے گردن تک نہیں جھکا سکتیں مگر تمام کنبے کو دکھاتی پھرتی ہیں تا کہ اچھی لگوں۔ مشہور تو یہ ہے کہ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان' مگر ان کے نزدیک بھٹ ٹوٹ کچھ نہیں پڑتا۔

ہندوستان میں زیور کا کچھ ایسا رواج ہے کہ لڑکیوں کا تمام بدن ابتداء سے جکڑ بند ہو جاتا ہے مگر اس کو اپنے لیے بڑا فخر سمجھتی ہیں۔ میری ایک جگہ دعوت تھی وہاں ایک چھوٹی لڑکی تھی اس کے باپ نے مجھ سے کہا کہ میرا دل دکھتا ہے اس کے کان چھدواتے ہوئے اگر نہ چھدواؤں کچھ حرج تو نہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں کان میں صرف لو کا چھدوانا ثابت ہے بقیہ چھدوانا ضروری نہیں۔ وہ لڑکی تو اس وقت سوتی تھی صبح کو اس کی بڑی بہن نے اس سے کہا تیرے واسطے یہ تجویز ہوا ہے۔ وہ بہت بگڑی اور کہنے لگی کہ مولوی اپنی بیوی' بہن کو نہیں دیکھتے' ان کے ناک' کان کیوں چھدے ہوتے ہیں' یہ قصہ اس کے باپ نے مجھ سے کہا' غرض انہیں تو بس اسی کا شوق ہے کہ دوسری عورتوں کی ریس ہو' ثواب اور عقاب کو یہ نہیں جانتیں' انہیں تو ذرا سے مال کا لالچ دیا جائے تو یہ سب کچھ کر گزریں۔

عورتوں سے نماز و تلاوت کا اہتمام کرانے کی ایک تدبیر

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر پانچ پیسہ روز کا بھی انہیں لالچ دیں تو سب عورتیں نمازی ہو جائیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی واقعی عذر تو ان کے پاس ہے نہیں ہاں ارادہ نہیں ہے تو بے ارادہ تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تو اس حالت میں سوائے محرومی کے کیا ہے' تمام عمر گزر گئی اور کوئی کام بھی دین کا نہیں ہوا' نہ نماز' نہ تلاوت بالخصوص تلاوت سے تو بہت ہی غفلت ہے' عورتیں بھی غافل ہیں اور مرد بھی غافل ہیں' عورتوں نے تو صرف عدیم الفرصتی کا عذر نکال رکھا ہے مگر مردوں نے ایسا حیلہ چھانٹا ہے کہ اس کے بعد تبدیل رائے کی امید ہی بہت کم ہے۔ وہ حیلہ وہی ہے جس پر بہت دیر سے بحث ہو رہی ہے کہ تلاوت کر کے کیا کریں'

سمجھنے کی ہم میں قابلیت نہیں اور بلا سمجھے پڑھنا بے کار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پڑھنا تو بے کار کیوں ہوتا مگر تمہاری یہ باتیں ضرور بے کار ہیں کہ انجام ان کا حسرت ہے۔ اسی تلاوت کے باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ" اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں کیونکہ وقت بہت ہو چکا گو مضمون ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی باتیں ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں ۔ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنیں باقی

(نہ اس کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کی باتوں کی استسقاء کے مریض پیتے پیتے مرجائیں مگر دریا ختم نہ ہو)

یہ بالکل ٹھیک ہے چنانچہ صریحاً ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّکَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَداً۔

(آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی ہوتو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجاوے اگر چہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لیے ہم لے آویں۔ الکہف ۸۹) یہی وجہ ہے کہ جولوگ قرآن واحادیث کے مضامین بیان کرتے ہیں ان کے بیانوں میں بڑی وسعت ہوتی ہے بخلاف اس کے اگر کسی دوسرے فن کے متعلق بحث کی جائے مثلاً علم حساب میں یہ شعر وشاعری میں یا جس فن کو بھی لیا جاوے تو اس میں تقریر کو اتنا امتداد نہیں ہوسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کو تعلق ہے ایسی ذات وصفات سے جو لامتناہی ہے مگر میں اس کو قصداً ختم کیے دیتا ہوں۔

نری نماز کا حکم نہیں بلکہ درست کرنے کا بھی حکم ہے

آگے دوسرے اجزاء کا مختصراً مختصراً بیان کر کے فارغ ہوتا ہوں سو یَتْلُوْنَ کے بعد فرماتے ہیں وَاَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز کی پابندی کرتے ہیں یُصَلُّوْنَ نہیں فرمایا بلکہ وَاَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ فرمایا معنی یہ ہوئے کہ نری نماز نہیں بلکہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور درست کر کے پڑھتے ہیں یعنی نماز کے حقوق پورے پورے ادا کرتے ہیں۔ میں بہت اختصار سے بیان کررہا ہوں اس واسطے صرف اتنا کہتا ہوں کہ ہر شخص دیکھ لے کہ وہ نماز کے حقوق کہاں تک ادا کرتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں: "وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرّاً وَّعَلَانِیَۃً" یعنی ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی

یعنی حسب موقع و محل خرچ کرتے ہیں اگر پوشیدہ خرچ کرنے کا موقع ہے تو پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور اگر علانیہ خرچ کرنے کا موقع ہے تو علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

یہ بات مشہور ہے افضل صدقہ وہی ہے جو پوشیدہ ہو اور یہ بات صحیح بھی ہے حدیث میں موجود ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ صدقہ میں علی الاطلاق اخفاء ہی افضل ہے بلکہ بعض مواقع ظاہر کرنے کے بھی ہیں، زکوٰۃ کو اکثر حالات میں علانیہ دینا بہتر ہے تا کہ دوسروں کو بھی تحریض[1] ہو اور دیگر صدقات میں اکثر حالات میں اخفاء[2] بہتر ہے۔

آیت تمام کارِ خیر کو شامل ہے مالی ہوں یا بدنی

یہ کل تین باتیں ہوئیں۔ تلاوت، نماز کی پابندی، خیرات، یہ کہنے کو تین ہیں مگر تمام عبادات بدنیہ و مالیہ اس میں آ گئیں، نوافل بھی فرائض بھی، صلوٰۃ میں عبادات بدنیہ آ گئیں اور خیرات میں عبادات مالیہ اور چونکہ عبادات مالیہ میں مقصود دوسروں کو نفع پہنچانا ہے اس واسطے اشارۃً اس میں تمام طرق نفع رسانی کے آ گئے حتیٰ کہ کسی کے لیے دعا کرنا یا ہاتھ پاؤں سے خدمت کرنا یا اور کسی طریق سے نفع پہنچانا اور اَنْفَقُوْا میں صدقہ فطر بھی آ گیا اور قربانی بھی اور دوسرے مفید کام بھی جو مال کے ذریعہ انجام پاتے ہیں جیسے مدرسوں کے چندے وغیرہ۔ آگے ان سب پر جزاء کو متفرع[3] فرماتے ہیں "یَرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ" یعنی جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ امید رکھتے ہیں ایسی تجارت کی جو ہرگز خسارہ نہ دے گی۔

اعمال آخرت کو تجارت کہنے کی وجہ

یہاں اول یہ سمجھ لیجئے کہ اعمال آخرت کو تجارت کیوں فرمایا؟ اور سعی آخرت تجارت کس طرح ہے؟ تو سمجھ لیجئے کہ تجارت اس کو صورۃً کہا گیا ہے اس وجہ سے کہ لوگ تجارت کے عادی تھے ورنہ اس کی حقیقت یہاں موجود نہیں کیونکہ تجارت کی حقیقت ہے "مُبَادَلَۃُ الْمَالِ بِالْمَالِ" (مال کا تبادلہ مال سے) یہ بالمعنی الحقیقی جب صحیح ہوتا ہے کہ ہم کوئی چیز اپنی ملک سے دیتے اور ادھر سے جنت ملتی مگر ہماری تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔

تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(سب کچھ آپ نے دیا، میری سب چیزیں تو آپ کی دی ہوئی ہیں)

---

[1] ترغیب [2] پوشیدہ کرنا [3] نتیجہ کے طور پر ذکر فرماتے ہیں

تو اب اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو اول ایک روپیہ عاریۃً دیں پھر اس سے کہیں کہ ہمارے پاس ہزار اشرفی ہیں اس روپیہ سے خرید لو تو یہ بیع نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہی ہے کہ ہم کو ہزار اشرفی اس کو دینا ہی تھی۔

صرف برائے نام مبادلہ[1] کا لفظ آ جانے سے اس کو تجارت کہہ دیا اور دوسری تجارتوں میں اور اس میں یہ فرق بھی بیان کر دیا کہ لَنْ تَبُوْرَ یعنی یہ تجارت نقصان دہ ہرگز نہیں بخلاف دوسری تجارتوں کے کہ ان میں نفع ونقصان دونوں برابر ہوتے ہیں اور نقصان تو بہت ہی بعید ہے۔ اس تجارت کا تو یہ نتیجہ ہے "لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُوْرَهُمْ" یعنی پورا پورا اجر ملے گا اور معاوضہ پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ "وَيَزِيْدُهُمْ" جتنے کا استحقاق ہے اس سے زیادہ ملے گا۔ اگر کام چار روپیہ کا کیا ہے تو چار سو لیں گے۔ بھلا یہ قاعدہ کسی سرکار میں ہے کہ جتنا اجر ٹھہرا ہو اس سے زیادہ دیا جائے مثلاً تحصیلدار کے سو روپیہ مقرر ہوئے تو مہینہ پر سو نہ دیئے جاویں بلکہ بجائے سو کے ہزار دیدیئے جاویں اور اس وجہ سے کہ زیادہ ملنے پر کوئی تعجب نہ کرے مِنْ فَضْلِهٖ بھی فرما دیا کہ زیادتی حق تعالیٰ کے فضل سے ہے اور ہمارے فضل کے سامنے کس چیز کی کمی ہے؟ گو تمہارا استحقاق زیادہ کا نہ تھا مگر ہمارے یہاں کمی نہیں ہم کو اختیار مطلق حاصل ہے جس کو جتنا چاہیں دے دیں اس کے آگے فرماتے ہیں: "اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ" کیسے عجیب طور پر ختم کیا ہے مضمون کو۔

شبہ کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ بھی ہوتے ہیں تو جنت کیسے ملے گی؟

بیان اس کا یہ ہے کہ یہاں ایک شبہ ہو سکتا تھا جس کے دو جزو ہیں ایک یہ کہ آیت سے ثابت ہوا کہ اعمال میں خاصیت ہے کہ نتیجہ ملے گا تو جیسے کہ اعمال خیر میں خاصیت ہے اچھا نتیجہ ملنے کی ایسے ہی اعمال شر میں خاصیت ہوگی برا نتیجہ ملنے کی اور ہم سے گناہ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ طاعت بھی ہوتی ہوں مگر قاعدہ کے موافق چونکہ گناہوں پر نتیجہ شر مرتب ہونا ضرور ہے اس لیے گناہوں سے دوزخ میں جانا بھی ضرور ہوگا تو طاعت کرنے کے بعد بھی اطمینان نہ ہوا کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جرائم عظیمہ تو الگ رہے ذرا سے قصور سے بھی کام ناپسند کر دیا جاتا ہے مثلاً کسی سے سڑک بنوائی مگر ذرا سی کوتاہی ہوگئی وہ ناپسند کر دی اور توڑ ڈالی تو اس صورت میں حسنات کیا کام دے سکتی ہیں؟ وہ بھی حبط[2] ہو جائیں گی۔ یہ شبہ کمر توڑ دینے والا ہے۔ دوسرا جزو یہ

---

[1] تبدیلی [2] ضائع

ہے کہ طاعات میں ہمیں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ہم کام تو کرتے ہیں مگر ان میں کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں تو قطع نظر معاصی سے خود طاعات ہی میں یہ احتمال ہے کہ شاید بیکار ہو جائیں اور اجر سب جرمانہ میں ہی سوخت ہو جائے اور یہ شبہ کچھ بعید نہیں ہے جس کو اپنے اس تعلق سے آگاہی ہے جو بندہ کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہے اس کو اس سے بھی بڑھ کر شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔

دیکھئے آپ کا باورچی کھانا پکاتا ہے اور فرض کرو کہ وہ اس کام کا استاد ہو اور غلطی نہ کرتا ہو مگر جب کھانا پکا چکے اور اس سے کہا جاوے کہو آج کھانا اچھا پکا؟ تو یہی کہے گا کہ اچھا جب ہے کہ آقا کے پسند آ جاوے۔ اس کے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ان تعلقات پر نظر ہے جو اس کے اور اس کے آقا کے درمیان ہیں۔ بخلاف ہم لوگوں کے ہم کو شبہات نہیں ہوتے وجہ اس کی خدا تعالیٰ کی عظمت اور اپنی عبودیت سے ذہول (غفلت) ہے۔ بہر حال ان تعلقات پر نظر کر کے یہ شبہ ہوسکتا تھا تو اس واسطے کہ ان شبہات سے کسی کا دل نہ ٹوٹے غفورٌ شکورٌ فرمادیا یعنی ہم گناہوں سے طاعات کو غارت نہ کریں گے کیونکہ ہم معاف کرنے والے ہیں خود ان گناہوں ہی کو معاف کر دیں گے جن کے مؤثر ہونے کا شبہ ہوا تھا اور یہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اگر معاف بھی نہ ہوتے تو ان پر مستقل مقدمہ چلتا وہ طاعات کو حبط نہیں کرتے غفورٌ ہیں اور کسی کے کام کو ناپسند کرنے والے بھی نہیں۔ کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیں گے کیونکہ ہم شکورٌ ہیں قدر دان ہیں ہم سب پسند کر لیں گے۔

ہے کوئی گورنمنٹ جس کا اپنی رعایا کے ساتھ یہ برتاؤ ہو کہ بات بات میں دل کو سنبھالتے ہیں۔ بس یہ ایک ہی گورنمنٹ ہے جو کوتاہیوں پر نظر نہیں کرتی اور کسی کام کی ناقدری نہیں کرتی بلکہ اتنا معاوضہ دیتی ہے کہ اس کو عمل کا معاوضہ کہنا ہی صحیح نہیں، محض عطا ہی عطا ہے پھر ہم نے کیا قدر کی اس عطا کی؟ اس کی قدر تو یہ تھی کہ تعمیل احکام میں جان توڑ کر کوشش کرتے نہ یہ کہ احکام کا نام ہی اڑا دیا اور خالی امید لے لی۔

نری امید کا کہیں حکم نہیں ہے

آخر یہ بات قرآن میں کس جگہ ہے کہ امید ہی امید رکھو۔ یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے قرآن ہی کی آیت ہے اور رجاء ہی کے بارے میں ہے اس کا مدلول تو یہ ہے کہ جو لوگ فلاں فلاں عمل کرتے ہیں وہ امیدوار سمجھے جاسکتے ہیں اس کے یہ معنی کس طرح لے

لیے گئے کہ گو عمل تو کچھ بھی نہ ہو تب بھی اپنے کو امیدوار سمجھتے رہو۔ اس مضمون کو میں نے بقدر کفایت بسط کے ساتھ بیان کر دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رجاء کا طریق بھی بتا دیا اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی۔ وہ یہ کہ اعمال شرعی کرو اور رحمت کے امیدوار رہو نہ یہ کہ خیال خام میں پھنسے رہو۔ اب دعا کیجئے کہ ہم لوگوں کا فہم درست ہو اور عمل صحیح ہو۔ آمین

وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله واصحابه اجمعين. وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين.

لب لباب وعظ ہذا

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى. اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ. الموصول مع الصلة اسم "ان" و "يرجون" خبره. فالمعنى ان الذين يعملون تلك الاعمال يرجون تجارة لن تبور. اعنى يترتب عليها الجزاء البتة وهو دخول الجنة. فالحاصل ان الرجاء المعتبر هوالذى يكون مع كسب الاعمال لاالا مانى المحضة التى اعتادها الناس. والله سبحانه اكتفى من بين الاعمال على ذكر التلاوة واقامة الصلوٰة وانفاق المال فالا ول اشارة الى جميع الطاعات النافلة خص منها التلاوة بالذكر لفضلها والثانى اشارة الى جميع العبادات البدنية المكتوبة خص منها الصلوٰة بالذكر لفضلها ايضا والثالث اشارة الى جميع العبادات المفروضة والنافلة ويتعدى الحكم باشتراک علة النفع الى جميع الطرق النافعة حتیٰ الدعاء لاخيه واعانته بالنفس وتسمية الاعمال تجارة ليست الاصورة فان حقيقة التجارة اعنى مبادلة المال بالمال ليست ههنا لان العمل ليس الا بتوفيق الله. واللام فى "ليوفيهم" للعاقبة كقولهم (سرق ليقطع) ولم يكتف على الاجر بل وعد بالزيادة. وفى لفظ "من فضله" رد لاستعجاب ان العبد كيف ينال مثل تلک الاجور والزيادة لانهالا نسبة بين العمل والجزاء فقال لخطى من فضلنا فانا ذوالفضل العظيم. والله يرزق من يشاء بغير حساب.

وفى قوله "غفورٌ شكورٌ" ردلشبهة لها جزان. الاول انه يثبت بالاية ان للاعمال خاصية فى ترتب النتيجة عليها فان الانسان ولو عمل الطاعات فلايخلو من اكتساب الخطيات البتة فكما انه استحق الجنة بالطاعات' استحق النار بالخطيات فكيف يسره عمل الطاعات؟ والثانى ان الطاعات ايضا لاتخلو عن تقصيرات فكيف يحصل لها القبول وترتب النتيجة؟ فهذه الشبهة تقعد العامل عن العمل فازال الله سبحانه الجزء الاول بلفظه غفور والثانى بشكور. (فقط اشرف على)

بحمد اللہ تمّ